منفرد خصوصیات کی حامل ایک بے مثال کتاب کا پہلی بار اردو ترجمہ اور تحقیق
فقہ حنفی
پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب

فقہ حنفی
قرآن وسنّت کی روشنی میں

جلد دوم

الفقه الحنفي وادلّته

شیخ اسعد محمد سعید الصاغرجی
حفظہ اللہ تعالیٰ

اردو ترجمہ۔ ترتیب۔ تحقیق
لجنۃ المصنّفین
جناب مولانا خالد محمود صاحب
جناب مفتی عبدالعظیم ترمذی صاحب
جناب مولانا محمد انس صاحب

ادارۂ اسلامیات
لاہور۔ کراچی
پاکستان

منفرد خصوصیات کی حامل ایک بے مثال کتاب کا پہلی بار اُردو ترجمہ اور تحقیق

فقہِ حنفی

پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب

فقہِ حنفی

قرآن وسُنّت کی روشنی میں

جلد دوم

الفقه الحنفی وادلّته

شیخ اسعد محمد سعید الصاغرجی

حفظہ اللہ تعالیٰ

اردو ترجمہ۔ ترتیب۔ تحقیق

لجنۃ المصنّفین

جناب مولانا خالد محمود صاحب

جناب مفتی عبدالعظیم ترمذی صاحب

جناب مولانا محمد انس صاحب

ادارۂ اسلامیات

لاہور۔ کراچی

پاکستان

نام کتاب

فقہ حنفی

قرآن وسنت کی روشنی میں

(جلد دوم)

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ بمطابق جون ۲۰۰۸ء

ترجمہ۔ ترتیب۔ تحقیق
لجنۃ المصنفین
جناب مولانا خالد محمود صاحب
جناب مفتی عبد العظیم ترمذی صاحب
جناب مولانا محمد انس صاحب

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+
۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان.........فون ۳۷۲۴۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵
موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان.....فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴
مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، چوک لسبیلہ، کراچی
دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱
بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱
بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿مقدمہ﴾

الحمد للّٰہ تعالٰی شارع الشرائع، رضی لنا الاسلام دیناً، و حثنا علی ابتغائہ، و لم یقبل منّاالاّ ان ندین بہ۔ احمدہ سبحانہ و تعالی علی ماوھب، واستمد منہ العون علی طلب الرضوان، ونیل أسباب الغفران، واشھدان لاالہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ، وأشھد انّ محمداعبدہ ورسولہ وأصلی وأسلم علیہ وعلی آلہ و اصحابہ و علی اخوانہ المرسلین، وأصحابہ اجمعین .

امابعد: علم کی دوقسمیں ہیں، (۱) توحیداورصفات کاعلم (۲) شرائع واحکام کاعلم:۔

پہلی قسم: اس قسم میں اصل کتاب وسنت سے تمسک خواہش وبدعت سے اجتناب اوراہل سنت والجماعت کے طریق کولازم پکڑنا ہے جس پر حضرات صحابہ، تابعین سلف صالحین عمل پیرا رہے، اسی راستے پر ہمارے مشائخ اور ہمارے اسلاف یعنی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام ابویوسف، امام محمد اوران کے شاگرد چل کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس موضوع پر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی اوراس کا نام ''الفقہ الاکبر'' رکھا، ''الاکبر'' نام اس لئے رکھا کہ علم کا شرف اوراس کی عظمت معلوم کے شرف وعظمت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ چونکہ اس کتاب میں اللہ تعالٰی کی صفات کا تذکرہ ہے اور اللہ تعالٰی کی ذات وصفات سے بڑھ کر کیا چیز بڑی ہوسکتی ہے؟ اس لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ''اس کتاب کا نام ''الفقہ الاکبر'' رکھا، اس کے اندر صفات الٰہی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ تعالٰی کی صفات ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اللہ تعالٰی ازل سے عالم ہے علم کی صفت اللہ تعالٰی کی ازلی صفت ہے۔ اللہ تعالٰی قادر مطلق ہے۔ صفت قدرت سے متصف ہے اور قدرت کی یہ صفت اس کی ازلی صفت ہے۔ خلق اللہ تعالٰی کی صفت ہے۔ اللہ تعالٰی ازل سے خالق ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اللہ فاعل مختار

ہے۔ یہ اس کی ازلی صفت ہے۔ مفعول مخلوق ہے اللہ تعالیٰ کا فعل مخلوق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ازلی اور غیر مخلوق ہیں۔ قدیم ہیں حادث نہیں ہیں۔ جو ان صفات کے مخلوق یا حادث ہونے کا قول کرے، یا اس میں توقف یا شک کرے وہ کافر ہے۔ اللہ کا فرمان "للّٰه العزة" اس بات کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس کتاب میں خیر وشر کی تقدیر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کو ثابت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ مسلمان کیلئے یہ کہنا واجب ہے "امنت باللّٰه و ملائکته و کتبه ورسله والیوم الاخر والقدر خیره و شره" "ایمان لایا میں اللہ کی ذات پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور تقدیر پر کہ خیر وشر اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انسان کی تمام حرکات وسکنات کا خالق اللہ تعالیٰ اور کاسب انسان ہے، یہ تمام اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے علم اور اس کے قضا وقدر کے مطابق ہوتا ہے۔

تمام طاعات اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا سے جبکہ تمام معاصی اللہ تعالیٰ کی تقدیر، اس کے علم وقضا سے وجود پذیر ہوتی ہیں۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب، کتاب العالم والمتعلم بھی تصنیف فرمائی، اس میں لکھا ہے کہ مؤمن اللہ تعالیٰ کا دشمن نہیں ہوسکتا اگر چہ تمام گناہوں کا مرتکب ہو بشرطیکہ توحید کا قائل ہو۔ جب وہ کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کررہا ہوتا ہے اس وقت بھی ماسوا اللہ کے اور کوئی اس کا محبوب نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر اس کو اختیار دیا جائے آگ میں جلنے یا اللہ پر افتراء باندھنے کا تو وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق نازیبہ کلمات بکنے کے مقابلے میں آگ کے اندر جلنے کو ترجیح دے گا اور ایمان سے خارج نہیں ہوگا۔ میں عرض کرتا ہوں اس بات کی تائید بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو انہوں نے اپنی جامع کے اندر تخریج کیا ہے اور باقاعدہ باب باندھا ہے۔ "باب مایکره من لعن شارب الخمر" اس کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل فرمائی "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں عبداللہ نامی ایک شخص تھا، حمار کے لقب سے ملقب تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا۔ شراب پینے کی پاداش میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کوڑے بھی لگوائے تھے، ایک دن دوبارہ شراب پینے کی وجہ سے خدمت میں پیش کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوڑے لگانے کا حکم دیا، وہاں ایک شخص نے کہا "اللهم العنه" اس پر لعنت ہو، کس طرح بار بار اس فعل بد کا ارتکاب کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اس پر لعن طعن مت کرو، اللہ کی قسم: یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت کرتا

ہے۔" امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "الفقه الاکبر" میں یہ بھی لکھا ہے۔ہم کسی مسلمان کو کسی گناہ کے ارتکاب پر کافر نہیں کہیں گے، اگر چہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے بشرطیکہ اس کو حلال نہ سمجھتا ہو۔ ہم اس کو مؤمن کہیں گے اور اس کے حق میں رحمت کی دعا کریں گے۔ اور کہیں گے اللہ اس پر رحم فرمائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "سفانہ" بنت حاتم سے فرمایا تھا، تمہارا والد اگر مسلمان ہوتا تو اس کے حق میں رحمه الله کہتے، پھر فرمایا۔اس کو آزاد کردو، کیوں کہ اس کا والد اچھے اخلاق کا حامل انسان تھا۔[1]

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے، جو قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہے وہ کافر ہے۔ اور امام صاحب اور ان کے تمام شاگردوں کا متفقہ قول ہے کہ فاسق کی امامت درست ہے کراہت اگرچہ ہے، اور یہ حضرات کہتے ہیں اگر قاضی کسی فاسق کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دے تو یہ فیصلہ نافذ ہوگا، کیوں کہ وہ مسلمان ہے۔

علماء احناف "اللّٰهم انی اسئلک بمقعد العز من عرشک من القعود" کے عدم جواز پر بھی متفق ہیں کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے کسی جگہ پر متمکن ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے البتہ "بمعقد العزّ من عرشک" جیسی دعاء کے جواز وعدم جواز میں اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جواز کے قائل ہیں یہ ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں جبکہ حضرت ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ عدم جواز کا قول کرتے ہیں۔ اس میں عزت کے عرش کیساتھ متعلق ہونے کا وہم ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی جمیع صفات کیساتھ قدیم ہیں۔ جہاں تک امام ابو یوسف کی مستدل حدیث کا تعلق ہے وہ شاذ ہے اس صورت میں اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔اس طرح یہ حضرات عذاب قبر کی حقیقت کے بھی قائل ہیں۔قبر کے اندر دوبارہ روح ڈالے جانے کا بھی قول اختیار کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں: قبر کا ضغطہ اور تمام کافروں کیلئے عذاب قبر حق ہے، اور بعض مسلمان بھی عذاب قبر میں مبتلا کئے جائیں گے۔ یہ حضرات جنت اور جہنم کے مخلوق ہونے کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں: جنت وجہنم حق میں موجود ہیں کبھی فنا اور ختم نہیں ہوں گے، جنت میں موجود حوریں کبھی ختم نہیں ہوں گی، جہنم کا عذاب بھی برقرار رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرقہ جبریہ کے رئیس جہم بن صفوان سے طویل مناظرے کے بعد اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھ کر فرمایا تھا، کافر! یہاں سے دفع ہو جاؤ، کیوں کہ اس کا عقیدہ تھا کہ جنت اور جہنم اس وقت موجود نہیں ہیں، قیامت کے دن پیدا کئے جائیں گے، اور اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ جنت اور جہنم خود میں موجود لوگوں کے ساتھ آخر کار فنا اور ختم ہو جائیں گے اور اس کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ ایمان صرف جاننے کا نام

---

[1] [نوادر الاصول: ۲۳۰]

ہے۔اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کی ضرورت نہیں۔اس کے فاسد عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ انسان مجبور محض ہے۔اپنے افعال میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ وہ ایک درخت کی طرح ہے۔جو ہوا کے حرکت دینے سے حرکت کرتا ہے۔نہ اس کو کام کرنے پر قدرت ہے نہ ہی ارادہ واختیار۔یہ تمام عقائد فاسدہ ہیں کیوں کہ انسان مکلّف ہے اور یہ مکلّف ہونے کے منافی ہیں۔امام صاحب اور ان کے شاگرد آخرت کے تمام احکام کی حقیقت کا عقیدہ قرآن وسنت کی روشنی میں رکھتے ہیں۔مثلاً بعث بعد الموت، عمل نامے کو پڑھنا اعمال کا وزن، پل صراط، شفاعت وغیرہ یہ تمام باتیں ''الفقه الاکبر'' کے اندر موجود ہیں۔

علم کی دوسری قسم: فروع اور فقہ کا علم

علم الفقہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) احکام (یعنی حلال، حرام، صحیح، فاسد، واجب مندوب اور مکروہ) کا علم

(۲) جن ادلہ سے یہ احکام مستنبط ہوتے ہیں ان ادلہ کی پہچان اور ان کے لغوی وشرعی معانی کے پہچان میں مہارت اور فروع کا اصولوں کے ساتھ محفوظ کرنا، مثلاً قرآن کی آیت ہے ''او جاء احدمنکم من الغائط'' [المائدہ:۶] حدث (بے وضو ہونے) سے کنایۃ ہے۔جو اس کا لغوی معنی ہے اور اس کا ایک معنی شرعی بھی ہے یعنی زندہ انسان کے بدن سے خروج نجاست جب اس طور پر خوب سمجھ لے گا تو غیر سبیلین سے نکلنے والی نجاست کا حکم بھی سمجھ جائے گا۔

فروع کے ساتھ اصول کو حفظ کرنے کی مثال مثلاً فقہ کا ایک قاعدہ ہے۔ ''الیقین لا یزول بالشک'' ''یقین شک سے زائل نہیں ہوتا'' اب بے وضو ہونا یقینی ہو، اور باوضو ہونے میں شک ہو تو وضو اس پر واجب ہوگا۔اور اگر وضو ہونا یقینی ہو اور وضو ٹوٹنے میں شک ہو تو وضو کرنا ضروری نہیں ہوگا۔اسی اصول مذکور کی بنا پر کہ ''شک یقین کو ختم نہیں کرسکتا۔''

(۳): احکامات پر عمل کرنا۔کیوں اصل مقصود عمل ہے۔محض جاننا کوئی مقصود نہیں۔اسلئے کہ انسان کی آزمائش عمل سے ہوتی ہے نہ کہ محض علم سے۔

اشکال: عمل کو علم کے زمرے میں کس طرح شامل کیا گیا؟

جواب: اس لئے کہ علم سے مراد وہ علم ہے جو انسان کو آخرت میں عذاب الٰہی نجات سے دینے والا ہو اور نجات علم پر عمل کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اشکال: علم کی پہلی قسم میں عمل تو نہیں پایا جاتا؟

جواب: پہلی قسم میں بھی عمل ہے مگر وہ جوارح کا نہیں دل کا عمل ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی

ذات وصفات کا اعتقاد ہے۔

علم فقہ کی تین قسم ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم فقہ کو حکمۃ (دانائی) قرار دیا اور حکمت کا لغوی معنی علم الیقین کے ساتھ عمل کا منضم ہونا ہے اور حکیم (دانا) وہ کہلاتا ہے جو اپنے نفس کو خواہشات اور قبائح سے روکے، لہٰذا جو شخص فقہ کی ان تینوں اقسام کا حامل ہو وہ فقیہ کہلایا جائے گا۔ اور جو شخص ان میں سے بعض کا حامل ہو اور بعض کا نہ ہو اس کو مکمل فقیہ نہیں کہا جا سکتا، وہ ناقص فقیہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام عزیز میں فقہ کے حصول کی ترغیب ان الفاظ سے دی ہے۔

﴿فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون﴾ [التوبہ: ۱۲۲]

''سو کیوں نہ نکلا ہر فرقے میں سے ان کا ایک حصہ تا کہ سمجھ پیدا کریں دین میں؟ اور تا کہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جب کہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف، تا کہ وہ بچتے رہیں۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فقہاء کو انذار کی صفت سے متصف فرمایا ہے اور انذار کہتے ہیں علم وعمل کی طرف دعوت دینے کو۔ ایک مرتبہ ''فرقد السنجی'' نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مسئلہ دریافت کیا، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ بتا دیا۔ تو اس نے کہا: دوسرے فقہاء تو اس معاملے میں آپ کی مخالفت کرتے ہیں؟ فرمایا: ''اے فریقد'' تم نے کبھی فقیہ دیکھا بھی ہے ''فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ ہر وقت اس کی نظر اپنے نفس اور گناہوں پر ہوتی ہے۔ اور عبادت الٰہی میں ہمیشہ مگن رہتا ہے، تقویٰ سے سرشار اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے سے باز رہتا ہے۔''

فقہ کے متعلق ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ ''من یرد اللّٰه به خیراً یفقه فی الدین''[1] جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا معاملہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے۔

﴿الناس معادن کمعادن الفضة والذهب، خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا﴾[2]

''لوگ سونا چاندی کے خزانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جو زمانہ جاہلیت میں

---

[1] [صحیح مسلم: ۲/۷۱۸] [2] [مسلم: ۴/۲۰۴]

اچھے تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی اچھے ہیں۔ بشرطیکہ فقیہ ہوں۔''

مذہب حنفیہ کے اکابر حضرت امام اعظم اور ان کے شاگرد کتاب وسنت کے علم اور حضرات صحابہ کے طریقے پر مضبوطی سے عمل کرنے والے جبال علم وتقویٰ تھے۔ امام الحرمین ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ آیات وحدیث کے معانی گویا امام اعظم کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے۔ وقت کے علماء نے ان کی علمی حیثیت کو تسلیم کیا ہے ان کی حلال وحرام کی کامل معرفت کی وجہ سے، بدقتِ نظر ادلۃ سے احکام مستنبط کرنے کی وجہ سے، ایک دلیل سے کئی مسائل متفرع کرنے کی وجہ سے جبکہ ان کے اکثر ہم عصر اس کام سے عاجز تھے، جنہوں نے ان کی اس مہارت کی وجہ سے ان کو اصحاب الرای کا لقب دیا اور خود کو حدیث کی طرف منسوب کئے رکھا۔ ''رای'' دل کی نظر سے دیکھنے کو کہتے ہیں۔ ''المغرب'' میں رای کا معنی یہ لکھا ہے۔ ''الرای ما ارتاہ الانسان و اعتقدہ'' یعنی رائے وہ ہے جو انسان اپنے دل کی نظر سے دیکھے اور اس کا اعتقاد رکھے۔

وقت کے علماء نے ان کی علمی حیثیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ ان کی زبانیں امام صاحب کی تعریف میں مگن رہتیں۔ حضرت امام مالک ابن انس رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ مجھے امام ابو حنیفہ کے ساتھ کئی مجالس میں جانے اور گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ کئی مسائل میں گفت وشنید ہوئی۔ میں نے ان سے بڑھ کر فقیہ اور عالم اپنے زمانے میں نہیں دیکھا، علمی گہرائی میں غوطہ لگانا اور معانی کی تہہ تک پہنچ کر مسائل اخذ کرنا انہی کا کام تھا۔ اہل حدیث کہلانے کے لائق بھی بس یہی لوگ تھے۔ اسی لئے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ تعجب ہے لوگ مجھے کہتے ہیں کہ اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہے حالانکہ میں حدیث کے بغیر فتویٰ نہیں دیتا۔

نضر بن محمد کہتے ہیں: میں نے امام اعظم سے بڑھ کر حدیث پر عمل کرنے اور استدلال کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم پہلے کتاب اللہ سے استدلال کرتے ہیں، پھر حدیث سے، پھر حضرات صحابہ کے فیصلوں سے۔ اور صحابہ کے فتاویٰ میں ان فتاویٰ کو لیتے ہیں جن پر تمام صحابہ کا اتفاق ہو اور صحابہ کے اختلافی مسئلہ کو قیاس کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور وصف جامع پر عمل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرات حنیفہ حدیث پر عمل کرتے ہوئے حدیث مرسل سے بھی استدلال کرتے ہیں یعنی قیاس کے مقابلے میں حدیث مرسل کو ترجیح دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے حدیث مرسل سے استدلال کو ترک کیا ہے۔ انہوں نے حدیث کے بڑے ذخیرے کو نظر انداز کیا ہے۔ حتیٰ

کہ حنیفہ نے قیاس پر مجہول کی روایت اور قول صحابی کو بھی ترجیح دی ہے۔

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ادب القاضی میں لکھا ہے ”حدیث رای کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی“ (یعنی جب تک قلب کی نظروں اور گہرائی سے حدیث کے معانی میں غور نہیں کیا جائے گا کما حقہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچا جاسکتا) ”اور رای حدیث کے بغیر صحیح نہیں ہوسکتی“ لہٰذا جو شخص حدیث سے مکمل واقف نہ ہو اور اس کے اندر گہرائی نہ ہو تو اس کو فتویٰ دینا جائز نہیں۔ زیر نظر کتاب میں علم فقہ کی پہلی قسم یعنی علم الاحکام کے متعلق آپ پڑھیں گے۔

جیسا کہ کتاب کی پہلی جلد میں عبادات کا ذکر ہوا۔ اس دوسری جلد میں معاملات کا بیان ہوگا (یعنی بیوع، رباء، شرکت، کفالہ، وکالہ، حوالہ، رھن، شفعہ، اجارہ، بیع صرف، نکاح، طلاق، عدت، نفقات، حضانت، ایمان و نذور اور حدود وغیرہ اس کتاب کی ترتیب و مسائل کے بیان میں فقہ کی مشہور کتاب ”اللباب“ کی پیروی کی گئی ہے اور اس کو اپنا رہنما بنایا۔ کیوں کہ یہ ”جن مسائل“ کو میں نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر مسائل کو اس کتاب میں میں نے اپنے شیخ ابو حنیفہ وقت، فقیہ الشام شیخ عبدالوھاب سے اور بعض مسائل کو شیخ ابراہیم الیعقوبی رحمہما اللہ سے پڑھا ہے۔

میری سند

الحمد للہ میں نے فقہ حنفی کا علم اپنے شیخ، شیخ عبدالوھاب سے حاصل کیا، انہوں نے شیخ محمد عطاء اللہ سے، انہوں نے شیخ عبدالغنی الغنیمی المیدانی شاح الکتاب سے، انہوں نے خاتمۃ المحققین سید محمد امین عابدین سے، انہوں نے شیخ شاکر العمری السالمی سے، انہوں نے شیخ زین الدین مصطفیٰ الرحمتی الایوبی سے، انہوں نے العارف شیخ عبدالغنی النابلسی سے، انہوں نے اپنے والد شیخ اسماعیل النابلسی رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے ابو البرکات حسن بن عمار الشرنبلالی سے، انہوں نے شیخ الاسلام عبداللہ النحریری اور محمد بن عبدالرحمٰن المسیری، شیخ محمد بن احمد بن الحموی اور شیخ مجیب الحمی سے، ان چاروں نے حضرت شیخ احمد بن یونس الشلبی صاحب الفتاوی سے، انہوں نے سری الدین عبدالبر بن محب الدین محمد بن شحنہ شارح الوھبانیہ سے۔ انہوں نے المحقق الکمال محمد بن عبد الواحد بن الھمام شارح ہدایہ سے، اور انہوں نے سراج الدین عمر بن علی الکنانی قاری الھدایۃ سے، انہوں نے شیخ علاؤ الدین احمد محمد السیرامی سے، انہوں نے سید جلال الدین بن شمس الدین الکرمانی شارح الھدایۃ سے، اور انہوں نے الامام علاؤ الدین عبدالعزیز بن احمد البخاری صاحب الکشف والتحقیق

سے، انہوں نے الامام حافظ الدین النسفی محمد بن محمد سے، انہوں نے شمس الائمہ محمد بن عبدالستار الکردی سے، انہوں نے فخر الاسلام علی بن محمد البز دوی سے، انہوں نے شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسی سے، انہوں نے شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد الحلو انی سے، انہوں نے القاضی ابوعلی النسفی سے، انہوں نے الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری سے، انہوں نے الاستاذ عبداللہ بن محمد السبذ مونی سے، انہوں نے الامیر ابوحفص الصغیر محمد البخاری سے، انہوں نے اپنے والد ابو الحفص الکبیر احمد البخاری سے، انہوں نے الامام الربانی محمد بن حسن الشیبانی سے، انہوں نے الامام الاعظم ابوحنیفہ النعمان بن ثابت صاحب المذہب سے، انہوں نے حماد بن زید سے، انہوں نے ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے علقمہ سے اور علقمہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا۔ اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے میری التجاء ہے کہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے اس کاوش کو خاص اپنی ذات کیلئے خالص کر دے اور اس کے لکھنے والے، پڑھنے والے اور اس کے ناشر کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ میں نے بقدر طاقت بشری صحیح بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس میں جو درست باتیں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدینۃ الرسول میں لکھنے کی برکت اور اساتذہ کرام کی دعاؤں کا ثمر ہوں گی۔ اور اگر کوئی کوتاہی نظر آئے بس اسے میری کمزوری سمجھیں، کیوں؟ "خُلِقَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا"

واستغفر اللّٰه العظيم، وأتوب اليه والحمد للّٰه اوّلا وأخراً

علی ما انعم و تفضل. وهو المقصود و عليه المعول:

كتبه: حامدا و مصليا

اسعد محمد سعيد الصاغرجي

بالمدينة المنورة ليلة الجمة" ۱۰ رجب ۱۴۱۹ھ

﴿کتاب البیوع﴾

''بیع'' کا لغوی معنی مطلق تبادلہ ہے چاہے، مال کا تبادلہ ہو یا کسی اور شئی کا۔ اور ''شریٰ'' کا لغوی معنی بھی مطلق تبادلہ ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

''ان اللّٰہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم'' [التوبہ:۱۱۱]

''بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید چکے۔''

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

''اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّللةَ بِالْھُدی'' [البقرۃ:۱۶]

''یہ وہی ہیں جنہوں نے مول لی گمراہی ہدایت کے بدلے میں۔''

لفظ بیع متعدی بدو مفعول استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے ''بعتک الشی'' میں دو مفعولوں ''ک'' اور ''شی'' کی طرف متعدی ہے اور کبھی اس کے مفعول اول پر ''من'' بھی داخل ہوتا ہے۔ تاکید کیلئے۔ کہا جاتا ہے۔ ''بعت من زید الدار'' ''میں نے زید کو گھر فروخت کیا'' اور کبھی مفعول اول پر لام بھی داخل ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے بعت لک الشئ ''میں نے تیرے ہاتھ چیز فروخت کی'' یہ لام زاید ہوتا ہے۔ ابتاع اشتری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بیع کا شرعی معنی:

''مبادلة المال المتقوم بالمال المتقوم تملیکا و تملکا بالتراضی'' یعنی مالک بننے یا بنانے کی غرض سے آپس کی رضامندی سے مال متقوم کو مال متقوم کے بدلے فروخت کرنا۔

بیع شریعت میں مشروع ہے۔ اس کی مشروعیت قرآن وسنت اور قیاس سے ثابت ہے۔

قرآن سے ثبوت:

فرمان الٰہی ہے ''واحلّ اللّٰہ البیع'' [البقرۃ:۲۷۵] ''حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے تجارت کو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''الا ان تکون تجارة عن تراض منکم'' [النساء: ۲۹]

''مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے۔''

حدیث سے ثبوت:

حضور ﷺ جب مبعوث ہوئے تو لوگ خرید وفروخت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ خود حضور ﷺ نے خرید وفروخت کی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک یہودی سے ایک وقت معین تک قیمت کی ادائیگی کے معاہدے پر غلہ خریدا اور بطور رہن کے اپنا زرہ اس کے پاس رکھوا دیا۔

حضرت عروۃ البارقی سے روایت ہے، حضور ﷺ نے ان کو ایک دینار دیکر ایک بکری خرید لانے کا حکم دیا۔ انہوں نے ایک دینار سے دو بکریاں خریدیں۔ ایک بکری کو ایک دینار کے عوض فروخت کیا پھر حضور ﷺ کی خدمت میں ایک بکری اور ایک دینار پیش کیا، حضور ﷺ نے ان کے لئے کاروبار میں برکت کی دعا دی۔ چنانچہ ان کی کیفیت یہ تھی۔ وہ اگر مٹی بھی خریدتے اس میں بھی نفع ہوتا۔

قیاس سے ثبوت بیع:

انسانی ضرورت اس کے جواز کا تقاضا کرتی ہے کیوں کہ انسانوں کو سامان اور اشیاء خوردنی کی ضرورت پڑتی رہتی ہے جو بعض کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں بعض کے نہیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے بیع وشراء کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ کیوں کہ انسان کی طبیعت میں مال کی محبت اور بخل موجود ہے۔ وہ اپنے مال کو بلاعوض کسی کو دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا، لامحالہ اس کو حاصل کرنے کا عوض دینا پڑے گا تا کہ ضرورت مرتفع ہو جائے۔

بیع کے رکن دو ہیں:

ایجاب وقبول، ایجاب وقبول سے بیع منعقد ہوتی ہے کیونکہ یہ عاقدین کی رضامندی پر دلالت کرتے ہیں۔ بائع اور مشتری میں سے جو بھی پہلے کلام کرے اس کو ایجاب کہتے ہیں اور بعد میں ذکر کیا جانے والا لفظ قبول کہلاتا ہے۔

شرط بیع:

متعاقدین میں بیع وشراء کی اہلیت کا پایا جانا۔ اگر ان میں کسی ایک میں اہلیت بیع وشراء نہ ہو تو بیع منعقد نہیں ہوگی۔ اہلیت کی ابتداء امتیاز کرنے کی صلاحیت سے ہوتی ہے۔

بیع کا حکم:

مبیع میں مشتری کیلئے ملکیت کا ثابت ہونا اور بائع کیلئے ثمن میں ملکیت ثابت ہونا ہے۔

محل بیع:

مال ہے۔

وہ الفاظ جن سے بیع منعقد ہوتی ہے:

اگر ایجاب وقبول صیغہ ماضی سے ہوتو بیع منعقد ہو جاتی ہے جیسے ایک کہے، میں نے فروخت کیا، دوسرا کہے میں نے خرید لیا۔ بیع وشراء انشاء ہیں۔ شریعت نے لفظ بعت و اشتریت کو انشاء بیع کیلئے معتبر جانا ہے، یعنی تمام عقود میں صیغہ ماضی کو انشاء عقد کے لئے معتبر قرار دیا گیا۔ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انعقاد بیع کیلئے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو بیع کے تحقق پر دلالت کرتا ہے۔ مستقبل کا لفظ اگر بائع کی طرف سے ہو (یعنی کہے میں بیچوں گا) تو وعدہ ہے بیع نہیں۔ اگر مشتری کی طرف سے ہو (میں خریدوں گا) تو بھاؤ تاؤ ہے، لہٰذا اس سے بیع منعقد نہیں ہوگی۔ بیع ہر اس لفظ کے استعمال سے منعقد ہوگی جو خرید وفروخت کا معنی دیتا ہو جیسا کہ کہے، میں نے یہ چیز تمہیں دی۔ یا میں نے تجھے اس کا مالک بنایا۔ دوسرا کہے۔ میں نے لے لی، یا کہے قبول کیا، یا کہے کہ میں راضی ہو گیا، یہ الفاظ رضا وقبول پر دلالت کرتے ہیں۔ بیع میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے۔ الفاظ کا نہیں۔ چنانچہ کسی چیز معین کی قیمت معروف ہو اور ایک شخص اگر آکر قیمت خاموشی سے بائع کو پکڑا کر چیز لے جائے تو یہ بیع جائز ہے۔ اس کو بیع تعاطی کہتے ہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے کیوں کہ یہ عمل جانبین کی رضا مندی پر دلالت کرتا ہے۔ ایجاب وقبول سے بھی مقصود، اظہار رضامندی ہے۔ ایجاب وقبول میں سے ایک صیغہ امر کے ساتھ ہو مثلاً ایک کہے۔ مجھ سے خریدو، یا مشتری کہے یہ چیز فروخت کرو، تو انعقاد بیع کیلئے تین الفاظ ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک ماضی کا صیغہ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اوپر کی مثالوں میں پہلا اشتریت ، دوسری بعت کہہ دے تو بیع منعقد ہو جائے گی، اگر مستقبل کا صیغہ استعمال کیا تو بیع منعقد نہیں ہوگی۔

بیع کے اندر قیمت کا تعین اور مبیع کا متعین ہونا ضروری ہے، ورنہ بیع منعقد نہیں ہوگی اگرچہ ایجاب وقبول کیوں نہ ہوئے ہوں۔

خیار قبول:

متعاقدین میں سے ایک کے ایجاب کے بعد دوسرے کو اختیار ہوگا، مجلس عقد میں یا تو کل مبیع کو کل ثمن کے عوض قبول کرے، یا انکار کردے، البتہ ایجاب کرنے والے کو اپنے الفاظ واپس لینے کا اس وقت تک اختیار ہوگا جب تک دوسرا قبول کے الفاظ نہ کہہ دے۔ اس اختیار کو فقہ کی زبان میں خیار قبول کہا جاتا ہے۔ یہ اختیار مجلس کے اختتام تک برقرار رہتا ہے، یعنی جب تک بیع کی گفتگو جاری ہو، اگر اس بیع کے متعلق گفتگو ختم ہوکر بالکل اس سے غیر متعلق گفتگو شروع ہوجائے تو مجلس بیع ختم ہوگئی۔ دوسری گفتگو شروع ہونے کے بعد قبول کے الفاظ بول دے گا تو بیع منعقد نہیں ہوگی۔

دلیل نمبر ۱:

یہ ہے کہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''البیعان بالخیار مالم یتفرقا، فإن صدقا و بیّنا بورک لهما فی بیعهما و ان کذبا و کتما محقت برکة بیعهما''[۱] ''بائع و مشتری کو خیار حاصل ہے۔ جب تک مجلس برخاست نہ ہو، اگر وہ سچ بولیں اور واضح بات کریں تو ان کی بیع میں برکت ہوگی۔ اگر جھوٹ اور کتمان سے کام لیں گے تو بیع سے برکت ختم کردی جائے گی''۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب کوئی چیز خریدتے تو اگر وہ بیٹھے ہوئے ہوتے تو فوراً کھڑے ہوجاتے تاکہ بیع مکمل ہوجائے اور بائع کو اپنا ایجاب کے الفاظ واپس لینے کا اختیار نہ رہے کیوں کہ مجلس سے اٹھنا یا کسی اور کام میں مشغول ہونا مجلس کے برخاست ہونے پر دلالت کرتا ہے اور مجلس کے برخاست ہونے سے اختیار ختم ہوجاتا ہے۔ خیار قبول بائع و مشتری دونوں کو حاصل ہے۔

بیع کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بیع کو کسی غیر موجود شخص کے قبول پر موقوف نہ کیا جائے مثلاً کہے، میں نے یہ فلاں کو فروخت کردیا اور وہ موجود نہ ہو اس تک یہ بات پہنچ جائے اور اس وقت وہ اس کو قبول کرے تو بیع منعقد نہیں ہوگی۔ ہاں اگر باقاعدہ لکھ کر یا بذریعہ پیغام اس تک بات پہنچائے تو خط یا پیغام پہنچنے کی مجلس کا اعتبار ہوگا۔

---

۱ [ترمذی: ۳۵۹/۲]

اگر دو آدمی چلتے ہوئے ایجاب وقبول کرلیں تو جب تک اسی گفتگو میں چل رہے ہیں تو مجلس برقرار ہے، اگر دوسری بات شروع کردی جس کا پہلی بات سے کوئی جوڑ نہ ہو تو مجلس ختم شمار ہوگی۔

حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں۔ جب تک بدناً جدا نہ ہوں گے مجلس برقرار رہے گی، حدیث سابق کی بنا پر حنفیہ کا قول اصح ہے۔ یہ جو اختیار متعاقدین کو مجلس میں حاصل ہے یہ قبول کے الفاظ کہنے تک ہے۔ جب دوسرے کی طرف سے قبول ہو جائے تو فسخ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔اس لئے کے ایجاب وقبول سے بیع تمام ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ بیع کے دو رکن اور شرائط مکمل ہیں ایک کی رضا مندی کے بغیر فسخ کرنا دوسرے کے حق کو باطل کرنا ہے اور یہ جائز نہیں ہے اور اوپر کی بیان کردہ حدیث خیار قبول پر محمول ہے۔

دلیل ۳:

فرمان الٰہی ہے:

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" [المائدہ:۱]

"اے ایمان والو! اپنے وعدہ کی ایفاء کرو"

دلیل ۴:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ" [النساء: ۲۹]

"اے ایمان والو نہ کھاؤ مال آپس میں ایک دوسرے کے ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے"

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مشتری کیلئے تخییر سے پہلے کھانے کو جائز قرار دیا۔ اگر بیع کی تکمیل کے بعد اختیار فسخ حاصل ہوگا اور بیع کو تام قرار نہ دیا جائے گا تو نصوص کا ابطال لازم آئیگا۔

قبول کے بعد متعاقدین میں سے کسی کو بلا وجہ فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، ہاں اگر مبیع یا ثمن میں عیب پایا جائے یا مبیع کو دیکھنے کے بعد یا بیع کرتے وقت خیار شرط لگائے (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) تو اختیار فسخ ہوگا۔

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "البیعان بالخیار کا مطلب

اس سے مراد خیار قبول ہے، خیار قبول یہ ہے مثلاً متعاقدین میں سے ایک نے ایجاب کیا تو دوسرے کو مجلس میں قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار حاصل ہے، چاہے رد کرے چاہے قبول کرے، مثلاً بائع کہہ دے، یہ کپڑا میں نے ایک ہزار روپے کے عوض آپ کو فروخت کیا، صرف اس عبارت سے بیع تام نہیں ہوتی، مشتری کو اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس طرح مشتری کہہ دے یہ کپڑا میں نے تجھ سے ایک ہزار کے بدلے خرید لیا تو بائع کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار اس مجلس میں حاصل ہے۔ اس کو خیار قبول کہا جاتا ہے۔

بیع وثمن کی معرفت کا وجوب

مجہول مبیع یا ثمن کی بیع جائز نہیں ہے، جہالت کو دور کرنے کیلئے ان کو پہچاننا اور ان کی حقیقت سے باخبر ہونا ضروری ہے تا کہ آگے جا کر جھگڑے کا باعث نہ بنے، چنانچہ اگر یہ سامنے موجود ہوں تو معاینہ کرنا کافی ہے۔ کیوں کہ اس سے پہچان لیا جاتا ہے اور جھگڑے کا خطرہ نہیں رہتا ہے اگر مبیع مجلس بیع میں موجود نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر بیع ایسی ہو جس کا کوئی نمونہ موجود ہو تو وہ دکھایا جائے، تو نمونہ کو دیکھنا گویا اصل کو دیکھنا ہے، البتہ سامنے آنے کی صورت میں نمونہ سے مختلف ہو تو مشتری کو خیار عیب حاصل ہوگا اور اگر بیع ایسی ہو کہ اس کا کوئی نمونہ نہیں ہے مثلاً حیوان وغیرہ تو اس کی تمام صفات بیان کی جائیں تا کہ تنازعات کی راہ مسدود ہو جائے، اس صورت میں مشتری کو خیار رویت حاصل ہوگا۔

اس طرح ثمن کی معرفت بھی ضروری ہے۔ اس کی مقدار وتوصیف بیان کرنا ضروری ہے اگر حاضر نہ ہو منازعت کی راہ کو مسدود کرنے کیلئے۔ اگر بیع میں ثمن کو مطلق رکھا تو وہ سکہ رائج الوقت پر محمول ہوگا۔ مثلاً کہے کہ میں نے پچاس کے بدلہ یہ خریدا، تو پچاس سے مراد سکہ رائج الوقت ہوگا۔ اور شئی کی قیمت کے بقدر ہوگا اگر علاقے میں مختلف سکے رائج ہوں تو بیع نہیں ہوگی۔ الا یہ کہ مجلس بیع میں اس کا تعین کرے، تو بیع منعقد ہو جائے گی۔ کیوں کہ رفع فساد پایا گیا۔

بیع مقایضۃ:

یعنی اندازے کے ساتھ بیع کرنا۔ غلے کی بیع وزن کر کے، یا اندازاً کھجور کے عوض یا نقدی کے عوض جائز ہے۔ یعنی بیع اور ثمن کی جنس مختلف ہو تو مبیع کا اندازہ لگا کر فروخت کرنا جائز

ہے۔اس کی دلیل! حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے۔

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں لوگوں کو جزافا (اٹکل کے ساتھ) بیع کرتے دیکھا ہے۔[1]

یہ جب ہے کہ مبیع اور ثمن کی جنسیت مختلف ہو، اور اگر مبیع اور ثمن کی جنس ایک ہو تو مبیع و ثمن برابر سرابر اور دست در دست ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز، اس کی دلیل حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان ہے جس کو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الذهب بالذهب مثلاً بمثل، والفضة بالفضة مثلا بمثل، والتمر بالتمر مثلا بمثل، والبر بالبر مثلا بمثل، والملح بالملح مثلا بمثل، والشعير بالشعير مثلا بمثل، فمن ازداد او داد فقد اربى بيع الذهب بالفضة كيف شئتم يدا بيد و بيعوا البربالتمر كيف شئتم يدا بيد وبيعوا الشعير بالتمر كيف شئتم يدا بيدٍ"[2]

''سونے کو سونے کے بدلے برابر سرابر فروخت کرو، چاندی کو چاندی کے بدلے برابر سرابر بیچو، کھجور کو کھجور کے بدلے برابر فروخت کرو، گندم کو گندم کے بدلے برابر سرابر فروخت کرو، نمک کو نمک کے بدلے برابر سرابر فروخت کرو، جو کو جو کے بدلے برابر فروخت کرو۔ جس نے زیادہ دیا یا لیا تو اس نے سود لینے دینے کا ارتکاب کیا۔سونے کو چاندی کے بدلے جس طرح چاہو بیچو مگر دست بدست ہو، گندم کو کھجور کے بدلے ہاتھ در ہاتھ جس طرح بیچنا چاہو بیچو، جو کو کھجور کے بدلے ہاتھوں ہاتھ تفاضل کے ساتھ بیچ سکتے ہو۔''

یعنی اشیاء مذکورہ میں جنس کے بدلے جنس فروخت کرنا تو برابر سرابر اور ہاتھ در ہاتھ ہونا چاہئے اور اگر جنس مختلف ہو تو تفاضل جائز ہے مگر ادھار جائز نہیں۔

بیع الجملہ:

جو شخص گندم یا چاول یا چینی یا آٹا یا کسی اور چیز کے ڈھیر کو یہ کہہ کر فروخت کرے کہ یہ ڈھیر فی کلو اتنے روپے کے عوض فروخت کرتا ہوں تو حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک بیع منعقد

[1] [بخاری:۴۳۳] [2] [الترمذی۶/۳۵۴]

ہو جائے گی (حنفیہ کے ہاں فتوی اسی قول پر ہے) اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف ایک کلو کی بیع صحیح ہوگی، باقی کی صحیح نہیں ہوگی۔ الا یہ کہ بائع ڈھیر کی کل مقدار بتا دے کہ اس میں اتنے کلو ہیں یا مجلس ہی میں اس کو تول کر واضح کر دے تو سب میں بیع درست ہو جائے گی۔

حضرات صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ جہالت کو ختم کرنا ان کے اختیار میں ہے لہٰذا یہ جھگڑے کا باعث نہیں ہوگی، جبکہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بیع مجہول ہے مقدار کے مجہول ہونے کی وجہ سے۔ تو لنے سے قبل ملکیت آنے کے باوجود اس میں سے خرچ نہیں کر سکتا۔ البتہ ایک کلو معلوم ہے اس میں بیع صحیح ہوگی۔ ہاں اگر جہالت پورے ڈھیر سے زائل ہو جائے۔ تو تمام کی بیع درست ہے۔ جب ایک کلو میں جائز ہے تو صفقہ میں تفرق کی وجہ سے مشتری کو خیار حاصل ہوگا۔ اور اگر بکریوں کا ایک ریوڑ فی بکری ایک ہزار روپے کے حساب سے فروخت کرے تو ایک میں بھی بیع منعقد نہیں ہوگی۔ کیوں کہ بکری بکری میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بخلاف کلو کلو کے۔ ان میں فرق نہیں ہوتا لہٰذا اس میں بیع صحیح ہوگی۔ جبکہ بکریوں میں کسی ایک میں بھی بیع صحیح نہیں ہوگی اگر چہ عقد کے بعد بکریوں کی تعداد معلوم بھی ہو جائے کیوں کہ وقت بیع مبیع مجہول تھی۔

حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ڈھیر کی مقدار کو متعین کر دے کہ اس میں اتنے کلو ہیں یا ریوڑ کی بکریوں کی تعداد متعین کر کے بتا دے تو تمام میں بیع منعقد ہو جائے گی۔ ان کا کہنا ہے اس سے جہالت دور ہوگئی اور مانع ختم ہو گیا۔

مثلاً اگر کوئی شخص چاول کا ایک ڈھیر تین سو روپے کے عوض اس شرط پر خریدتا ہے کہ اس میں سو کلو ہیں مگر تولنے پر سو کلو سے کم پڑ گئے تو مشتری کو اختیار ہوگا، چاہے موجود کو اس کے حساب سے لے لے، چاہے بیع کو فسخ کر دے۔ صفقہ میں فرق آنے کی وجہ سے، لیکن عدد متعین سے زیادہ نکلے تو زائد بائع کا ہوگا۔ کیونکہ بیع صرف مقدار معین میں منعقد ہوئی ہے۔ جو زائد ہے وہ اس مقدار کے تحت داخل نہیں ہے تو وہ بائع کا ہی حصہ ہوگا۔

مسئلہ: اگر کپڑوں کا ایک بنڈل ایک ہی نوع کا مثلاً دس ہزار کے عوض اس شرط پر خریدا کہ اس بنڈل میں سو تھان ہیں یا ایک زمین دس لاکھ کے عوض اس شرط پر خریدی کہ یہ سو مرلہ ہے۔ دونوں صورتوں میں خریدنے کے بعد معلوم ہوا کہ مقدار معین سے کم ہے تو مشتری کو اختیار حاصل ہوگا کہ چاہے ثمن مقررہ کے عوض اس موجود کو لے لے، چاہے بیع کو فسخ کر دے۔ بخلاف پہلی صورت کے، کیوں کہ اس میں مقدار ثمن کے مقابلے میں ہے دوسری صورت میں مقدار محض وصف ہے اور وصف ثمن کے مقابل نہیں ہو سکتا۔ ہاں وصف کے فوت ہونے کی وجہ سے لینے اور نہ لینے کا اختیار

ہوگا۔ البتہ اس صورت میں یہ ہوگا کہ اگر مقدار معین سے کپڑا یا زمین زیادہ نکلے تو وہ مشتری کا ہوگا۔ بائع کو اختیار نہیں ہوگا کیوں کہ ہم نے اوپر بیان کیا یہ مقدار محض وصف ہے۔ یہ گویا ایسا ہوا کہ ایک شخص نے ایک چیز عیب دار سمجھ کر فروخت کی مشتری نے قبضہ کر کے دیکھا تو اس میں کوئی عیب نہیں تھا بلکہ وہ درست تھی تو اب بائع کو اختیار نہیں ہوگا لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ زمین میں ناپ مقصود نہ ہو۔ اگر یوں کہے، یہ زمین میں نے تیرے ہاتھ فروخت کر دی یہ زمین ۱۰۰ مرلہ ہے۔ ایک لاکھ روپے میں، فی مرلہ ایک ہزار کے حساب سے، اس صورت میں اگر زمین کی مقدار سو مرلہ نہ ہو، تو مشتری کو اختیار ہوگا چاہے جتنی زمین ہے اسی حساب سے قیمت دیکر زمین کو اپنے پاس برقرار رکھے، چاہے بیع کو فسخ کر دے صفقہ میں فرق آنے کی وجہ سے ہے۔ اس لئے کہ وصف اگر چہ تابع ہے لیکن ثمن کو ذکر کرنے کی وجہ سے وصف اصل کی صورت اختیار کر گیا۔ اس صورت میں اگر مقررہ مقدار سے زائد نکلے تو مشتری کو اختیار ہوگا چاہے تو فی مرلہ ہزار کے حساب سے اس کو لے لے یا بیع کو فسخ کر دے، زائد کے التزام کے نقصان کو دفع کرنے کیلئے۔

گھر اور زمین کی بیع میں داخل ہونے والی چیزیں

جو گھر فروخت کرے، اس کی تعمیر بھی عقد میں داخل ہوگی اور ہر وہ چیز بھی بیع میں داخل ہوگی جو گھر کے ساتھ مستقل لگی ہوئی ہے (یعنی ہر وہ چیز جس کو جدا نہ کرنے کیلئے اس کے ساتھ لگا دیا گیا ہو) اگر چہ بیع کرتے وقت ان کا نام نہ بھی لیا گیا ہو، جیسے دروازے میں لگے ہوئے تالے، ان کی چابیاں، بجلی کی وائرنگ، شیشے وغیرہ، درختوں والی زمین کی فروختگی میں درخت بھی داخل ہوں گے، اگر چہ ان کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اس لئے کہ زمین کے ساتھ مستقل طور پر لگے اور جڑے ہوئے ہیں، بخلاف فصلوں اور پھلوں کے، کیونکہ ان کا اتصال مستقل نہیں ہے۔ خریدنے کے بعد بائع سے کہا جائے گا۔ فصلوں کو کاٹ کر لے جاؤ اور پھلوں کو اتار لو، مبیع مشتری کے حوالے کر دو، کیوں کہ بیع کے مقتضی پر عمل کرتے ہوئے مبیع کو بائع کے حوالہ کرنا مشتری پر واجب ہے، اور یہ عمل فصلوں کو کاٹنے اور پھلوں کو اتارے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو یہ عمل اس پر واجب ہوگا الا یہ کہ مشتری خریدتے وقت فصلوں کو برقرار رکھنے اور پھلوں کو بھی بیع میں شامل کرنے کی شرط لگا دے تو یہ بیع کے تحت داخل ہوں گے۔ دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے، ''من باع نخلا فقد أبرّت فثمر تها للبائع، الاّ ان يشترط المبتاع''[1] ''جو ایسا باغ فروخت کرے جس کے پھل ظاہر ہو چکے ہوں تو وہ پھل بائع کا ہے الا یہ کہ مشتری اس کی شرط لگائے'' حضرات حنفیہ رحمہم اللہ نے أبرت کا معنی اظهر الثمر

[1] [بخاری ۵۴۵]

سے کیا ہے۔

شرط لگانے کی صورت یہ ہے کہ مشتری یہ کہے یہ باغ میں نے تجھ سے خریدا اس شرط کے ساتھ کہ پھل بھی میرے ہوں گے یا بائع یہ کہے، یہ باغ میں نے فروخت کیا اس کے پھل بھی تمہارے ہیں۔ یہ شرط فاسد نہیں ہے۔

پھلوں کی بیع

پھل اگر درختوں پر ظاہر ہو چکے ہوں تو پکنے سے قبل انہیں فروخت کرنا جائز ہے۔ چاہے انسانوں کے کھانے کے قابل ہوں یا جانوروں کے، لیکن اگر اس سے کسی بھی طرح انتفاع نہ ہوسکتا ہو تو ان کی بیع بالکل جائز نہیں ہے۔ درختوں پر ظاہر ہونے سے قبل پھلوں کی بیع کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ اس لئے کہ وہ بے فائدہ ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد بھی ہے۔ "لاتبیعوا الثمرة حتی یبدو صلاحها" "بدو صلاح سے قبل پھلوں کی بیع جائز نہیں۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے استفادہ کے قابل ہونے سے قبل پھل فروخت کرنے سے منع فرمایا: بدو صلاح کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: آفت کے خطرے سے نکل جائے اور کھانے کے قابل ہو جائے۔[1]

حضرات حنفیہ نے کھانے کے قابل ہونے سے قبل فروخت کرنے کو اس لئے جائز قرار دیا کہ حضرت زید بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں لوگ بدو صلاح (کھانے کے قابل ہونے) سے قبل پھلوں کو فروخت کیا کرتے تھے، جب کاٹنے لگتے تو تقاضا کرنے والے آتے تو کہتے، پھلوں کو نقصان پہنچا ہے۔ پھل مختلف امراض کی زد میں آ گئے۔ جب اس طرح کے جھگڑے بڑھ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے بطور مشورہ کے فرمایا: جس کی طرف آپ کا یہ فرمان بھی مشیر ہے۔ فرمایا "اما لا فلاتبتا عوا الثمر حتی تبد و صلاحها"۔[2]

پھل پکنے کے بعد خریدار اور بائع کی اجازت سے پھلوں کو درختوں پر رہنے دیا بغیر کسی شرط کے تو یہ خریدنے کے بعد سے اتارنے کے درمیان زیادہ ہونے والا منافع پاک اور حلال ہے۔ اگر بائع کے حکم کے بغیر چھوڑ دیا ہو تو زیادتی کو صدقہ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ غیر کے مملوک سے ناجائز طور پر حاصل ہوا ہے۔ ہاں پھلوں کو برقرار رکھنے کیلئے درختوں کا کرایہ ادا کرے تو یہ زیادتی اس کے لئے حلال ہو گی اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک باغ خریدتے وقت پھلوں کو درختوں پر چھوڑے رہنے کی شرط لگا دے تو استحسانا جائز ہے، لیکن حضرات شیخین کے قول پر۔

---

[1] [بخاری: ۲۹۷] [2] [دار قطنی: ۲/۱۴]

پھل اتارنا مشتری کی ذمہ داری ہے۔ اگر کچھ پھل ظاہر ہو گئے ہوں اور بعض نہ ہوئے ہوں اس طور پر کہ بعض کو کاٹنے سے بعض ظاہر ہوتے ہیں، جیسا کہ بینگن، گلاب وغیرہ۔ اس قسم کے پھلوں کو فروخت کر دیا اور مشتری کے قبضہ کرنے سے پہلے مزید پھل ظاہر ہو گئے، تو بیع فاسد ہوگی۔ کیوں کہ مبیع اور غیر مبیع کے درمیان تمیز کرنا ممکن نہیں ہے، اگر قبضے کے بعد پیدا ہو گئے تو اس میں دونوں مشترک ہوں گے، لیکن اس کی مقدار کی تعیین میں مشتری کے قول کا اعتبار کیا جائے گا اس لئے کہ یہ اس کے قبضے میں ہے اور وہ منکر ہے۔

باغ کے پھلوں کو اس طرح فروخت کرنا جائز نہیں ہے کہ اس میں سے کچھ معلوم مقدار مستثنیٰ کرے۔ مثلاً سیب یا انکار کا باغ فروخت پر یہ کہہ دیا کہ اس میں سے بیس پیٹی میں خود لوں گا وہ بیع میں داخل نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس صورت میں مبیع مجہول ہوگئی۔ مبیع اور غیر مبیع متعین نہیں ہوئی۔ بخلاف اس صورت کے یہ باغ میں نے فروخت کیا۔ مگر فلاں فلاں درخت کے پھل فروخت نہیں کئے۔ درخت متعین کر دیا یہ صورت جائز ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں مبیع متعین و معلوم ہے۔ اس لئے یہ بیع جائز ہے۔ خوشوں میں موجود گندم کو یا لوبیا وغیرہ کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اس کو گاھنا اور بھوسے سے جدا کرنا بائع کی ذمہ داری ہوگی۔ بھوسہ بائع کا ہوگا۔ الا یہ کہ خوشوں کے ساتھ خریدا ہو، تو اس صورت میں گاھنا، دانوں کو علیحدہ کرنا بائع پر لازم نہیں ہوگا۔

بیع کس طرح تام ہوگی؟:

سامان کو ثمن کے عوض فروخت کرنے کی صورت میں مشتری پہلے ثمن بائع کے حوالہ کر دے۔ اس لئے کہ ثمن بائع کا حق ہے۔ اور رقم قبضے کے بغیر متعین نہیں ہوتی اور مبیع مشتری کا حق ہے وہ محض متعین کرنے سے متعین ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ادائیگی ثمن سے متاخر ہوگی۔ الا یہ کہ ثمن مؤجل ہو۔ اس صورت میں پہلے مشتری بیع پر قبضہ کر لے گا۔ کیوں کہ تاجیل پر راضی ہو کر بائع نے اپنا حق اولیت ساقط کر دیا اور اگر سامان مجلس بیع میں حاضر نہ ہو۔ یا زمین پر فصل لگی ہو تو مشتری سے ادائیگی ثمن کا مطالبہ سامان کو حاضر کرنے سے قبل یا زمین فارغ کرنے سے پہلے نہیں کیا جائے گا۔

اور اگر سامان کو سامان کے بدلے مقایضۃً یا روپوں کو روپوں کے بدلے فروخت کیا جا رہا ہو تو ہاتھ در ہاتھ اور برابر سرابر ہونا ضروری ہے۔

مشتری کیلئے ثمن میں اضافہ کر کے دینا جائز ہے بشرطیکہ بیع موجود ہو اور بائع اس کو قبول کر لے۔

اس طرح بائع کیلئے مبیع میں اضافہ کرنا جائز ہے۔ اگر مشتری قبول کرے تو بائع پر اس اضافہ کو حوالہ کرنا لازم ہوگا۔ بائع کیلئے یہ بھی جائز ہے کہ ثمن میں کچھ کمی کردے، اگر چہ بیع ہوگئی ہو۔ اور ثمن پر قبضہ ہو چکا ہو زیادتی بیع کے ساتھ ملحق ہوگی۔ اس طرح تصور ہوگا کہ گویا بیع ہی اس طرح ہوئی ہے۔ اگر اضافہ کے بعد مشتری کو معلوم ہوا کہ اصل مبیع میں عیب ہے اضافہ میں نہیں ہے تو مشتری کو اختیار ہوگا چاہے بیع کو فسخ کردے چاہے اسی پر راضی ہوجائے، یہ اختیار نہیں ہوگا کہ اضافہ کو اپنے پاس رکھے اور معیب کو واپس کردے۔ اگر عیب کی اطلاع بعد القبضہ ہو تو عیب کی بقدر ثمن واپس لے لے، اگر چہ عیب اضافہ میں ہو۔

مبیع کے ساتھ ایسی چیز کا اضافہ کیا گیا جس کو بیچنا یا خریدنا جائز نہیں ہے اور دوسرے نے قبول بھی کرلیا۔ تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع فسخ ہوگی۔ جبکہ حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اضافہ باطل ہوگا اور عقد بیع اپنی جگہ پر برقرار رہے گا۔

منقول کی بیع

قبل القبضہ منقول کی بیع جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے کسی فیکٹری سے کوئی چیز خریدی، اس پر ابھی قبضہ نہیں کیا تو قبضہ کرنے سے پہلے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ یا کوئی چیز بیرون ملک سے خریدی، مال ابھی پہنچا نہیں اور قبضہ نہیں ہوا آگے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر مال بندرگاہ یا اڈے تک پہنچ گیا اور اپنے سٹور میں محفوظ کرلیا گیا اب اس کو فروخت کرسکتا ہے۔ یہ قبضہ شمار ہوسکتا ہے۔ اس طرح اگر آپ کے وکیل نے اس پر قبضہ کرلیا تو آپ اس کو فروخت کرسکتے ہیں۔ اگر وکیل نے قبضہ بھی نہیں کیا اور اس کی نگرانی میں بھی نہ ہو۔ تو اس کی بیع جائز نہیں ہوگی۔

اگر کسی شخص کو حکومت کی طرف سے زمین ملنے کی دستاویز دی گئی اور ابھی تک زمین کی تحدید نہیں ہوئی ہے تو اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی تک قبضہ نہیں ہوا ہے۔ اور اگر زمین کی تحدید اور موقع مکمل ہونے کے بعد رجسٹری ہوئی ہو تو اگر چہ اس پر تعمیر وغیرہ نہ کی ہو، یہ قبضہ شمار ہوگا اور بائع اس کو فروخت کرسکتا ہے۔

قبل القبض بیع کے صحیح نہ ہونے کی دلیل حضرت حکیم بن حزام کی یہ روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تاجر آدمی ہوں میرے لئے کیا حلال اور کیا حرام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! تو نے اگر کوئی چیز خریدی تو قبضہ کرنے سے

پہلے اس کو فروخت مت کر۔"[۱]

دوسری دلیل حضرت ابن عباس کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے بیع قبل القبض سے جو منع فرمایا تھا وہ غلہ کے بارے تھا۔ میرے خیال میں یہ حکم تمام اشیاء کے متعلق ہے۔[۲]

دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "لاتبیعن شیأً حتی تقبضه" قبضے سے پہلے کسی چیز کو ہرگز فروخت مت کرو اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد "من ابتاع طعاما فلا یبعه حتی یقبضه"[۳] تو یہاں طعام کے بارے میں منصوص ہے۔ مگر حکم دوسری منقول اشیاء کا بھی یہی ہے۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے قبضہ سے پہلے پہلے خراب ہو جائے، یا ہلاک ہو جائے۔ باقی ہر شئی کا قبضہ اسی شی کے اعتبار سے ہوگا۔ چنانچہ بیع اگر کرنسی کی ہو تو ہاتھ میں لینا قبضہ ہوگا۔ اگر مبیع کپڑا یا اور کوئی سامان ہو تو جدا کرنا یا اس کے مقامات سے اٹھوانا قبضہ ہوگا۔ اگر مبیع کوئی جانور ہو تو اس کو اس کے مقام سے چلانا قبضہ شمار ہوگا اگر مبیع غیر منقولہ جائیداد ہے۔ تو بیع کے تصرف سے ہٹانا اور مشتری کیلئے کوئی رکاوٹ نہ ہونا قبضہ کہلائے گا۔ شریعت نے قبضے کو عرف و عادت کے اعتبار سے رکھا ہے۔

غیر منقول کی بیع

زمین و جائیداد کو قبل القبض فروخت کرنا جائز ہے۔ کیوں کہ زمین محل القبضہ میں ہے۔ اس میں تجدید کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے کسی شخص کے قبضے میں کوئی مغصوبہ زمین بطور ضمان کے موجود ہے اور وہ اس کو اصل مالک سے خرید لے تو تجدید قبضہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس کے پاس عاریت کے طور پر ہے یا کسی اور طور پر ہے تو خریدنے کے بعد قبضے کی تجدید ضروری ہے۔ قبل القبض بیع صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زمین ایسی چیز ہے کہ اس پر تعمیر کی جاسکتی ہے اور ہلاکت سے محفوظ ہے۔ تو خریدنے کے بعد قبضے سے پہلے ہلاک ہونے اور ضائع ہونے کا کوئی خطرہ اس کے ساتھ لاحق نہیں ہے۔ ہاں البتہ زمین کسی دریا کے کنارے میں ہو تو حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قبل القبض اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو غیر منقول کی بیع قبل القبضہ فروخت کرنا سرے سے جائز ہی نہیں ہے۔ وہ اس کو اشیاء منقولہ پر قیاس کرتے ہیں۔ فتویٰ حضرات شیخین کے قول پر ہے۔

---

[۱] [الدارالقطنی: ۱۹/۵] [۲] [مسلم: ۱۱۶/۲] [۳] [مسلم ۱۱۶/۲]

ثمن پر قبل از قبض تصرف

ثمن میں قبضہ کرنے سے پہلے تصرف کرنا جائز ہے۔

بیع میں اختیارات

بائع ومشتری کیلئے تین دن یا اس سے کم مدت کیلئے خیار الشرط لگانا جائز ہے دلیل اس کی حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں۔ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے جس کی زبان میں سست رفتاری تھی۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ میں ہمیشہ خرید وفروخت میں نقصان اٹھاتا ہوں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**اذا بايعت فقل لاخلابة ثم انت بالخيار في كل سلعة ابتعتها ثلاث ليال فان رضيت فأمسك، فان سحطت فاردد**"[1] "جب تم بیع کروتو کہہ دو "لاخلابة" کوئی فریب کاری نہیں، پھر تمہیں اختیار ہوگا ہر اس چیز میں تین دن تک جس کی تم بیع کرو۔اگر اس بیع سے تم خوش ہوتو نافذ ہونے دو، اگر خوش نہ ہوتو بیع فسخ کردو"۔یہ صحابی حبان بن منقذ ہیں۔جیسا کہ ابن اسحاق کی روایت میں ہے۔یا منقذ بن عمرو ہیں۔جیسا کہ یحییٰ بن حبان کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد فرمایا لوگو! میں نے تمہاری بیوعات میں غور کیا۔نہیں پایا میں نے تمہاری بیوعات میں کم مدت جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حبان بن منقذ کے لئے مقرر فرمایا تھا۔[2]

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین دن سے زیادہ خیار شرط نہیں ہوگا۔کیوں کہ یہ خلاف قیاس ہے۔خلاف قیاس میں نص وارد ہوتو وہ اپنے مورد پر منحصر ہوتا ہے۔خلاف قیاس اس لئے ہے کہ بیع تام ہونے کے بعد ملکیت آنی چاہئے۔

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر تین دن سے زیادہ مدت معلومہ مقرر کر دیں تو جائز ہے۔کیوں کہ خیار شرط بائع ومشتری کو غبن اور ظلم سے بچانے کیلئے مشروع ہوا ہے اور اگر وہ تین دن میں حاصل نہیں ہوتو متعاقدین کی رائے کے مطابق ہونا چاہئے۔باقی تین دن کی مدت کلی نہیں اکثری ہے۔اکثر تین دن میں اشیاء کے متعلق مکمل معلومات ہوسکتی ہیں۔یہ تین دن سے زیادہ مدت کی ضرورت کی نفی نہیں کرتا۔جیسا کہ استنجاء کے لئے تین پتھر کا استعمال ہے۔اگر تین سے صفائی نہ ہوتو تین سے زائد پتھر استعمال کئے جائیں گے۔علامہ الزیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جس کو خیارِ شرط حاصل ہوتو وہ مدت خیار میں بیع کو فسخ کردے تو کرسکتا ہے اور اس کو نافذ کرے تو وہ

---

[1] [بیہقی: ۵/۲۷۳] [2] [دار قطنی: ۷/۵۷]

بھی درست ہے، دوسرے متعاقد کی عدم موجودگی میں بھی اگر نافذ کرے تب بھی جائز ہے۔ مگر فسخ اس کی موجودگی کے بغیر جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ معاہدے کو فسخ کرنا دونوں کی موجودگی میں ہوگا۔ ایک کے فسخ کرنے سے نہیں۔ جبکہ بیع کو نافذ کرنے اور جاری رکھنے کے فیصلہ میں دونوں کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ دوسرے کے حق کا ابقاء ہے تو اس کے علم میں آنا ضروری نہیں ہے۔ یہ حضرات طرفین کا قول ہے جبکہ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دوسرے کی عدم موجودگی میں بھی بیع کی تنسیخ جائز ہے۔ اس لئے کہ خیار کی وجہ سے اس کو فسخ بیع اور جواز بیع دونوں کا حق حاصل ہے جس طرح دوسرے کی غیر موجودگی میں اجازت بیع جائز ہے۔ تو فسخ بیع بھی جائز ہونا چاہئے۔ اور اگر خیارِ شرط دونوں کے لئے ہو، پھر ایک نے بیع کو جائز دوسرے نے فسخ کر دیا تو اعتبار مقدم کا ہوگا۔ جس نے پہلے فیصلہ کیا ہو اس کا اعتبار ہوگا۔ کیوں کہ پہلے حکم ثابت ہو گیا۔ بعد والا اس کا معارض نہیں بن سکتا۔ اگر دونوں قول معاً صادر ہو جائیں تو فسخ معتبر ہوگا۔

اگر من له الخيار (جس کو اختیار ہو) مر جائے تو خیار شرط باطل ہو جائے گا۔ ان کے ورثاء کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ محض ارادہ واختیار ہے۔ مال نہیں اور اگر دونوں کیلئے خیار شرط ہو۔ ان میں سے ایک کا انتقال ہو جائے تو اس کی طرف سے بیع مکمل ہے دوسرے کو اختیار حاصل رہے گا اگر خیار شرط بائع نے لگائی ہو تو مبیع اس کی ملکیت سے نہیں نکلے گی۔ اس لئے کہ خیار کی شرط کے ساتھ بیع کرنا بیع کے حکم (ثبوت ملک للمشتری) میں منعقد نہیں ہوگی بلکہ بیع کا حکم سقوط خیار پر موقوف رہے گا۔ اگر اس حالت میں مشتری اس پر قبضہ کر بھی لے تب بھی اس میں تصرف کرنے کا حق اس کو حاصل نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ خیار کی مدت کے دوران مشتری کے ہاتھ سے وہ ہلاک ہو جائے تو متعاقدین کے درمیان طے شدہ قیمت نہیں بلکہ اس وقت کی قیمت ادا کرنا اس پر واجب ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ابھی تک بیع نافذ نہیں ہوئی۔ تو گویا اس حالت میں مبیع ویسے ہی مشتری کے ہاتھ میں ہے ایسی صورت میں ہلاک ہونے پر قیمت (ثمن) ہے طے شدہ معاوضہ نہیں ہے اور اگر مبیع بائع کے قبضے میں ہلاک ہو جائے تو مشتری پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔ البتہ مشتری کا خیار الشرط مبیع کو بائع کی ملکیت سے نکلنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ لیکن مبیع مشتری کی ملکیت میں داخل بھی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ بالاتفاق خیار شرط کی وجہ سے ثمن مشتری کی ملکیت سے خارج نہیں ہوگا اور مبیع بھی اس کی ملکیت میں داخل ہو جائے تو ایک آدمی کی ملکیت میں عوض اور معوض دونوں کا جمع ہونا لازم آتا ہے جو کہ درست نہیں ہے کیوں کہ شریعت میں ایسا کوئی اصل نہیں ہے کہ فرد واحد کی ملک میں ثمن ومبیع دونوں جمع ہو جائیں جبکہ معاوضہ میں مساوات ہونی چاہئے مبیع کا مشتری کی ملکیت میں

جانا اس کی منافی ہے۔

اگر خیار کی شرط مشتری نے لگائی ہو اور مبیع اسی کے ہاتھ سے ہلاک ہو جائے تو معاہدے میں طے شدہ عوض (ثمن) ادا کرنا اس پر لازم ہو گا۔ کیوں کہ ہلاک ہونے کی وجہ سے بیع کو فسخ کرنے کا اختیار ختم ہو گیا تو بیع تام ہو گئی اور بیع تام کی صورت میں ثمن واجب ہوتا ہے نہ کہ قیمت۔

ثمن اور قیمت میں فرق

ان میں فرق یہ ہے کہ متعاقدین کے درمیان طے شدہ عوض کو ثمن کہتے ہیں چاہے وہ شی کی اصل قیمت سے کم ہو یا زیادہ اور قیمت کہتے ہیں جو اس وقت مارکیٹ میں قیمت ہو یعنی موجودہ اصطلاح میں ''مارکیٹ ویلیو'' اگر خیار الشرط بائع ومشتری دونوں کیلئے ہو تو مبیع بائع کی ملکیت میں اور ثمن مشتری کی ملکیت میں برقرار رہیں گے۔ کسی کی ملکیت سے کوئی چیز خارج نہیں ہو گی۔

سقوط خیار الشرط

خیار الشرط تین چیزوں سے ساقط ہو گا (۱) صراحۃً زبان سے ساقط کرنے سے مثلاً کہہ دے، میں نے خیار الشرط کو ختم کر دیا، یا باطل کر دیا یا کہہ دے میں نے بیع کو جائز کر دیا وغیرہ۔ (۲) دلالۃً ساقط کرنے سے: اس کی صورت یہ ہے کہ مبیع میں ایسا تصرف کرے جیسا مالک تصرف کر سکتا ہے غیر مالک نہیں کر سکتا۔ مثلاً گھر خیار شرط پر خریدا۔ خریدنے کے بعد اس کے اندر سکونت اختیار کر لی یا کسی اور کو رہنے کیلئے دیا۔ یا کسی کے پاس گروی رکھ دیا۔ یا بھینس خریدی تھی اس کا دودھ نکال کر استعمال کرنے لگا۔ یہ تمام اعمال مالک ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور یہ اعمال بیع کو نافذ کرنے اور اختیار کو ختم کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔ (۳) خیار مدت خیار کے ختم ہونے سے ضرورۃً ساقط ہو جائے گا۔ یا من لہ الخیار کے مرنے سے ختم ہو جائے گا۔ اگر من لہ الخیار پر غشی طاری ہو گئی یا بے ہوش ہو گیا اور اتنے میں خیار الشرط کی مدت ختم ہو گئی تو صحیح یہ ہے کہ اس کا خیار ختم ہو گیا۔

خیار الرویۃ، دیکھنے کا اختیار

دیکھے بغیر خریدنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو یا اس کی جگہ بتلائی گئی ہو۔ اگر اس کی طرف اشارہ نہ ہو یا اس کا مقام نہ بتلایا گیا ہو تو بیع ہی جائز نہیں ہو گی۔ خریدنے کے بعد اس کو خیار رویت حاصل ہے۔ جب اس کو دیکھے گا تو بیع کو جائز قرار دینے یا فسخ کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ چاہے مبیع بیان کردہ صفات کے مطابق ہی کیوں نہ ہو حتیٰ کہ دیکھنے سے پہلے بیع کو نافذ

قرار بھی دے گا تب بھی خیار رویت ختم نہیں ہوگا کیوں کہ یہ اختیار شرعی ہے۔ جو وہ اپنی طرف سے ساقط نہیں کرسکتا۔ یہ خیار کسی خاص وقت کے ساتھ موقت بھی نہیں ہے۔ بلکہ دیکھنے تک برقرار رہے گا۔ خیار الشرط کے ثبوت کی دلیل حضرت مکحول کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”من اشتری شئالم یره فهو بالخیار اذا رآه، ان شاء أخذه وان شاء ترکه“[1] ”جو شخص کوئی چیز بن دیکھے خریدے تو دیکھنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا چاہے اس کو لے لے چاہے واپس کر دے۔“ یہ حدیث مرسل ہے۔ (مراسیل سے استدلال حضرات حنفیہ کے نزدیک درست اور جائز ہے) یہی روایت علامہ ابن سیرین سے بھی مروی ہے۔[2] جو چیز دیکھے بغیر فروخت کرے تو پھر اس کو خیار رویت حاصل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ شریعت نے خیار رویت مشتری کو غبن اور نقصان سے بچانے کیلئے مقرر فرمایا ہے۔ بائع کیلئے خیار رویت نہ ہونے پر حضرات صحابہ کا اجماع ہے۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ کوفہ میں حضرت عثمان کی زمین تھی۔ اس کو حضرت طلحہ بن عبید کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ حضرت عثمان سے کہا گیا، آپ نے خود کو نقصان کر دیا۔ فرمایا: میں نے اس کو دیکھا نہیں ہے لہٰذا مجھے خیار رویت حاصل ہے۔ اس طرح کسی نے حضرت طلحہ سے کہا: آپ نے نقصان اٹھایا، فرمانے لگے: مجھے خیار رویت حاصل ہے۔ کیوں میں نے اس کو ابھی تک دیکھا نہیں۔ یہ مقدمہ حضرت جبیر بن مطعم کے سامنے پیش ہوا انہوں نے صرف حضرت طلحہ کو خیار رویت کا حق دیا۔ اس فیصلے کے وقت حضرات صحابہ کی بہت بڑی جماعت موجود تھی۔ کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں فرمائی، نہ ہی حضرت عثمان نے کچھ نکیر کی۔ اس طرح اس پر اجماع ہوا۔

خیار رویت اس دیکھنے سے ساقط ہو جاتا ہے جس سے مقصود کا علم حاصل ہو جائے۔ ہر شئ کی رویت اس کے مطابق ہوگی، چنانچہ گھر کی رویت یا زمین کی رویت اس کے حد بندی اور تعمیر کو دیکھنا ہے۔ جانور اگر گوشت کھانے کی غرض سے خرید ہو تو ہاتھ لگانا، خوشبو کو سونگھنا رویت ہے۔ اگر مشتری دیکھنے سے پہلے اس پر مالکانہ تصرف کرلے، یا اس کے قبضے میں عیب دار ہو جائے یا اس کا انتقال ہو جائے تو خیار رویت ساقط ہو جائے گا۔ کیوں کہ مرنے کی صورت میں اس کے ورثاء کو خیار رویت حاصل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ محض اختیار ہے۔ جس میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ اگر مشتری نے بیع کے وقت مبیع کا کچھ حصہ دیکھ لیا اور کچھ نہیں دیکھ سکا۔ تو باقی کو دیکھنے تک اس کو خیار رویت کا حق حاصل ہوگا۔ کیوں کہ بیع کو لازم کرنے کی صورت میں ان دیکھی چیز خریدنے پر مجبور کرنا ہے جو خلاف نص ہے۔ اگر کسی چیز کا نمونہ موجود ہو تو اس کو دیکھنا مبیع کو دیکھنا شمار ہوگا۔ کیوں کہ دیکھنے سے

---

[1] [دار قطنی: ۴/۳]
[2] [دار قطنی: ۴/۳]

مقصوداس کی صفات سے باخبر ہونا ہے وہ نمونہ دیکھنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ہاں اگر مبیع نمونہ کے خلاف نکلے تو اس کو خیار حاصل رہے گا۔ کسی نے دو کپڑے ایک ہی بیع میں خرید لئے، ایک کو دیکھ سکا، دوسرے کو نہیں دیکھا، دوسرے کو دیکھنے کی صورت میں اس کو اختیار حاصل ہوگا چاہے دونوں کو واپس کردے یا دونوں کو رکھ لے، کیوں کہ کپڑوں میں تفاوت ہوتا ہے۔ جس کو نہیں دیکھا اس میں اس کو خیار رویت حاصل ہے۔ البتہ واپس کرے تو دونوں کو کرے۔ یہ اختیار نہیں ہوگا کہ ایک کو رکھ لے دوسرے کو واپس کردے۔ کیوں کہ اس صورت میں بائع کیلئے قبل تمام البیع تفرق صفقہ لازم آتا ہے جو جائز نہیں۔ کسی نے ایسی چیز کو خریدا جو کچھ زمانہ پہلے دیکھی تھی اور یہ جانتا بھی ہے کہ اس کو دیکھا ہوا ہے، اب اگر وہ شئی اس حالت میں ملے جس حالت میں اسے دیکھا تھا تو خیار رویت حاصل نہیں ہوگا اس لئے کہ اس شئی کے اوصاف کا اسے پہلے ہی علم حاصل ہے دیکھنے کی وجہ کے۔ اگر خریدتے وقت یہ معلوم نہ ہو کہ اسی چیز کو خریدنا ہے جس کو دیکھا تھا تو اس کا خیار رویت ساقط نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس کو دیکھی ہوئی حالت سے مختلف پائے تو خیار رویت برقرار رہے گا۔ کیوں کہ اس صورت میں وہ بن دیکھی چیز کی طرح ہوگئی، اگر بائع ومشتری میں اختلاف ہوجائے۔ بائع کہے اس حالت پر ہے جبکہ مشتری اس کا انکار کررہا ہو تو قول بائع کا معتبر ہوگا کیونکہ وہ پہلے معقود علیہ (مبیع) کو دیکھ چکا ہے اور تغیر کا وقوع بعد میں بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر بیع سے کافی مدت پہلے دیکھا ہو اور مبیع کو دیکھ کر تغیر محسوس ہو تو مشتری کے قول کا اعتبار کیا جائے گا۔ اس لئے کہ ظاہر اس کی موافقت کرتا ہے۔ کیوں کہ طویل مدت کی وجہ سے اشیاء میں تغیر واقع ہوجاتا ہے۔

بیع الفضولی

اپنی طرف سے کسی کیلئے خرید وفروخت کرنا اس شخص کے دیکھنے پر موقوف ہوگا جس کیلئے خرید وفروخت کی گئی ہے بشرطیکہ خریدنے والا آزاد، عاقل اور بالغ ہو اور اس میں تصرف سے مالک کو نقصان نہ ہوتا ہو۔ فضولی کے بیع کے صحیح ہونے کی دلیل حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قربانی کے جانور خریدنے کیلئے ایک دینار انہیں دیا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دینار کے عوض ایک بکری خریدی۔ پھر اس کو دو دینار کے عوض فروخت کیا۔ پھر ایک دینار کی بکری خرید کر خدمت نبوی میں مع ایک کے دینار کے پیش کی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دینار صدقہ فرمایا اور میرے لئے کاروبار میں برکت کی دعا کی۔[1]

اور حضرت عروۃ البارقی سے بھی اس طرح کی روایت مروی ہے۔ دیکھئے! یہاں حضرت

[1] [سنن دار قطنی: ۹/۳]

حکیم اور حضرت عروۃ بکری کو فروخت کرنے اور پھر دوسری بکری خریدنے میں فضولی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم نہیں تھا۔

لیکن فضولی کی بیع کو جائز قرار دینے کیلئے مبیع وثمن اور بائع ومشتری کا باقی رہنا ضروری ہے۔ چنانچہ ان شرائط کے ساتھ فضولی کی بیع کو جائز ونافذ قرار دیا تو بیع برقرار رہے گی، گویا بعد کی اجازت وکالت سابقہ ہوگی۔ کسی کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر بیچنے والا اجازت ملنے کے بعد مجیز کا وکیل شمار ہوگا اور ثمن اصل مالک کا ہوگا، اگر بائع کے ہاتھ ثمن موجود ہو۔ اور اگر ثمن بائع فضولی کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو امانت ہلاک ہونے کے حکم میں ہوگا۔ بائع فضولی اور مشتری دونوں کو مالک کی اجازت سے قبل بیع کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔ البتہ فضولی نکاح کرنے والے کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہوگا۔ کیوں کہ نکاح کی صورت میں حقوق فضولی کی طرف راجع نہیں ہوتے۔ نکاح میں یہ وکیل نہیں سفیر محض ہوتا ہے۔ اگر اصل مالک بیع کی اجازت دینے سے قبل مر جائے تو بیع فسخ ہوگی اور مشتری بائع فضولی سے اپنا ثمن واپس لے گا۔ مالک کے ورثاء کو اجازت بیع کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

خیار العیب

مطلق بیع مبیع کے بے عیب ہونے کا تقاضا کرتی ہے، بیع کا بے عیب ہونا عادۃً مرغوب عرفاً مطلوب ہونے کی وجہ سے صراحۃً شرط لگانے کے حکم میں ہے اور ہر وہ چیز تجارت میں عیب شمار ہوگی جو ثمن میں کمی کا باعث ہو۔ اور مالی نقصان ضرر وعیب ہے تجار کے ہاں یہی معروف ہے۔ مشتری کا چیز کو خریدتے یا قبضہ کرتے وقت عیب سے مطلع ہو کر خاموش ہو جانا رضا مندی شمار ہوگا، اگر چیز کے اندر عیب موجود ہو مگر خریدتے وقت معلوم نہ ہو، قبضہ سے قبل معلوم ہو جائے، تو اس کو واپس کرنے اور کل قیمت کے عوض رکھنے کا اختیار ہوگا۔ واپس کرنے میں بائع کی رضا مندی شرط نہیں ہے۔ ہاں اگر قبضہ کے بعد عیب ظاہر ہو جائے تو بائع کی رضا مندی سے یا عدالت کے فیصلے کے مطابق واپس کرے گا۔ مشتری کے ہاتھ میں آنے کے بعد مشتریٰ (خریدی ہوئی چیز) عیب دار ہو جائے پھر سابقہ عیب بھی ظاہر ہو جائے اس صورت میں مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ البتہ عیب کے بقدر اپنا ثمن بائع سے واپس لے لے، کیوں کہ مبیع کو واپس کرنے کے لئے شرط ہے کہ اس کو اسی حالت میں واپس کرے جس حالت میں قبضہ کیا تھا تا کہ بائع کو نقصان نہ ہو۔ اس طرح مشتری کو نقصان سے بچانے کیلئے عیب کے بقدر ثمن واپس لینے کی اجازت ہوگی۔ اس کی

صورت یہ ہوگی کہ مبیع کے صحیح سالم ہونے کی حالت میں قیمت لگائی جائے اور حالت عیب کی قیمت لگا کر کمی کو بائع سے وصول کرلے۔ ہاں اگر بائع اس عیب کے ساتھ اس کو واپس لینے پر رضامند ہو جائے تو کل مبیع کو واپس کردیا جائے گا۔ کیوں کہ اس صورت میں بائع نے اپنا حق ساقط کردیا۔

کپڑا خرید کر کاٹنے کے بعد عیب ظاہر ہوا، اگر مشتری عیب کو برداشت کرلے تو عیب کی بقدر ثمن بائع سے واپس لے گا اگر عیب کے ساتھ اس کو پہننے پر راضی نہ ہو تو واپس کردے اور بائع پر اس کو ماننا ضروری ہوگا۔

اگر خریدی ہوئی شئی از قبیل طعام ہو، اس کو کھالیا، یا کپڑا ہو اس کو پہن کر پرانا کردیا۔ پھر عیب معلوم ہوا تو امام صاحب کے قول کے مطابق کسی طرح بھی رجوع نہیں کرسکتا کیوں کہ مبیع کو واپس کرنا ممکن نہ رہا۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسا کہ کسی نے چیز خریدنے کے بعد اس کو فروخت کردیا۔ فروخت کے بعد عیب معلوم ہوا اب اس کمی کے سلسلے میں بائع سے رجوع نہیں کرسکتا اور حضرات صاحبین کے نزدیک استحساناً رجوع کرسکتا ہے۔ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

طعام خریدنے کے بعد اس میں سے کچھ کھالیا۔ پھر عیب معلوم ہوا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس صورت میں بھی رجوع نہیں ہوگا نہ ماکول میں، نہ ہی باقی میں۔ جبکہ حضرات صاحبین سے دو طرح کی روایت مروی ہے ایک روایت یہ ہے کہ عیب کی وجہ سے ساری قیمت واپس لی جائے گی اور مابقی کو بھی واپس کرنا ضروری نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق مابقی کو واپس کردے، اور ماکول کی قیمت بائع سے واپس لے لے۔ یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ فتویٰ اسی پر ہے۔ اگر کسی نے تربوز خریدا، یا انڈا خریدا اور توڑنے پر معلوم ہوا کہ صحیح نہیں ہے اگر وہ اتنا خراب ہے کہ بالکل کھانے کے قابل ہی نہیں تو مشتری اپنا ثمن بائع سے واپس لے گا کیوں کہ یہ مال ہی نہیں ہے۔ اگر اس حالت میں ہے کہ کچھ کھانے کے قابل ہے تو کمی کے سلسلے میں بائع سے رجوع کرے گا۔ کیوں کہ تربوز وغیرہ کاٹنے کی وجہ سے واپس کرنا ممکن نہیں ہے۔

بیع التلجئۃ : مجبوری کی بیع:

اس میں تین مسائل ہیں:

(۱) نفس بیع میں ہو (۲) مقدار ثمن میں ہو (۳) وصف ثمن میں ہو۔

پہلا مسئلہ: نفس بیع میں:

اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے سامان یا کسی اور شئی کے متعلق ظالم کے ظلم کے

خوف سے کسی شخص کو خفیہ کہتا ہے کہ میں یہ اظہار کروں گا کہ گویا یہ چیزیں آپ کے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں، مگر درحقیقت فروخت نہیں کروں گا۔ اور پھر لوگوں کے سامنے خرید وفروخت کی صورت میں ایجاب وقبول کر کے بیع کر لی۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ظاہری بیع حقیقۃً بیع شمار ہوگی۔ خفیہ شرائط کا اعتبار نہیں ہوگا۔ کیوں کہ عقد میں ان کا کوئی ذکر نہیں آیا اور حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بیع باطل ہے کیوں کہ انہوں نے عدم بیع کا قصد کیا۔ گویا وہ مذاق کر رہے ہیں۔ لہٰذا بیع منعقد ہی نہیں ہوگی۔

(۲) مقدار ثمن میں تلجئہ کی صورت:

خفیہ طور پر ثمن مقرر کر کے ظاہراً لوگوں کے سامنے بیع کرتے ہوئے کچھ اور ظاہر کریں تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع درست ہے مگر اصل ثمن خفیہ طور پر مقرر کردہ ہے۔ ظاہر ثمن نہیں۔ کیوں کہ بائع ومشتری نے مقدار زائد کا بطور ثمن قصد ہی نہیں کیا ہے۔ گویا یہ مزاح ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اعلانیہ بیع میں مقرر کردہ قیمت ثمن ہے۔ اس لئے کہ عقید بیع میں یہی مذکور ہے اور اسی سے عقد صحیح ہوگا جو خفیہ ڈیل کی ہے اس کا ذکر بیع کے وقت نہیں ہوا لہٰذا اس کا حکم بھی ساقط ہوگا۔

(۳) وصف ثمن میں تلجئہ کی صورت:

مثلاً آپس میں خفیہ طور پر سو ڈالر میں متفق ہوئے اور اعلانیہ ۱۰۰ روپے پر عقد کر لیں۔ حضرت محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قیاس کا تقاضا ہے یہ عقد باطل ہو، کیونکہ ثمن مقصود کا ذکر عقد میں ہوا ہی نہیں اور جو مذکور ہے وہ مقصود نہیں۔ تو یہ بلا ثمن بیع ہوئی، مگر استحساناً جائز قرار دیتے ہیں ۱۰۰ روپے میں۔ کیوں کہ بیع کرنے کا مقصد باطل کرنا نہیں ہے بلکہ بیع کو جائز کرنا ہے اور اعلانیہ ثمن کے بغیر بیع نہیں ہوگی گویا متبائعان نے خفیہ سے اعراض کر کے ظاہر پر عمل کیا۔

یہ مسئلہ، مسئلہ سابقہ کی طرح نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں خفیہ شرط عقد میں مذکور ہے اور صرف وصف کی زیادتی ہے۔ بیع تلجئہ میں خیار نہیں ہوگا۔ کیوں کہ بائع اور مشتری نے زوال ملک کا قصد ہی نہیں کیا ہے۔ تو عقد ان کی اجازت پر موقوف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کے تلجئہ کے دعویٰ پر جب تک گواہ پیش نہیں کرے گا اس وقت تک اس کی بات نہیں مانی جائے گی کیوں کہ وہ انفساخ عقد کا مدعی ہے۔ اگر گواہ نہ ہو تو دوسرے سے حلف لیا جائے گا اور اس کا قول

مانا جائے گا۔

بیع فاسد، بیع باطل

بیع کی چار قسمیں ہیں (۱) بیع جائز (۲) موقوف (۳) فاسد (۴) باطل۔ باطل اور فاسد میں صرف یہ فرق ہے کہ ہر بیع باطل بیع فاسد ہے اور ہر فاسد باطل نہیں۔ چنانچہ، مردار یا آزاد شخص وغیرہ کا بطور مبیع یا ثمن بیع کرنا بیع باطل ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں بیع کا ایک رکن (مال متقوم ہونا) معدوم ہے مذکورہ اشیاء کسی کے نزدیک بھی مال نہیں ہیں۔ شراب یا خنزیر کو بطور مبیع یا ثمن مقرر کرنا بیع فاسد ہے۔ کیوں کہ یہ چیزیں بعض لوگوں کے نزدیک مال ہے۔ چنانچہ ان کو بطور ثمن مقرر کیا جائے تو بیع فاسد اور بطور مبیع مقرر کیا جائے تو بیع باطل ہے۔ اسی طرح شراب وخنزیر کی بیع نقدی کے عوض ہو تو باطل اور سامان کے عوض ہو تو فاسد ہوگی۔ بیع باطل ملکیت کا فائدہ نہیں دیتی۔ کیونکہ وہ سرے سے عوض سے خالی ہے اور وہ مشتری کے ہاتھ میں امانت ہے۔ اگر صاحب ید کے ہاں ہلاک ہو جائے تو بغیر شئی کے ہلاک ہوگی۔ بائع کو کچھ بھی نہیں ملے گا کیوں کہ جب اس نے غیر مال کے بدلے میں فروخت کیا اور مشتری کو قبضہ کا حکم دیدیا تو گویا وہ بغیر مالی بدل پر راضی ہوگیا۔ تو مشتری مودع کی طرح ضامن نہیں ہوگا۔ یہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ جبکہ حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک ثمن نہیں بلکہ قیمت دینا پڑے گی۔ کیوں کہ بائع مفت بلاعوض مشتری کے قبضے میں دینے پر راضی نہیں تھا۔

مردار کے مال نہ ہونے کی دلیل:

فرمان الٰہی ہے:

"حرّمت علیکم المیتة والدّم ولحم الخنزیر" [المائدہ:۳]

"حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور لہو اور گوشت سؤر کا"

دوسری دلیل حضرت ابن عباس کی وہ روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں، جب حضرت عمر کو معلوم ہوا کہ فلاں شخص شراب پیتا ہے تو فرمایا: اللہ فلاں شخص پر لعنت کرے۔ کیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے واقف نہیں؟ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"قاتل اللہ الیھود حرّمت علیھم الشحوم فجملوھا فباعوھا." [1]

---

[1] [بخاری:۴۳۶]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قاتل اللہ یهودًا حرّمت علیهم الشحوم فباعوها وأكلوا اثما نها"[1]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "قاتل" کا معنی لَعَنَ بتایا ہے۔

اور شراب کی تجارت کی حرمت کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے "انما الخمر والمیسر" سے لیکر "فاجتنبوه" تک [المائدہ:۹۰]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب سورۃ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کو بتایا کہ شراب کی تجارت حرام کردی گئی۔[2]

اور آزاد شخص کو فروخت کرنے کی حرمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے۔ "ثلاثة انا خصمهم يوم القيامة رجل اعطى بی ثمّ غدر و رجل باع حرّا فأكل ثمنه ورجل استاجر أجيرا فاستوفي منه ولم يعطه اجره"[3] "قیامت کے دن میں تین آدمیوں سے مخاصمت کروں گا۔ایک وہ شخص جسے میری وجہ سے دیا گیا اور پھر اس نے اس میں دھوکہ کیا دوسرا وہ شخص جو کسی آزاد شخص کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھا جائے ،اور تیسرا وہ شخص کسی سے اجرت پر کام لے اور اس کی اجرت اس کو نہ دے۔"

اور خنزیر کے کاروبار کی حرمت کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے "ان اللہ و رسوله حرّم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام"[4] "اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے بت، خنزیر، مردار اور شراب فروشی کو حرام قرار دیا ہے۔"

کسی نے ایک عقد میں آزاد شخص اور سامان کو یا حلال کردہ بکری اور مردار بکری کو فروخت کیا تو دونوں میں بیع باطل ہے۔اگر دونوں کیلئے ایک ہی قیمت مقرر کر دی تب تو سب کے نزدیک بالاتفاق بیع باطل ہے۔اگر ہر ایک کیلئے جدا جدا ثمن ذکر کر دیا تب بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیع باطل ہے کیوں کہ صفقہ صحیح اور فاسد پر مشتمل ہے اور فساد نفس بیع میں واقع ہے تو تمام میں سرایت کر جائے گا۔ جیسا کہ دونوں کیلئے ایک ثمن مقرر کرنے میں ہے۔ اور حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد کہتے ہیں: سامان اور حلال و مذبوح بکری میں بیع صحیح جب کہ آزاد اور مردار میں باطل ہوگی، لیکن فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے۔

---

[1] [بخاری:۴۳۷] [2] [بخاری:۴۳۶]

[3] [بخاری:۴۳۶] [4] [بخاری:۴۳۸]

بیوع فاسدہ کی مثالیں

۱۔ سمندر میں موجود مچھلیوں اور ہوا میں اڑنے والے پرندوں کی بیع فاسد ہے۔ کیوں کہ یہ ملکیت اور قدرت میں نہیں ہیں۔ اگر ایک تالاب میں موجود مچھلیوں کی بیع کرے اور اس نے خود ان کو وہاں جمع کیا ہے اور شکار کئے بغیر مشتری کے حوالے کرسکتا ہے تو بیع جائز ہے کیوں کہ یہ اس کی ملک ہے اور آسانی سے مشتری کے حوالہ کرسکتا ہے اگر ایسا نہیں یعنی خود جمع نہیں کیا یا شکار کئے بغیر حوالہ نہیں کرسکتا تو حوالہ کرنے پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی ورنہ مشتری کو خیار رویت حاصل ہوگا۔

۲۔ ہوا میں موجود پرندوں کی بیع مملوک نہ ہونے کیوجہ سے فاسد ہے اگرچہ اس نے اپنے ہاتھ سے ہوا میں کیوں نہ چھوڑا ہو، اگر ایسے پرندے کی بیع کرے جو سدھایا ہوا ہے اور خود گھر آتا جاتا ہے اس کے پکڑنے پر بلا تکلف قادر ہے، تو جائز ہے ورنہ نہیں۔

۳۔ حمل کی بیع فاسد ہے، یعنی جانور یا باندی کے پیٹ کے حمل کو فروخت کرنا بیع فاسد ہے، دلیل حضرت ابن عمر کا یہ قول ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حمل کے بیع سے منع فرمایا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اس کا معمول تھا۔[۱]

۴۔ حمل کو مستثنیٰ کر کے صرف ماں کو فروخت کرنا بھی بیع فاسد ہے۔ کیوں کہ معلوم نہیں ہے آیا واقعۃً حمل ہے بھی یا نہیں۔

۵۔ تھن میں موجود دودھ کی بیع بھی فاسد ہے۔ اس لئے کہ تھن کا بھر جانا بعض دفعہ پھولنے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے اور کبھی دودھ کی کثرت کی وجہ سے بھی۔ اس صورت میں دھوکے کا خطرہ ہے اس لئے یہ بیع فاسد ہے۔ اگر بائع بیع کے بعد دودھ نکال کر حوالہ بھی کردے تب بھی صحیح نہیں ہوگی، کیوں کہ بیع فاسد ہونے کے بعد صحیح نہیں ہوگی۔

۶۔ جانور کے تن پر موجود اون کی بیع فاسد ہے اس صورت میں اون کاٹنے کے مقام میں اختلاف واقع ہونے اور جھگڑے کا خطرہ موجود ہے۔ بیع فاسد ہونے کے بعد اگر بائع اون اتار کر مشتری کے حوالہ کردے تب بھی بیع صحیح نہیں ہوگی۔

دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منع کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھل کو کھانے کے قابل ہونے سے قبل، جانور کی پیٹھ پر اون کو اور تھن میں موجود دودھ کی بیع کو منع فرمایا ہے۔[۲]

---

۱ [ابوداؤد: ۳/۲۵۰] ۲ [معجم الطبرانی: ۱۱/۲۶۷]

۷۔ اس شرط پر بیع کرنا کہ جال کو دریا میں پھینک دیا جائے گا اگر اس میں مچھلی آجائے تو اتنی رقم دو گے۔ تو یہ بیع بھی بیع فاسد ہے کیوں کہ یہ مجہول ہے اور اس میں دھوکہ میں پڑنے کا بھی خطرہ ہے۔ اس لئے کہ معلوم نہیں کہ جال میں کچھ پھنستا بھی ہے یا نہیں۔ دلیل اس کی حضرت ابوسعید الخدری کی یہ روایت بھی ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے شکاری کے جال پھینکنے کی بیع سے منع فرمایا[۱]

۸۔ درخت پر لگی کھجوروں کی اندازاً مقدار مقرر کر کے اسی مقدار میں خشک کھجوروں کو فروخت کرنا بھی بیع فاسد کے زمرے میں آتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ''مزابنہ'' کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ زبن کا معنی مدافعت ہے۔ اس بیع کو مزابنہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے نزاع اور مدافعت تک بات پہنچ جاتی ہے۔ (درختوں پر لگی کھجوروں کو رطب اور کٹی ہوئی اور خشک کھجوروں کو تمر کہتے ہیں) کیوں کہ تعداد کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ربا (سود) کا شبہ ہوتا ہے۔ ربا کے باب میں شبہ بھی ربا کے حکم میں ہوتا ہے۔

اس طرح خوشوں میں موجود گندم وغیرہ کو اندازاً اسی مقدار میں خشک گندم کے عوض فروخت کرنا بھی تفاضل کے شبہ کی بنا پر ربا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے۔[۲]

اسی طرح روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے مخابرہ سے منع فرمایا: مخابرہ ایک تہائی یا چوتھائی یا نصف پیداوار پر مزارعت کرنا مخابرہ ہے۔[۳]

۹۔ دو یا اس سے زیادہ کپڑوں میں ایک کپڑے کو فروخت کرنا بھی بیع فاسد میں داخل ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں بیع مجہول ہے۔

اسی طرح اونٹوں میں ایک اونٹ کو غیر متعین طور پر فروخت کرنا بھی مجہول ہونے کی وجہ سے فاسد ہے۔ ہاں یہ کہہ کر فروخت کیا جائے کہ مشتری اپنے اختیار سے جس کو بھی لے تو لے سکتا ہے۔ تو استحساناً یہ بیع جائز ہے۔

۱۰۔ گھر کو اس شرط پر فروخت کرنا کہ چھ مہینے یا کچھ مدت بائع اس میں رہے گا۔ یہ بیع بھی بیع فاسد ہے۔ کیوں کہ سکنی کسی عوض کے بدلے ہو تو اجارہ اگر بلا عوض ہو تو اعارہ ہے۔ حضور ﷺ نے ایک صفقہ کے تحت دو صفقوں کو شامل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع داخل کرنے سے منع فرمایا

---

۱ [ابن ماجہ: ۱۵۹/۲] ۲ [بخاری: ۴۲۹] ۳ [مسند امام ابوحنیفہ للقاری: ۱۷۳]

ہے۔ [1]

اس صورت میں بیع کے فاسد ہونے کی دوسری وجہ ہے کہ اس میں ایسی شرط لگائی گئی جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا۔ اس میں متعاقدین کے لئے فائدہ ہے۔

۱۱۔ کسی چیز کوفروخت کرتے وقت یہ کہہ کر بیع کرنا کہ قیمت فی الحال ادا کرو گےتو (مثلاً) ۱۰۰ روپے اور اتنی مدت بعد ادا کرو گے تو ۲۰۰ روپے ہے۔ یہ بھی فاسد ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں بائع کونہیں معلوم کہ مشتری کس ثمن کوقول کرے گا۔ تو ثمن کے مجہول ہونے کی بنا پر یہ بیع بھی فاسد ہے۔

۱۲۔ مثلاً کسی کپڑے کے دکاندار سے اس شرط پر کپڑا خریدا کہ بائع اس کوسی کردے گا یہ بھی بیع فاسد ہے۔ ایک بیع میں دوسرا کام شامل کیا گیا ہے اور ایسی شرط لگائی گئی ہے جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا۔

۱۳۔ کسی دکاندار سے اس شرط پر سامان خریدنا کہ وہ اس کو اس کے گھر تک پہنچائے گا، یہ بھی بیع فاسد میں داخل ہے اس لئے کہ مشتری نے ثمن کو سامان اور عمل کیلئے عوض بنا دیا۔ یہ صفقتین فی صفقہ ہوگیا۔ کیونکہ ثمن کا جو حصہ سامان کا عوض ہے وہ بیع ہے اور جو حصہ گھر پہنچانے کا عوض ہے وہ اجارہ ہے۔ لیکن یہ مسئلہ اور اس سے پہلے والا مسئلہ تعامل الناس کی وجہ سے جائز بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۴۔ کسی نے سیبوں کی ایک پیٹی کو مع پیٹی کے تول دیا مثلاً ۱۰ کلو وزن تھا، پھر اس طرح دس پیٹیاں فروخت کردیں اور پیٹیوں کا وزن اندازاً دو کلو کم کر دیا۔ تو یہ بیع فاسد ہے کیوں کہ ایک بیع میں دو بیع سیبوں کی بیع میں لکڑی پیٹی کے بیع کو شامل کر دیا۔ لیکن بعد میں علیحدہ بیع میں پیٹیوں کی جدا قیمت لگا دے تو بیع فاسد نہیں ہوگی۔

بیع میں شرط لگانے کا حکم

بیع مشروط کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ بیع اور شرط دونوں جائز ہوں۔ یہ ہر وہ شرط ہے جس کا عقد تقاضا کرتا ہو اور عقد بیع کے موافق ہو۔ جیسے کپڑا اس شرط پر خریدا کہ اس کو پہنے گا۔ یا گاڑی یا گھوڑا وغیرہ سواری کرنے کی شرط پر خریدا۔

۲۔ بیع بھی فاسد اور شرط بھی فاسد: بیع میں ہر وہ شرط لگانا جس کا عقد تقاضا نہ کرتا ہو اور

[1] [ترمذی: ۱/ ۳۵]

متعاقدین میں سے کسی ایک کی منفعت اس کے ساتھ وابستہ ہو۔ اس کی مثالیں سابق میں بیوع فاسدہ میں گزر چکی ہیں۔

۳۔ بیع جائز شرط باطل: یہ وہ شرطیں ہیں جن کا عقد تقاضا نہ کرتا ہو، اور متعاقدین میں سے کسی کی منفعت اس کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ یا غیر متعاقدین کی منفعت وابستہ ہو۔ جیسے کہ بیع میں یہ شرط لگانا کہ مشتری آگے اس کو فروخت نہیں کرے گا۔ یا کسی کو بطور ہبہ کے نہیں دے گا، یا کپڑا فروخت کر کے کہہ دیا کہ مشتری اس کو نہیں پہنے گا۔ یا کھانا بیچ کر شرط لگائی کہ مشتری اس کو نہ خود کھائے گا نہ کسی اور کو کھلائے گا۔ اس طریقہ اور صورت میں بیع جائز اور شرط باطل ہوگی۔ کیوں کہ یہ بے فائدہ شرط ہے۔ اس لئے باطل ہوگی۔ بیع فاسد میں مشتری مبیع پر اور بائع ثمن پر قبضہ کرلے تو مشتری مبیع کا مالک بن جائے گا۔ مشتری نے مبیع پر قبضہ کرلیا اور بائع نے ثمن پر قبضہ نہیں کیا ہے تب بھی مشتری مبیع کا مالک ہو جائے گا اور مبیع اس کے ہاتھ سے ہلاک ہونے کی صورت میں مشتری ثمن کا نہیں قیمت کا ضامن ہوگا۔ اور قیمت کے تعین میں بائع کے قول کا اعتبار ہوگا۔

بیع فاسد میں بائع اور مشتری دونوں کو اختیار فسخ قبل القبض اور بعد القبض دونوں جانبوں میں حاصل رہے گا بشرطیکہ مبیع بحالتہ موجود ہو، اگر مشتری مبیع کو فروخت کرے تو اس کی بیع نافذ ہو جائے گی کیوں کہ یہ اس کی ملکیت ہے۔ البتہ غیر کا حق اس کے ساتھ متعلق ہونے کی وجہ سے فسخ کا اختیار ختم ہو جائے گا۔

بیوعات ممنوعہ

(۱) بیع النجش:

کسی کو خرید کی ترغیب دینے کیلئے مقررہ قیمت سے بہت زیادہ قیمت دیکر چیز خریدنے کی خواہش ظاہر کرنا نجش کہلاتا ہے یہ جائز نہیں ہے۔ حضرت ابو اوفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے نجش کرنے والا سود خور اور خیانت کار ہے۔ نجش دھوکہ اور حرام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "الخدیعة فی النار و من عمل عملاً لیس علیه أمرنا فهو رد" "دھوکہ باز جہنمی ہے، جو ہمارے دین میں غیر موجود عمل کرے گا وہ قابل رد ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجش سے منع فرمایا ہے۔[1]

[1] [بخاری: ۴۲۳]

(۲) مسلمان کے سودے پر سودا کرنا:

یہ بھی ناجائز ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لایسم المسلم علی سوم أخیه"[۱] "مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے۔"

یعنی ایک شخص نے سامان یا کوئی اور چیز کسی سے خریدنے کیلئے بات چیت کی اور دونوں مطمئن ہوگئے اتنے میں ایک اور شخص آکر بائع کو اس قیمت سے زیادہ قیمت پیش کر کے خرید لے جو پہلے ان دونوں کے درمیان طے پائی تھی، اس کو سوم علی السوم کہتے ہیں، یہ حدیث کی رو سے ناجائز ہے۔

اگر پہلے والے شخص کا دل قیمت پر مطمئن نہ ہو اور لینے کیلئے تیار نہ ہو تو تیسرا شخص خرید لے، یہ جائز ہے۔اس کا لوگوں میں عام معمول ہے۔

(۳) تلقی جلب:

بیرون شہر سے آنے والے سامان یا اشیاء خورد ونوش کو شہر پہنچنے سے روک کر خود شہر سے باہر جا کر لانے والوں سے خرید کر مہنگے داموں فروخت کرنا تلقی جلب کہلاتا ہے جو شریعت کی رو سے ناجائز وحرام ہے۔کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا: ارشاد گرامی ہے، "لا یتلقی الرکبان ببیع ولا یبیع بعضکم علی بعض ولا تنا جشوا ولا یبیع حاضر لباد." الحدیث[۲] "پیش قدمی کر کے قافلہ سے چیز نہ خریدو! ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو اور نہ حاضر بادی کیلئے خریداری کرے۔

شہر میں لاکر اگر مناسب قیمت میں فروخت کرے یا اس سے اہل شہر کو کوئی نقصان نہ ہو تو شہر سے باہر جا کر خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۴) جمعہ کی اذان کے وقت بیع کرنا:

یعنی جمعہ کی پہلی اذان کے بعد خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے۔دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

"اذا نودی للصلوة من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر اللّٰہ وذروا البیع" [الجمعہ:۹]

---

[۱] [بخاری:۲/۱۰۳۳] [۲] [بخاری:۳/۱۱۵۵]

''جمعہ کے دن جب نماز کیلئے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد کیلئے بھاگو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔''

اس وقت بیع کرنے سے بیع نافذ ہو جائے گی مگر یہ عمل مکروہ تحریمی ہوگا۔ مشتری کیلئے قبل القبض ملکیت ثابت ہو جائے گی۔

(۵) مال مسروق کی بیع:

اگر مشتری کو معلوم ہو کہ بیع مال مسروق (چوری کا مال) ہے تو اس کے لئے خریدنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں ظالم کی مدد کرنا ہے۔

(۶) زبردستی کی بیع:

اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کوئی چیز لیکر بندرگاہ پہنچائے اور وہ اس سامان کو رکھنے کیلئے مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے سامان کو خریدنا درست نہیں ہے۔

(۷) رخصت استقدام کی بیع:

یعنی ایک ملک کا ایک شخص اپنی کمپنیکیلئے بیرون ملک سے کاریگر بلوانے کا اجازت نامہ اپنی حکومت سے حاصل کرلے۔ اس اجازت نامہ کو رخصت استقدام کہتے ہیں اس سے خود فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ مگر اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ مال نہیں ہے۔ لہٰذا بیع درست نہیں ہے۔

(۸) بیع العینہ:

ایک چیز کسی کے ہاتھ ثمن موَجل کے عوض فروخت کر کے مبیع کو مشتری کے حوالہ کرنے سے پہلے اس کو مشتری سے سابقہ ثمن سے کم قیمت پر خود خریدنا بیع العینہ کہلاتا ہے۔ یہ بھی حدیث کی رو سے جائز نہیں ہے۔

اس سے اصل مقصود ربا کی صورت سے بچنے کیلئے شرعی حیلہ تلاش کرنا ہے۔ مثلاً ایک شخص دوسرے سے ایک لاکھ روپے قرض طلب کر رہا ہے اور دوسرا بلاعوض اس کو دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔ عوض لینے کی صورت میں ربا بن رہا ہے تو اس سے بچنے کیلئے یہ حیلہ کرلیا کہ قرض طلب کرنے والے سے کہا تم فلاں چیز مجھ سے ایک ہزار روپے کے عوض خرید لو اور قیمت بعد میں مجھے ادا کردو،

یہ کہہ کر اس کے ہاتھ وہ چیز فروخت کردی۔ قبضہ کرنے کے بعد پھر اس سے کہا کہ تم وہ چیز میرے ہاتھ میں نوسونقد کے عوض فروخت کردو، پھر نوسوروپے دیکر وہ چیز واپس لیتا ہے وہ اور قرض طلب کرنے والا ایک ہزارروپے اس کو ادا کرے گا۔ اس طرح سود بھی نہ ہوا اور نوسو پر ایک سوروپے بھی کما لئے۔ شریعت اسی طرح کے حیلے کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"اذا تبایعتم بالعینة واخذ تم أذناب البقر و رضیتم بالزرع و ترکتم الجهاد سلّط اللّٰه علیکم ذلًالا ینزعه حتی ترجعوا الیٰ دینکم"[1]

اِقالہ

اقالہ کا لغوی معنی اٹھانا ہے جب کہ شرعی معنی ہے رفع العقد، عقد کو ختم کرنا۔ بیع میں اقالہ جائز ہے۔ دلیل یہ ارشادنبوی ہے: "من اقال مسلمًا أقاله اللّٰه عثرته"[2] "جو شخص کسی مسلمان کے ساتھ اقالہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی لغزشوں کو معاف فرمادے گا۔"

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اقالہ دولفظوں سے صحیح ہوگا۔ کم از کم ایک یغہ ماضی ہونا ضروری ہے۔ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں الفاظ ماضی کے صیغے سے تعبیر کرنا ضروری ہے۔

ثمن میں کمی بیشی کی شرط باطل ہے اگر مبیع میں کوئی عیب نہیں آیا تو۔ ہاں اگر مبیع عیب دار ہوگئی ہو تو بقدر عیب ثمن میں کمی کی جاسکتی ہے۔ ثمن میں زیادتی جائز نہیں ہے۔ ثمن کا ہلاک ہونا اقالہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ کیوں کہ ثمن عقد سے متعین نہیں ہوتا۔ البتہ ہلاک مبیع اقالہ سے مانع ہے۔ اس لئے کہ محل بیع فسخ مبیع ہے اور وہ ہے نہیں۔ پھر اقالہ کس چیز کا ہوگا؟ اگر مبیع کا کچھ حصہ ہلاک ہوگیا تو باقی میں اقالہ جائز ہے۔ کیوں کہ اس میں بیع موجود ہے۔ اگر بیع نقد کے علاوہ سامان کی سامان کے بدلے ہوئی ہو تو ایک کی ہلاکت سے اقالہ باطل نہیں ہوگا کیوں کہ ان میں سے ہر ایک بیع بھی ہے اور ثمن بھی تو من وجہ بیع باقی ہے۔ لہٰذا اقالہ باطل نہیں ہوگا۔

اگر بائع اور مشتری آپس کی رضا مندی سے بیع پر قبضہ سے قبل اقالہ کرلیں تو تینوں اماموں کے نزدیک یہ فسخ بیع شمار ہوگا اور اگر مشتری کے قبضہ کرنے کے بعد اقالہ کریں تب بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فسخ ہے الا یہ کہ مبیع میں کوئی اضافہ وتصرف ہوا ہو۔ تصرف کی وجہ سے فسخ ممکن نہیں تو اقالہ بھی درست نہیں ہوگا یعنی اس صورت میں اقالہ فسخ نہیں بلکہ بیع جدید ہوگا۔

---

[1] [ابوداؤد: ۳/۲۷۴] [2] [ابوداؤد: ۳/۲۷۴]

بیع مرابحہ وبیع تولیہ

بیع کی دو قسمیں ہیں: ایک عام بیع جس کا تذکرہ سابق میں ہوا۔ ایک بیع ضمان۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) مرابحہ (۲) مواضعہ (۳) تولیہ

بیع مرابحہ:

یہ ہے کہ بائع مشتری کو بتائے کہ یہ چیز مجھے اتنے کی پڑی ہے اور اس پر اتنا منافع لیتا ہوں۔

(۲) مواضعہ:

یہ ہے کہ بائع اپنے اصل رأس المال سے بھی کم کر کے فروخت کرے اور مشتری کو بتا دے۔

(۳) تولیہ:

تولیہ کا لغوی معنی ہے کسی کو ولی بنانا اور شرعی معنی یہ ہے کہ عقد اول میں جتنی قیمت کے عوض خریدا ہے بغیر کمی بیشی کے اسی قیمت پر مشتری کو بتا کر فروخت کرنا بیع تولیہ میں مشتری بائع پر اعتماد کرتا ہے اور بائع پر بھی لازم ہے کہ وہ دھوکہ کر کے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے۔ جھوٹ بول کر دھوکہ نہ دے۔ اگر بیع تولیہ کے بعد بائع کی خیانت ظاہر ہو جائے تو مشتری کو واپس کرنے اور نہ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ تولیہ شرط کے ساتھ مشروع ہے۔ حضور ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر آج تک اس پر لوگوں کا تعامل چلا آرہا ہے۔ روایت میں آتا ہے جب حضور اقدس ﷺ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا تو حضرت ابوبکر صدیق سے فرمایا: مجھے مکہ چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا صحابہ کو بھی حکم دیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میری ان دو سواریوں میں سے ایک سواری لے لیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بالثمن [1] یعنی جتنے کی تم نے خریدی ہے اتنا ثمن دیکر خریدوں گا۔

لوگوں کو بیع تولیہ کی ضرورت بھی ہے اس لئے کہ بعض لوگ صحیح خرید وفروخت نہیں کر سکتے ہیں وہ دوسروں کو جن پر اعتماد ہو کہہ سکیں گے کہ فلاں چیز قیمت خرید پر ہمیں دیدو۔ اس کی بنیاد

[1] [بخاری: ۵/۷۵]

امانت پر ہے۔ بیع تولیہ میں خیانت ظاہر ہو تو بقیہ ثمن کا بائع سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اسی قیمت پر نہ دی جس پر خریدی تھی تو بیع تولیہ نہیں رہے گی۔ بیع مرابحہ میں اگر غلط بیانی ظاہر ہو جائے تب بھی مشتری کو جمیع ثمن کے بدلے خریدنے یا واپس کرنے کا اختیار ہوگا۔ اگر واپس کرنے سے قبل مبیع ہلاک ہو جائے یا ایسی صورت پیش آجائے جس کی وجہ سے مبیع واپس نہیں کی جا سکتی تو جمیع ثمن کے عوض قبول کر لازم ہوگا۔ البتہ ان تمام صورت میں رأس المال کے ساتھ مبیع پر آمدہ تمام اخراجات کو شامل کر کے کہے گا: یہ چیز مجھے اتنے کی پڑی ہے، یہ نہیں کہے گا اتنے کی خریدی ہے۔

ربا

ربا کا لغوی معنی مطلق زیادتی اور شرعی معنی خاص صفت کے ساتھ فاسد عقد، چاہے زیادتی ہو یا نہ ہو، چنانچہ نقدی نقدی کے برابر ادھار فروخت کرنا ربا ہے، حالانکہ اس میں زیادتی نہیں ہوتی۔

ربا (سود) کتاب وسنت کے رو سے حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: "وحرّم الربو" [البقرہ: ۲۷] "حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو" دوسری جگہ ارشاد ہے "لاتاکلوا الربٰوٓا" "سود مت کھاؤ۔"

اور حدیث سے بھی سود کی حرمت ثابت ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ سونے کو سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے عوض، گندم کو گندم کے بدلے، جو کو جو کے بدلے، کھجور کو کھجور کے عوض اور نمک کو نمک کے بدلے مت فروخت کرو مگر برابر سرابر اور دست بدست، جو زیادہ دے یا لے اس نے سودی معاملہ کیا۔[1]

علمائے امت کے اجماع نے ان میں حرمت کی علت کو دوسری چیزوں تک متعدی کیا ہے۔ چنانچہ حضرات حنفیہ نے اشیاء مذکورہ کے اندر سبب ربا، جنس اور قدر (کیل یا وزن) کو قرار دیا ہے۔ دلیل ارشاد نبوی "الذهب بالذهب و زنا بوزن" (سونا سونے کے بدلے برابر سرابر) ہے۔ دوسرا ارشاد "لا تبیعوا الذهب بالذهب الا وزنا بوزن" (سونے کو سونے کے بدلے نہ بیچو مگر برابر سرابر)[2]

تیسری دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ فرمان ہے (جو قبیلہ بنی عدی کے ایک شخص کو فرمایا تھا جو خیبر کا عامل تھا جب اس نے اعلیٰ قسم کی کھجور خدمت میں پیش کی) "أكل تمر خيبر هكذا؟" کیا خیبر کی ہر کھجور اس طرح ہوتی ہے؟ عرض کیا نہیں یا رسول اللہ! ہم دو صاع ردی کھجور دیکر ایک صاع اعلیٰ کھجور خریدتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لاتفعلوا ولكن مثلاً بمثل"[3] ایسا نہ

[1] [مسلم: ۲/۱۵۱۰] [2] [مسلم: ۲/۱۲۱۱] [3] [مسلم: ۲/۱۲۱۵]

کرو، بلکہ برابر سرابر خریدا کرو۔

تو ثابت ہوا کہ علت حرمت وزن اور کیل مع الجنس ہے، کیل اور وزن سے مماثلت صوری اور جنس کے اتحاد سے مماثلت معنوی ہوتی ہے۔ وجود ربا میں یہ اصل ہے۔ اسی اصل پر ربا کے بہت سارے مسائل متفرع ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ آج کل کے کاروبار میں لوگوں کا تعامل سونے چاندی کو ثمن بنانے کا نہیں رہا۔ ان کی جگہ کاغذی سکے استعمال ہونے لگے ہیں۔ یہ کاغذی سکے اگرچہ دین کی رسیدیں ہیں مگر ان پر سونا اور چاندی کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

لہٰذا ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کاغذی سکوں کا حکم زکوٰۃ کے بارے میں سونے چاندی کی طرح ہے، کیوں کہ انہیں ثمن کے طور پر استعمال کرنا معمول بہ ہوگیا ہے کیوں کہ مالک انہیں کسی بھی وقت اپنی ضرورت میں بطور ثمن استعمال کرسکتا ہے۔ جس طرح سونے چاندی میں ہوتا ہے۔ اسی لئے کاغذی سکوں میں تفاضل کی صورت میں سود ہوگا۔ لہٰذا ان کی بیع میں برابری اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے۔ بشرطیکہ ایک ملک کے سکے ہوں۔ اگر مختلف ملکوں کے سکے ہوں تو تفاضل جائز ہوگا مگر ہاتھ در ہاتھ ہونا یہاں بھی ضروری ہے۔

ثابت ہوا کے ربا کی علت جنس وقدر (کیل وزن) ہے۔ جب کسی جگہ جنس مع الوزن، یا جنس مع الکیل پائے جائیں تو تفاضل (زیادتی) اور نسیہ (ادھار) حرام ہوں گے، اگر جنس وقدر دونوں معدوم ہوں تو تفاضل اور نسیہ دونوں جائز ہوں گے، حرمت کی علت کی عدم موجودگی کی وجہ سے چنانچہ جنس بھی مختلف ہو، قدر بھی مختلف ہو، تو زیادتی بھی جائز، مبیع وثمن پر قبضہ میں تاخیر بھی جائز بوجہ فرمان الٰہی ''وأحلّ اللّٰہ البیع'' ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حلال کردیا'' [البقرہ: ۲۷۵] اس کی صورت یہ ہے: مثلا ایک شخص نے کپڑے کے عوض گندم فروخت کی۔ یا چاول کے بعوض انڈے لئے۔ تو تفاضل وتاخیر دونوں جائز۔ اگر جنس وقدر میں سے ایک پایا جائے اور ایک نہ ہو تو زیادتی جائز ہوگی مگر مبیع وثمن پر قبضہ میں تاخیر جائز نہیں ہوگی۔ مثلاً گندم کے عوض جو خریدی یا چاندی کے بدلہ سونے کی بیع کی۔ اس صورت میں نسیہ کے حرام ہونے کی وجہ حضور ﷺ کی ممانعت ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے چاندی کے بدلے سونے کے بیع میں دین سے منع فرمایا ہے۔[1]

جن چیزوں میں ربا پایا جائے تو ان میں اعلیٰ کو ادنیٰ کے عوض مثلاً بمثل (برابر سرابر)

---

1. [مسلم ۲/۱۲۱۳]

وزن یا کیل کے اعتبار سے بیچنا جائز ہے۔ جودت (اعلیٰ ہونا) کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت بلال نے برنی کھجور خدمت نبوی میں پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: یہ کہاں سے لائے ہو؟ عرض کیا: میرے پاس کچھ ردی کھجوریں تھیں۔ میں نے ان میں سے دو صاع دیکر ایک صاع اعلیٰ کھجور آپ ؐ کیلئے خریدی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”هذا عين الربا لا تفعل ولكن اذا اردت ان تشترى التمر فبعه ببيع آخر ثم اشتر به“[1]: ”اوہ! یہ تو عین سود ہے ایسا نہ کرو، بلکہ اگر ایسا ارادہ ہو تو ان کو فروخت کر کے، ان کی قیمت کے عوض دوسری کھجوریں خریدو۔“

تنبیہ:

ہر وہ چیز جس کے کیلی ہونے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد موجود ہے وہ کیلی ہی رہے گا۔ اگرچہ لوگوں کا تعامل اس میں وزن کا ہوگیا ہو اور جس کو آپ نے وزنی قرار دیا ہے وہ وزنی ہی رہے گی اگرچہ لوگوں کا تعامل اس میں کیل کا ہوگیا ہو، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اس معاملے میں عرف اور عادت الناس کا اعتبار کرتے ہیں۔ گندم، جو، کھجور اور نمک وغیرہ کے متعلق آپ کا ارشاد کیلی ہونے کا ہے اور سونے چاندی کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وزنی ہونا بتایا ہے۔

چنانچہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گندم یا جو یا تمر کو بجنسہ کیلاً فروخت کرنا جائز نہ ہوگا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہوگا۔

اور جس چیز کے کیلی یا وزنی ہونے کے متعلق آپ کا کوئی ارشاد موجود نہ ہو وہ بالاتفاق عادات وعرف کے مطابق ہوگی جو عرف میں کیلی ہے وہ کیلی اور جو وزنی ہے وہ وزنی شمار ہوگی۔

گندم کے غلے کو گندم کے آٹے یا گندم کو ستو کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے۔ نہ تفاضل کے ساتھ اور نہ ہی برابر سرابر۔ کیوں کہ گندم کا غلہ اور گندم کا آٹا ہم جنس ہیں غلے کو آٹے کے بدلے فروخت کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ گندم کے آٹے کو گندم کے آٹے کے بدلے ومع زیادتی کے فروخت کیا گیا۔ کیوں کہ غلہ میں آٹا شامل ہے جو پھیل جائے گا اور کیل میں بڑھ جائے گا لہٰذا اس میں برابری نہیں ہوگی۔ لہٰذا بیع جائز نہیں ہوگی۔ عدم جواز کی اصل وجہ شبہ ربا ہے۔ ربا کے باب میں شبہ ربا بھی ربا شمار ہوتا ہے۔

البتہ تازہ کھجوروں کو خشک کھجوروں کے عوض برابر کیل کر کے بیچنا جائز ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] [بخاری: ۲/۱۲۱۵]

کا ارشادِ گرامی ہے۔ "التمر بالتمر ربًا الاهاء وهاء" کھجور کے عوض کھجور بیچنے میں اگر برابری نہ ہو تو ربا ہے" زندہ حیوان کے عوض گوشت فروخت کرنا جائز ہے۔ کیوں کہ وزنی چیز کی عددی کے بدلے بیع جائز ہے۔ اس لیے کہ قدر مختلف ہے۔ اس طرح دو علیحدہ علیحدہ گوشت جدا جدا جنس ہیں۔ایک کو دوسرے کے عوض تفاضلاً بیچنا جائز ہے۔ ہاں البتہ، گائے اور بھینس ایک جنس، بکری اور بھیڑ ایک جنس شمار ہونگی۔

مسلمان اور کافر کے درمیان کاروبار کا حکم

اگر مسلمان ویزہ لیکر کسی کافر ملک چلا جائے تو کفار کے ساتھ ان کی رضامندی سے کوئی بھی کاروبار کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ دھوکہ دہی ان کے ساتھ نہ کرے۔ اگر مسلمان بغیر اجازت و بغیر ویزہ کے چلا جائے تو وہ دار الحرب کے حربی کافر کا مال اس کی رضامندی کے بغیر بھی استعمال کرسکتا ہے۔حربی کا مال مباح الاصل ہے۔ ہاں جو ویزے کے معاہدے کے تحت ہے۔ اس کو چھیڑنا معاہدے کی خلاف ورزی کی وجہ سے ممنوع ہوگا۔

اگر مسلمان دارالحرب میں حربی کے ساتھ ایک ڈالر کے بدلے دو ڈالر لے لے، یا شراب یا خنزیر کافر کے ہاتھ فروخت کر دے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے۔ کیوں کہ ارشادِ نبوی ہے۔ "لاربا بين المسلم و الحربى فى دار الحرب" (دارالحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان ربو نہیں ہے) [1]

جب کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دارالحرب میں بھی مسلمان اور کافر کے درمیان سودی کاروبار جائز نہیں ہے جس طرح دارالاسلام میں جائز نہیں ہے۔ جس طرح زنا اور سرقہ دارالاسلام میں جائز نہیں ہیں دارالحرب میں بھی جائز نہیں۔

دارالحرب کے دارالاسلام اور دارالاسلام کے دارالحرب بننے کی شرائط اور تفصیلات نصب الرایہ ہی ملاحظہ ہوں۔ [2]

☆☆☆

[1] [نصب الرایہ:۴/۴۴]　[2] [نصب الرایہ ۴/۴۴]

﴿باب السلم﴾

بیع سلم

السلم کا لغوی معنی بیع سے قبل دی ہوئی کچھ رقم۔ اور شرعی معنی ہے بیع آجل بعاجل: ثمن پہلے اور مبیع بعد میں یا جانا۔

بیع سلم کا رکن وہی ہے جو عام بیع کا ہے (یعنی ایجاب وقبول) صاحب ثمن کو رب السلم بائع کو مسلم الیہ، مبیع کو مسلم فیہ، ثمن کو راس المال کہا جاتا ہے۔

بعض بیوع ایسی ہیں کہ جن میں مبیع وثمن پر مجلس عقد میں قبضہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

بعض بیوع ایسی ہیں کہ مجلس عقد میں مبیع وثمن یا ان میں سے کسی ایک پر قبضہ کرنا ضروری نہیں ہے اس بیع کی مثال جس میں عوضین (مبیع وثمن) پر قبضہ مجلس میں ضروری نہیں۔ زمین و جائیداد کی بیع ہے۔ جب بیع تام ہو جائے تو بائع زمین کو اور مشتری ثمن کو حوالہ کر دے۔ یا بائع زمین پر قبضہ دیدے اور ثمن کی وصولی کیلئے مشتری کو وقت کی مہلت دے اور وہ بیع جس میں مجلس کے اندر عوضین پر قبضہ ضروری ہے۔ وہ بیع صرف (نقدی کی بیع نقدی کے عوض) ہے۔ اس طرح بیع سلم کہ اس میں ثمن پر مجلس کے اندر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ بیع سلم خلاف قیاس ہے مگر شریعت نے اس کو ضرورت کی بنا پر مشروع قرار دیا ہے۔ اس کے جواز کا ثبوت قرآن میں ہے: فرمان الٰہی ہے:

"یاایھا الذین ء امنوا إذا تداینتم بدین إلٰی أجل مسمی فاکتبوہ"

[البقرہ:۲۸۲]

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں معاملہ کرو ادھار کا کسی وقت مقررہ تک اسے لکھ لیا کرو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بیع سلم کی اجازت دی ہے اور استدلالاً مذکورہ آیت تلاوت فرمائی [1]

ثبوت جواز بیع سلم حدیث ذیل ہے: ارشاد نبوی ہے "من اسلف فی شئ ففی کیل معلوم، و وزن معلوم الی أجل معلوم"[2] "جو شخص ثمن پہلے وصول کرے تو مبیع کی

1۔ [المستدرک:۲/۲۸۶] 2۔ [بخاری:۴۳۹]

مقدار اور وزن اور وقت ادائیگی مقرر ہونا چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ ایک سال یا دو سال بعد ادا کرنے کے وعدہ پر کھجوروں میں بیع سلم کیا کرتے تھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من سلف فی تمر فلیسلف فی کیل معلوم و وزن معلوم" "جو شخص کھجوروں میں بیع سلم کرے وہ مقدار اور وزن مقرر کرلے"۔

بیع سلم دوسری بیوعات سے ذرا مختلف ہے کیوں کہ یہ معدوم کی بیع ہے یعنی ایسی چیز کی بیع ہے جو بائع کے پاس فی الحال موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ ایسی بیع ہے جس کی اکثر لوگوں کو ضرورت پڑتی رہتی ہے مثلاً رب السلم کو کھجوروں کی ضرورت ہے۔ اور مسلم الیہ کو رقم کی ضرورت ہے جو فی الحال اپنی ضرورت میں استعمال کرسکے۔ اس وجہ سے فقہاء نے اس کا نام بیع المحاویج یعنی "ضرورت مندوں کا کاروبار" رکھا ہے اور اس کو بیع المفالیس "غریبوں کا روبار" بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ غریب کی ضرورت کے تحت مشروع کیا گیا ہے کہ وہ ثمن پہلے لیکر اپنی ضرورت کو رفع کریں اور مبیع کو بعد میں مشتری کے حوالہ کردیں۔ یہ کاروبار اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں رقم کی ضرورت فی الحال ہوتی ہے اور مبیع ان کے پاس نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اگر مبیع موجود ہو تو بیع سلم کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ بیع سلم، لفظ سلم، لفظ سلف اور بیع کے الفاظ کے ساتھ منعقد ہوجاتی ہے۔

بیع سلم کے جواز کی شرائط

"ہر وہ چیز جس کی صفت بتائی جاسکے اور اس کی مقدار کی معرفت ممکن ہو اس میں بیع سلم جائز ہے اور جس کی صفت و مقدار معلوم کرنا ممکن نہ ہو اس میں بیع جائز نہیں ہوگی۔"

بیع سلم کے جواز کی شرطوں میں ایک یہ ہے کہ عقد کے وقت سے لیکر ادائیگی بیع کے وقت تک مسلم فیہ کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ مسلم فیہ وقت عقد میں مارکیٹ سے ناپید ہو جائے اس میں بیع سلم جائز نہیں ہوگی۔ اگرچہ اس وقت گھروں میں موجود ہو۔ یا ادائیگی کے وقت موجود ہو۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وقت مقررہ میں اگر موجود ہو تو بیع جائز ہوگی، حضرات حنفیہ کی دلیل یہ ہے کہ مشتری کے حوالے کرنے کی قدرت جب ہوگی جب بائع کیلئے حاصل کرنا ممکن ہو۔ اس کے لئے مسلم فیہ عقد بیع کے وقت سے لیکر وقت مقررہ تک برقرار رہنا ضروری ہے تاکہ بائع کیلئے اس کا حصول ممکن ہو، دوسری دلیل یہ ہے وقت بیع سے لیکر وقت مقررہ کی درمیانی مدت میں بھی تمام وقت مقررہ انتہائے موت ہوسکتا ہے۔ مثلاً اسی درمیانی وقت میں مسلم الیہ مر بھی سکتا ہے۔ اس لئے مسلم فیہ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول کہ جب

ان سے درخت میں موجود کھجوروں میں بیع سلم کے جواز کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے کھانے اور وزن کے قابل ہونے سے قبل بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔''[1]

اگر ایسی چیز میں بیع سلم کی جو وقت بیع میں موجود ہو اور وقت مقررہ تک برقرار رہے وقت مقررہ آنے کے باوجود مسلم الیہ نے رب السلم کو مسلم فیہ حوالہ نہیں کی۔ پھر وہ مارکیٹ سے ناپید ہوگئی تو عقد سلم صحیح ہے البتہ رب السلم کو اختیار ہوگا چاہے تو بیع کو فسخ کر دے اپنا رأس المال واپس لے لے، چاہے مسلم فیہ کے موجود ہونے تک انتظار کرے۔

مکیلات، جیسے گندم، جو، مکئی، جوار، دال، اور موزونات جیسے روئی وغیرہ، معدودات متقاربہ جیسے انڈے وغیرہ میں بیع سلم جائز ہے کیوں کہ ان اشیاء کی صفت اور مقدار کی معرفت ممکن ہے۔ البتہ غیر متقارب عددیات (شمار کے ذریعے بیچنے والی چیزیں) مثلاً تربوز، انار شمار کر کے فروخت کئے جانے کی صورت میں بیع سلم جائز نہیں اور اگر ان کو وزن کر کے فروخت کیا جائے تو بیع سلم جائز ہے۔

البتہ روئی میں وزن یا شمار دونوں طرح بیچنے میں بیع سلم جائز ہے۔ لوگوں میں دونوں طرح کے طریقے جاری ہیں۔

بیع سلم کے صحیح ہونے کی شرائط

بیع سلم کے صحیح ہونے کی آٹھ شرطیں ہیں۔ (۱) جنس، (۲) نوع (۳) وصف (۴) وقت مقررہ (۵) مقدار (۶) ادائیگی کی جگہ (۷) رأس المال کا وزن اگر موزونی ہے، کیل اگر کیلی ہے متعین کرنا۔ (۸) مجلس کے برخاست ہونے سے قبل رأس المال پر قبضہ کرنا۔

جنس سے مراد مثلاً مسلم فیہ، گندم، چاول یا دال وغیرہ متعین کرنا۔

نوع سے مراد مثلاً کھجور میں عجوہ، یا برنی، چاول میں باسمتی، سیلہ وغیرہ۔

وصف سے مراد، اعلیٰ ادنیٰ، متوسط وغیرہ

اجل: وقت مقررہ جس میں مسلم فیہ کو حوالہ کیا جائے گا۔ متعین کیا جائے کیوں کہ ان چیزوں کو متعین کرنے سے مبیع میں جہالت ختم ہوتی ہے۔ جھگڑے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور ان کو متعین نہ کرنے کی وجہ سے مسلم فیہ مجہول ہوگا جو باعث منازعت ہوگا۔

مقدار: سے مراد مثلاً پچاس کلو، یا پچاس من وغیرہ حضور ﷺ کا فرمان ہے۔ فرمایا ''فليسلف في كيل معلوم و وزن معلوم'' اگر مسلم فیہ کو پہنچانے میں دقت ہو اور خرچ آتا ہو تو حوالہ کرنے

[1] [بخاری: ۴۴۰]

کی جگہ کا تعین بھی عقد کے وقت ضروری ہے۔ کیوں کہ وقت ادائیگی میں مسلم فیہ کہاں ہوگی معلوم نہیں، اس میں منازعت کا خطرہ ہوگا اس لئے جگہ کا تعین ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشیاء کی قیمتیں مختلف جگہوں میں مختلف ہوتی ہیں اور اگر مسلم فیہ کے حوالے کرنے میں کوئی خرچ نہ آتا ہو تو جگہ کا تعین ضروری نہیں ہے۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلم فیہ کو حوالہ کرنے کی جگہ کو عقد میں متعین کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ عقد کے مقام میں پہنچانا مسلم الیہ کی ذمہ داری ہے۔ کیوں کہ یہ متعین ہے۔ عام بیوعات میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے رأس المال کی مقدار کی تعیین حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ضروری ہے۔ مسلم الیہ کو حوالہ کرتے وقت گن کر دیدے، تاکہ جھگڑے کی راہ مسدود ہو جائے۔ خصوصاً کرنسی نوٹ جب ایک سے زیادہ ہوں۔ اگر رأس مال السلم کرنسی نہ ہوں بلکہ کپڑے وغیرہ ہوں تو اس میں ہر ایک گز کو گننے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ محض اس کی طرف اشارہ کافی ہے۔

باقی مجلس کے برخاست ہونے سے قبل رأس مال السلم پر قبضہ کرنا اس لئے ضروری ہے کیوں سلم کہتے ہیں اس کو کہ اجل کے بدلے عاجل کو حاصل کرنا۔ احد العوضین پر قبضہ کرنا ضروری ہے تاکہ سلم کا معنی متحقق ہو جائے اور اگر رأس المال کی ادائیگی بھی بعد میں ہو تو یہ دین کے بدلے دین ہوا جو جائز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رأس المال میں خیار الشرط جائز نہیں ہوگا کیوں کہ خیار الشرط سے سلم کا مفہوم ختم ہو جاتا ہے۔ رأس المال کے بدلے دوسری چیز لینا بھی جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سے رأس المال پر قبضہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ بیع سلم کے صحیح ہونے کیلئے رأس المال پر قبضہ ضروری ہے۔ اسی طرح رب السلم کو رأس المال سے بری کرنا بھی جائز نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس صورت میں بیع سلم کی ایک شرط (رأس المال پر قبضہ) مفقود ہو جاتی ہے۔

البتہ مسلم فیہ سے مسلم الیہ کو بری کرنا صحیح ہے کیوں کہ یہ اس کے ذمہ دین ہے مجلس میں اس پر قبضہ بھی شرط نہیں ہے۔ جس طرح دوسرے دیون سے بری کرنا درست ہے مسلم فیہ سے بری کرنا بھی صحیح ہے۔

بیع سلم کے صحیح ہونے کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ رأس المال اور مسلم فیہ میں علت ربا کے دو وصفوں (جنس وقدر) میں سے کوئی وصف مجتمع نہ ہو۔ حتیٰ کہ کیلی کو کیلی کے ساتھ بطور بیع السلم کے فروخت کرنا جائز نہیں۔ مثلاً گندم کو رأس المال مقرر کر کے جو کو مسلم فیہ بنائے تو بیع صحیح نہیں۔

کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کے ذریعے اس سے منع فرمایا ہے: "فاذا

اختلفت هذه الا صناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد": "جب یہ اصناف مختلف ہوں تو جیسے چاہو فروخت کردو مگر دست بدست ہونا ضروری ہے۔"

وہ اشیاء جن میں بیع سلم صحیح نہیں

جانور میں بیع سلم صحیح نہیں ہوگی کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ لوگ اونٹ کے گوشت حبل الحبلة تک کیلئے بیع کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمادیا۔ حبل الحبلة یہ ہے حاملہ اونٹنی بچہ دے پھر وہ دوبارہ حاملہ ہو جائے۔[1]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گوشت میں بیع سلم صحیح نہیں ہوگی۔ اگرچہ بکری کے خاص عضو کو بھی متعین کردے، کیوں کہ گوشت کی تعیین ممکن نہیں اس لئے وہ موٹا بھی ہوسکتا ہے اور لاغر بھی، اسی طرح ہڈیاں زیادہ ہوں کم ہوں۔ نزاع کا خطرہ ہے اور حضرات صاحبین ؒ کے نزدیک جائز ہے اگر بکری کے خاص مقام کا گوشت متعین کردیا جائے کیوں کہ موزون ہے۔ اس کی صفت بیان کی جاسکتی ہے۔

البتہ پرندوں کے گوشت میں بالاتفاق بیع ناجائز ہے اسی طرح سری پایوں میں بیع سلم صحیح نہیں ہوگی۔ کیوں کہ یہ چیزیں صفت کے اعتبار سے منضبط نہیں ہوتیں عام طور پر یہ اعضاء وزن کر کے فروخت نہیں کئے جاتے، بلکہ عدد کے اعتبار سے فروخت کئے جاتے ہیں اور عدد کے لحاظ سے ان میں برابری ممکن نہیں ہے بڑے چھوٹے ہوسکتے ہیں۔ کھال کا اگر طول وعرض اور اس کی جودت بیان کردی جائے تو اس میں بیع سلم جائز ہے ورنہ نہیں۔

بعینہ خاص کھیت کے غلہ، یا خاص متعین باغ کے میوؤں میں بیع سلم صحیح نہیں کیوں کہ مدت سلم مکمل ہونے سے پہلے آفت کی زد میں آسکتے ہیں جس کی وجہ سے حوالگی ناممکن ہوسکتی ہے۔

موتیوں اور جوہرات میں بھی بیع سلم صحیح نہیں۔ کیوں کہ یہ بہت زیادہ متفاوت اور مختلف ہوتے ہیں اگر موتی چھوٹے چھوٹے ہوں تو وزن کے اعتبار سے جائز ہے اور وہ چیز جس کی صفت بیان نہ کی جاسکے اور اس کی مقدار نہ معلوم کی جاسکتی ہو اور عددی ہونے کی صورت میں عدد متفاوت ہوں تو ان میں بیع سلم جائز نہیں ہوگی۔ کیوں ایسی صورت میں مسلم فیہ مجہول ہوگا جو منازعت کا باعث ہوگا۔

---

[1] [بخاری/۷۸۵]

رأس المال اور مسلم فیہ میں تصرف کا حکم

قبل القبضہ رأس المال اور مسلم فیہ میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے اس لیے کہ رأس المال میں تصرف کی وجہ سے قبضہ جو مجلس میں ہونا چاہئے نہیں ہوگا اور مسلم فیہ مبیع ہے اور بیع پر قبضہ سے پہلے تصرف کرنا جائز نہیں ہوگا۔ حدیث سابق کی بنا پر۔ اس وجہ سے مسلم فیہ کے اندر بیع مرابحہ، تولیہ، مواضعہ قبل القبض جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ اس میں قبل القبض تصرف ہے جو جائز نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے "لا تبیعن شیئاحتی تقبضه" "کوئی چیز اس وقت تک نہ بیچو جب تک کہ اس پر قبضہ نہ کرلو۔"

باب الصرف

الصرف کا لغوی معنی ہے "اضافہ" اور دینار پر دینار اور درہم پر درہم کا اضافہ اور شرعی معنی ہے: سونے کے بدلے سونے اور چاندی کے بدلے چاندی فروخت کرنا۔ صرف، نفل، عدل کا اطلاق بھی اسی بیع پر ہوتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں سکے کا سکے کے بدلے فروخت کرنا بھی بیع صرف میں داخل ہے۔ کیوں کہ آج کل یہی سکے سونے چاندی کی جگہ مستعمل ہیں۔ ان پر زکوٰۃ بھی واجب ہے اور سود بھی حرام ہے۔

بیع صرف تین شرطوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ (۱) مجلس ختم ہونے سے پہلے عوضین پر قبضہ کرنا (۲) قطعی عقد ہے اس میں خیار الشرط نہیں ہوگا۔ خیار الشرط لگانے کی صورت میں صرف جائز نہیں ہوگا۔ ہاں اگر مجلس ختم ہونے سے پہلے صاحب خیار اپنا اختیار ختم کرے تو جائز ہے۔ (۳) بدل الصرف مؤجل (مؤخر) نہ ہو، اگر مجلس عقد ہی میں تاجیل ختم کر دے اور بدل صرف حوالہ کر دے تو درست ہے۔

سونے کے بدلے سونے اور چاندی کے بدلے چاندی فروخت کیا جا رہا ہو۔ تو تماثل اور مجلس عقد میں بیع وثمن پر قبضہ ضروری ہوگا۔ اگر سونے کے بدلے سونا فروخت کیا جا رہا ہو اور ایک طرف سونا زیادہ ہو اور کم سونے کے ساتھ کوئی چیز شامل کی جائے مثلاً یاقوت یا موتی جو سونے کی جنس سے نہیں تو بیع جائز ہے۔ بیع صرف میں مجلس کے اندر عوضین پر قبضہ کی شرط کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔ "الذھب بالورق ربًا الاھاء وھاء"[۱]

اگر چاندی کو سونے کے عوض فروخت کر دیا جائے تو وزن کر کے بھی اور اندازۃً بھی جائز ہے کیوں کہ خلاف جنس فروخت کرنے کی صورت میں تفاضل جائز ہے۔ البتہ مجلس میں قبضہ شرط ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے۔ "الذھب بالورق ربًا الاھاء وھاء" ایک اور ارشاد فرمایا: "اذا اختلفت ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم اذا کان یدًا بیدٍ"[۲] اگر عوضین پر یا عوضین میں سے کسی ایک پر قبضہ سے قبل جدائی ہو جائے تو عقد صرف باطل ہو جائے گا اگر جدا ہونے کے بعد قبضہ بھی کر لیا جائے تب سابق عقد کی بنیاد پر صحیح نہیں۔ البتہ دوبارہ عقد کر کے قبضہ کریں تو درست ہے۔

---

۱ [المؤطا:۲/۶۱] ۲ [ابوداؤد:۲۴۸]

سابق میں گزرنے والی حدیث کی بنیاد پر ثمنِ صرف پر قبضے سے پہلے تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔

زیورات اور کنگنوں میں اگر سونا غالب ہے، تو سونے کا حکم لگایا جائے گا اگر چاندی غالب ہے تو چاندی کا اور اگر ان پر کھوٹ غالب ہے تو کھوٹ کا حکم لگایا جائے گا۔ یعنی پیتل اور تانبے کے حکم میں ہوگا، اس لئے کہ اعتبار غالب کا ہوتا ہے۔

﴿کتاب الشفعۃ﴾

شفعة شفع سے مشتق ہے اور شفع کا معنی ملانا اور جوڑنا ہے اور شرعی اصطلاح میں مشتری پر جبراً زمین کے مالک ہونے کو کہتے ہیں اور اس کو شفعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں غیر کی ملک کو اپنی ملک کے ساتھ ملالیا جاتا ہے۔

کن لوگوں کے لئے شفع ثابت ہے

(۱) نفس بیع میں شریک کیلئے حق شفعہ ثابت ہے جس قیمت پر زمین بیچی جارہی ہے اسی قیمت پر اس کیلئے یہ حق ثابت ہے۔ دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے۔ "من کان له شريک في حائط فلا يبيع نصيبه من ذلک حتى يعرضه على شريكه"[۱] "جو شخص دیوار یا باغ کی ملکیت میں اس کے ساتھ شریک ہے اس کو خریدنے کا اختیار دیئے بغیر اپنا حصہ فروخت نہ کرے۔"

دوسری جگہ آپ کا ارشاد حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "الشفعة في كل شريک في أرض او ربع اوحائط، لايصلح ان يبيع حتى يعرض على شريكه فياخذ اويدع فان أبى فشريكه احق به حتى يؤذنه"[۲] "ہر اس شخص کیلئے شفعہ ثابت ہے جو زمین یا گھر یا باغ کی ملکیت میں شریک ہے۔ اپنے شریک کو بتائے بغیر کسی اور کے ہاتھ فروخت کرنا صحیح نہیں، بتانے کے بعد یا اس کو خریدے گا یا چھوڑ دے گا۔"

دوسری دلیل: حضرت شریدؓ کی روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کا ایک گھر تھا اس میں ایک شخص بھی شریک تھا۔ میں نے اپنا حصہ کسی کے ہاتھوں فروخت کیا۔ میرے شریک (پارٹنر) نے کہا۔ شریک ہونے کی وجہ سے مجھے اس کے خریدنے کا حق ہے۔ اس نے جا کر رسول اللہ ﷺ کو بتایا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: "الجار احق بسقبه"[۳] "پڑوسی قریب ہونے کی وجہ سے اس کا زیادہ حق دار ہے۔"

صورۃ مسئلہ: یہ ہے مثلاً دو شخص پارٹنر شپ پر زمین یا مکان خریدیں۔ ان میں سے ایک اپنے شریک سے کہے بغیر اپنا حصہ بیچنے کا حق نہیں رکھتا۔ کیوں کہ غیر کے مقابلے میں یہ اس کا زیادہ

---

۱ [ترمذی:۵/۳۸۷] ۲ [بخاری:۱۴۶۶] ۳ [دارقطنی:۲۲۰۲]

حقدار ہے۔ غیر کی وجہ سے اس کو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ ہاں اگر وہ خریدنے سے انکار کرے تب دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ شریک نے اپنا حق خرید ساقط کر دیا۔

۲: حق مبیع میں شریک کیلئے شفعہ ثابت ہے۔ مثلاً دو آدمیوں کے گھروں کا ایک خاص راستہ ہے اس میں وہ شریک ہیں۔ ان میں کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے شریک راستہ کو بتائے بغیر کسی اور کے ہاتھ اپنا وہ گھر فروخت کرے۔ ہاں اگر اس نے خریدنے سے انکار کیا تو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرسکتا ہے۔

۳: جار ملاصق کیلئے حق شفعہ ثابت ہے۔ یعنی وہ پڑوسی جس کی دیوار یا حد بندی اس کے گھر یا زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہو اس کو بتائے بغیر کسی اور کے ہاتھ فروخت کرنا درست نہیں ہے اگر وہ خریدنے سے انکار کر دے تو دوسرے کے ہاتھ فروخت کیا جاسکتا ہے۔

دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے "جار الدار احق بالدار والارض من غیرہ"[1] گھر اور زمین کا پڑوسی (خریدنے میں) غیر سے زیادہ حقدار ہے۔"

تو شفعہ کے مراتب ہیں: سب سے زیادہ قوی نفس مبیع میں شریک ہے۔ دوسرے نمبر پر حقدار حق مبیع میں شریک ہے تیسرے نمبر پر جار ملاصق حقدار ہے۔ نفس مبیع میں شریک کے ہوتے ہوئے حق مبیع میں شریک اور جار ملاصق کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کیوں کہ نفس مبیع میں شریک کا حق جز جز میں شامل ہونے کی وجہ سے زیادہ قوی ہے۔ اگر وہ اپنا حق چھوڑ دے تو پھر حق مبیع میں شریک کو حق شفع ملے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے متصل پڑوسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا اگر وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائے تو جار ملاصق حقدار ہوگا۔ ایسا پڑوسی جس کے گھر سے گھر ملا ہوا تو نہیں ہے مگر دونوں کا ایک کھلا راستہ ہے بند نہیں ہے تو اس کو حق شفع حاصل نہیں۔ کیوں کہ کھلا راستہ ہونے کی وجہ سے ضرر نہیں ہوگا۔

شفیع کیلئے شفعہ کب ثابت ہوگا؟

شفیع کیلئے شفعہ اس وقت ثابت ہوگا جب مالک اس کی بیع کر دے جب بائع بیع کرنے کا اقرار کرے گا تو شفیع کیلئے شفعہ ثابت ہوگا چاہے مشتری اس کو خریدے یا انکار کر دے۔ اس طرح کسی نے خیار شرط کے ساتھ گھر خریدا تو اس وقت بھی شفیع کیلئے حق شفعہ ثابت ہوگا۔ بخلاف اس صورت کہ خیار شرط بائع کیلئے ہو تو حق شفعہ حاصل نہیں ہوگا کیوں کہ اس صورت میں بائع کی طرف سے اقرار بیع نہیں ہوا ہے۔ عقد بیع منعقد ہونے سے قبل حق شفعہ حاصل نہیں ہوگا۔ عقد کے بعد

[1] [معجم الطبرانی: ۷/۱۹۶]

اس سے پہلو تہی کی تو ساقط ہو جائے گا۔ زمین کے بکنے کا علم ہوتے ہی فوراً کھڑے ہو کر یہ اعلان کرنا میں اس کا شفیع ہوں ضروری ہے۔ اس کو طلب کہتے ہیں۔ طلب کی دو قسمیں ہیں اور دونوں ضروری ہیں ان کے بغیر حق ساقط ہو جائے گا۔

(۱) طلب مواثبہ:

یعنی زمین رجائیداد کی فروختگی کا علم ہوتے ہی فوراً شفیع ہونے کا اعلان کرنا چنانچہ اگر علم ہونے کے بعد خاموش ہو گیا پھر بعدازاں اعلان کیا تو حق شفعہ نہیں ملے گا حتیٰ کہ اگر خط کے ذریعے اسے اطلاع دی گئی اور خط کے شروع میں زمین کے فروخت ہونے کا تذکرہ کرتا تھا۔ اس نے خط آخر تک پڑھا اور خط پڑھنے کے بعد شفیع ہونے کا دعویٰ کیا تو۔ حق شفعہ نہیں ملے گا۔ بلکہ خط میں زمین کے بکنے کی خبر پڑھتے ہی کہہ دینا چاہئے کہ میں شفیع ہوں۔ یہ اکثر مشائخ احناف کا قول ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اس طرح مروی ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ اس کو مجلس کے اندر اندر کسی بھی وقت طلب کا اختیار ہے۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو لیا ہے کیوں کہ جب اس کو مالک بننے کا اختیار مل رہا ہے تو سوچنے کا بھی موقع ملنا چاہئے اور فوراً طلب کا قول امام اعظمؒ سے مروی ہے۔ ان کی بھی دوسری روایت امام محمدؒ کی دوسری روایت کے مطابق یہ ہے کہ اس کو مجلس علم میں اظہار شفعہ کا اختیار ہونا چاہئے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ فتویٰ اس قول پر ہے۔

(۲) طلب اشہاد:

یعنی گواہ مقرر کرنا۔ اس کو طلب تقریر بھی کہتے ہیں یعنی حق کو پختہ کرنا مطلب یہ ہے کہ طلب مواثبہ کے بعد شفیع بائع یا مشتری یا مبیع کے پاس جا کر لوگوں کو شفیع ہونے کا گواہ بنائے اور یوں کہے کہ فلاں شخص نے اس گھر کو خریدا ہے۔ اس کا شفیع میں ہوں میں نے اس سے قبل شفعہ کا مطالبہ کیا ہے اور اب بھی مطالبہ کرتا ہوں اور تم لوگ اس پر گواہ رہو۔ جب اس طرح کہے گا۔ تو اس کا حق شفعہ پکا ہو جائے گا۔ البتہ طلب اشہاد کے بعد تاخیر کی وجہ سے حق شفعہ ساقط نہیں ہوگا۔ یہ قول امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طلب اشتہاد کے ایک مہینہ تک بلا عذر تاخیر کرے تو حق ساقط ہو جائے گا اور فتویٰ اسی پر ہے۔

شفعہ کب ثابت ہوگا کب نہیں؟

جائیداد اور جو چیز جائیداد کے حکم میں ہے، اس میں شفعہ ثابت ہوگا۔ جیسے مکان کے اوپر

کا حصہ: اگر وہ قابل تقسیم نہ ہو جیسا کہ چھوٹا گھر وغیرہ دلیل اس کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر ایسی شرکت میں جو نا قابل تقسیم ہو شفعہ جاری فرمایا ہے۔ گھر ہو یا باغ۔[1] تاہم اشیاء منقولہ میں شفع نہیں ہوگا۔ کیوں کہ شفعہ کا ثبوت برے پڑوسی کے ضرر سے بچنے اور محفوظ رہنے کیلئے مشروع کیا گیا ہے۔ جب کہ اشیاء منقولہ میں ایسے دوامی ضرر کا اندیشہ نہیں ہے۔ اگر ہو بھی تو ختم ہوسکتا ہے۔

جب زمین/جائیداد وغیرہ عوض مالی کے بدلے فروخت ہو جائے تو اس میں شفعہ ہوگا۔ اس لئے کہ شفعہ اس مال کے عوض زمین کی ملکیت حاصل کرنے کا نام ہے جس مال پر بائع ومشتری کے درمیان ثمن ٹھہرا ہے۔ چنانچہ ہبہ بالعوض میں شفعہ ہوگا۔ جب موہوب لہ موہوب پر قبضہ کرلے۔ قبضہ سے پہلے شفعہ نہیں ہوگا۔

جو گھر بطور مہر کے دیدیا جائے یا خلع کے بدلے یا قتل عمد میں بدل صلح کے طور پر دیا جائے اس میں حق شفع نہیں ہوگا۔ اگر کسی کے قرض کے اقرار پر قرض کی ادائیگی کے عوض دیا جائے تو اس میں حق شفعہ ہوگا کیونکہ یہ مبادلۃ المال بالمال ہونے کی وجہ سے مبیع ہے۔

اسی طرح شفیع کو خریدنے کے بعد خیار عیب اور خیار رویت حاصل ہوگا کیوں کہ یہ مشتری کی طرح ہے اور مشتری کو یہ حقوق حاصل ہیں اگرچہ مشتری نے گھر دیکھنے کے بعد گھر کو بے عیب قرار کیوں نہ دیا ہو۔ تب بھی شفیع کا خیار رویت باطل نہیں ہوگا۔ اگر شفیع نے بائع کو حاضر کیا اور مبیع ابھی اسی کے قبضے میں ہے تو اس کے ساتھ مخاصمت کرے گا اس لئے کہ قبضہ اسی کا ہے۔ البتہ عدالت مشتری کی حاضری سے قبل کیس کی سماعت نہیں کرے گی۔ مشتری کی موجودگی میں بیع کو فسخ کردے گی اور بائع کے خلاف جبکہ شفیع کے حق میں فیصلہ دے گی اور اس کا ذمہ دار بائع کو قرار دے گی۔ اس لئے کہ جب مبیع بائع کے قبضے میں ہے تو اس کا حق اس کے ساتھ متعلق ہے۔ اور ثمن وصول کرنے تک اس پر قبضہ برقرار رکھے گا۔ مشتری کے بغیر کیس کی سماعت اس لئے نہیں ہوگی کہ زمین اس کی ملکیت ہے۔ اگر زمین مشتری کے قبضے میں ہو تو بائع کو عدالت میں حاضر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ اجنبی ہوگیا کیوں کہ اس کا قبضہ ہے نہ ملکیت، اس صورت میں صرف مشتری کی موجودگی میں قاضی فیصلہ دے گا اور کہے گا کہ میں نے مشتری کی موجودگی میں اس کے خرید کو منسوخ کردیا۔ یہ نہیں کہے گا کہ میں نے بیع کو منسوخ کیا تاکہ شفیع کا شفعہ باطل نہ ہو جائے کیوں کہ اس کا حق بیع پر موقوف ہے۔

---

[1] [مسلم ۳/۱۲۲۹]

شفیع اور مشتری کی موت کا اثر

شفیع کے مرنے سے شفعہ باطل ہو جائے گا مشتری کے مرنے سے نہیں۔ خیار شرط کے ساتھ بیع کرنے کی صورت میں حق شفعہ نہیں ہوگا۔ اگر شرط کو ساقط کر دیا تو شفعہ ہوگا۔ اور خیار شرط اگر مشتری کیلئے ہے تو شفعہ ثابت ہوگا۔ اگر مبیع کے ثمن کے متعلق بائع و مشتری کے درمیان اختلاف ہو جائے تو مشتری کے قول کا اعتبار ہوگا، اس کے حلف کے ساتھ اب شفیع کو اختیار ہوگا کہ چاہے اسی قیمت کے عوض خریدے جس کا مشتری کہہ رہا ہے یا چھوڑ دے، یہ جب ہے جب شفیع کے پاس بینہ نہ ہو اور اگر شفیع بینہ پیش کر دے تو قاضی اس کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ یہ حضرات طرفین (امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ) کا قول ہے اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، مشتری بینہ پیش کرے۔ اس لئے کہ وہ اکثر کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص مالک زمین کا وکیل بن کر زمین فروخت کرے تو اس کو اس زمین کا شفع کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا جبکہ مشتری کے وکیل کیلئے حق شفعہ ثابت ہوگا۔

اگر بائع اور مشتری کے درمیان ثمن کی مقدار میں اختلاف ہو جائے۔ بائع کم ثمن اور مشتری زیادہ کا قائل ہو تو شفیع وہ ثمن ادا کرے گا جو بائع کہہ رہا ہے۔ یہ جب ہے جب بائع نے ثمن پر قبضہ نہ کیا ہو۔ اور اگر بائع نے ثمن پر قبضہ کر لیا تو مشتری کے قول کا اعتبار ہوگا۔ اگر بائع نے مشتری کیلئے ثمن میں کچھ کمی کر دی تو وہ ثمن شفیع سے بھی ساقط ہوگا۔ اگر جمیع ثمن معاف کر دے تو شفیع سے ساقط نہیں ہوگا۔ اگر مشتری ثمن پر اضافہ کر کے بائع کو دیدے تو شفیع پر اضافہ لازم نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ شفیع پر وہ ثمن واجب ہوگا جو وقت عقد میں ثابت ہو۔ گھر کو اگر سامان کے عوض خریدا ہے تو شفیع سامان کی قیمت کے برابر ثمن دے گا اگر زمین کے بدلے زمین فروخت ہو تو شفیع قیمت زمین بطور ثمن ادا کرے گا۔ اگر شفیع کو اطلاع ملی کہ زمین لاکھوں میں بکی ہے اس نے کثرت ثمن کی وجہ سے شفعہ طلب نہیں کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کم قیمت میں فروخت ہوئی اور اس کی طاقت خرید کے مطابق ہے تو دوبارہ شفعہ دائر کر سکتا ہے کیوں کہ خبر پہنچانے والے نے جھوٹ بول کر اس کے ساتھ دھوکہ کیا۔

اگر معلوم ہوا کہ فلاں شخص نے فلاں زمین کو خریدا۔ شفیع نے شفعہ چھوڑ دیا بعد میں معلوم ہوا خریدار وہ آدمی نہیں تھا بلکہ کوئی اور تھا تو حق شفعہ باطل نہیں ہوگا۔ اس نے کہا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ پڑوسی بننے میں خوشی ہوتی ہے اور بعض لوگ وبال جان بن جاتے ہیں۔ ایک کے لئے حق چھوڑنے سے دوسرے کیلئے ثابت نہیں ہوگا۔ اگر ایک زمین یا گھر کے بہت شفیع

سامنے آجائیں تو حق شفعہ افراد کے حساب سے تقسیم ہوگا۔ مقدار ملکیت کے اعتبار سے نہیں مثلاً ایک گھر ہے۔ اس کا نصف ایک کا ہے۔ ایک تہائی دوسرے کا اور چھٹا حصہ تیسرے کا۔ نصف والے نے اپنا حصہ فروخت کردیا۔ دو شریکوں نے حق شفعہ دائر کردیا تو باقی نصف کو دو شفیعوں کے درمیان تقسیم کردیا جائے گا۔ اگر ایک نے پہلے عدالت جاکر کیس داخل کردیا قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ سنا دیا پھر دوسرا آکر اپنا شفیع ہونا ثابت کردے تو نصف کا اس کے حق میں فیصلہ کردیا جائے۔

مشتری نے زمین خریدنے کے بعد اس پر عمارت تعمیر کی، یا درخت لگا دیا پھر اس کا شفیع کے حق میں فیصلہ ہوا تو شفیع کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو اس کو خرید لے عمارت کے ملبے اور کٹے ہوئے درختوں کی قیمت کی بقدر قیمت کے ساتھ، یا مشتری کو اٹھانے اور اکھاڑنے پر مجبور کردے۔

شفیع نے قبضہ کرنے کے بعد اس پر تعمیر کی یا درخت لگا دیا۔ پھر اس کا کوئی مستحق نکل آیا تو وہ بائع سے صرف ثمن کے بارے رجوع کرسکتا ہے تعمیر کی قیمت نہیں لے سکتا۔

اگر گھر گر گیا یا جل گیا تو شفیع کو اختیار ہوگا چاہے جمیع ثمن کے عوض خرید لے چاہے ترک کردے اگر مشتری نے گھر کو توڑ دیا اور شفیع کے حق فیصلہ ہوگیا تو شفیع سے کہا جائے گا کہ یا تو صرف زمین کو اسی قیمت پر لے لو ورنہ ترک کردو۔

کسی نے زمین خریدی اور زمین پر لگے کھجور کے درختوں پر کھجوریں لگی ہوئی تھیں اور بیع کے وقت ان کو بھی بیع میں شامل کیا گیا تھا تو شفیع بھی ان کھجوروں کو لے گا۔ اگر مشتری نے خرید کر کھجوریں اتار لی ہوں تو شفیع اس سے وصول نہیں کرسکتا۔

اگر کسی نے پانچ مہینے یا کم یا زیادہ مدت میں ثمن ادا کرنے کے وعدہ پر زمین خریدی، پھر شفیع کے حق میں فیصلہ ہوا تو شفیع کو یہ اختیار ہوگا کہ ثمن فی الحال ادا کر کے زمین پر قبضہ کرے، یا مدت کے مکمل ہونے تک انتظار کرے اور مدت مکمل ہونے پر ثمن ادا کر کے قبضہ کرلے۔ یہ نہیں کرسکتا کہ زمین پر قبضہ پہلے کرلے اور ثمن مشتری کے مقرر کردہ وقت پر ادا کردے۔

کسی نے گھر خریدا اور شفیع نے شفعہ ترک کردیا۔ پھر مشتری نے خیار رویت کی بنا پر یا خیار شرط کی وجہ سے یا خیار عیب کی بنا پر بعد القبض عدالت کے فیصلے کی بنا پر واپس کردیا۔ اب شفیع کو حق شفعہ نہیں ملے گا۔

اگر قضائے قاضی کے بغیر واپس کردیا یا اقالہ کیا تو شفیع کو حق شفعہ حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ اقالہ بائع و مشتری کے لئے فسخ اور شفیع کے حق میں بیع ہے۔ کیوں کہ مبادلۃ المال بالمال ہے جو دونوں کی رضامندی سے ہو رہا ہے۔

کتاب الاجارہ

الإجارہ، اجر یعنی عمل کے بدلے کو کہتے ہیں۔ اجرۃ بھی اسی معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور فقہی اصطلاح میں بیع المنافع (منافع پر معاہدہ) یا عقد علی المنافع بعوض مالی۔ یعنی عوض کے بدلے پر منافع کی بیع کو الاجارہ کہتے ہیں۔ اجارہ جائز ہے۔ مگر قیاس کے اعتبار سے اجارہ جائز نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ منافع ابھی معدوم ہیں اور معدوم کی بیع باطل ہے۔ لیکن شریعت نے لوگوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر اس کی اجازت دیدی ہے اور جس چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اس کو منافع کے قائم مقام رکھ کر عقد کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اجارہ لحہ بہ لحہ بحسابِ حصولِ منفعت منعقد ہوتا رہتا ہے تا کہ انعقادِ عقد استیفاءِ منفعت کے مقترن ہو جائے اور اس طرح معقود علیہ کو حاصل کرنا ممکن ہو سکے۔

اجارہ کا جواز قرآن وسنت سے ثابت ہے، فرمان الٰہی ہے: "فان ارضعن لکم فأ توھن أجورھن" [الطلاق:۶]

دوسری جگہ ارشاد ہے "ورفعنا بعضھم فوق بعض درجت لیتخذ بعضھم بعضا سخریاً" [الزخرف:۳۲]

یعنی ہم بعض کو بعض پر ان کے عمل پر اجر دیکر بڑا درجہ دیں گے۔

اور ارشاد نبوی ہے: "ثلاثة أنا خصمھم یوم القیامة: رجل اعطی بی ثم غدر و رجل باع حرّا فأکل ثمنه، ورجل استاجر أجیر فاستوفی منه ولم یعطه أجره"[1]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک فرمان یہ بھی ہے: "أعط الاجیر أجره قبل أن یجفّ عرقه"[2]

"اجیر کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت اسے عطا کرو۔"

بیع کے لفظ سے اجارہ منعقد نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ بیع کا لفظ اعیان کی تملیک کیلئے وضع ہے۔ جبکہ اجارہ منافع معدومہ کی تملیک کو کہتے ہیں اور اجارہ کی ابتداء معقود علیہ کی حوالگی کے بعد ہوگی۔ اس لئے کہ عین منفعت کو حوالہ کرنا ممکن نہیں تو منفعت حاصل کرنے پر قدرت دینے کو اس کا قائم مقام رکھا گیا۔

---

۱ [بخاری:۴۴۴]　　۲ [بیہقی:۶/۱۲۱]

اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط

اجارہ کے صحیح ہونے کی دو شرطیں ہیں ان کے بغیر اجارہ صحیح نہیں ہوگا۔(۱) منافع معلوم ہوں (۲) اجرت متعین و معلوم ہو۔ دلیل حضور ﷺ کا اجرت بیان کئے بغیر کام لینے سے منع فرمانا ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اجرت بتانے سے پہلے کام لینے سے منع فرمایا ہے۔[۱]

دوسری دلیل یہ ارشاد ہے: "ون استاجر أجيرًا فليعلمه أجره"[۲] "جو شخص کسی سے اجرت کے عوض کام لے تو اس کی اجرت پہلے اس کو بتا دے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک دفعہ مجھے زبردست بھوک لگی۔ میں اجرت پر کام تلاش کرنے کیلئے عوالی مدینہ کی طرف نکل گیا۔ دیکھا کہ ایک عورت کنویں سے پانی نکالنا چاہتی ہے۔ اس نے فی ڈول ایک کھجور کے عوض سے پانی نکالنے کا تقاضا کیا۔ میں نے جب سولہ ڈول نکال لئے تو میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ میں نے اس کے پاس جا کر اپنا ہاتھ دکھایا۔ اس نے مجھے گن کر سولہ کھجوریں دیدیں، میں نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کو بتا دیا۔ آپ ﷺ نے بھی کچھ کھجوریں تناول فرمائیں۔[۳]

اور منافع کا اور اجرت کا معلوم ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں جھگڑے اور منازعت کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

ہر وہ چیز جو بیع میں ثمن بننے کی اہلیت رکھتی ہے وہ اجارہ میں اجرت بن سکتی ہے۔ اس لئے اجرت بھی منفعت کا ثمن ہے۔ اور جو بیع میں قیمت نہیں بن سکتی وہ بھی اجارہ میں اجرت بن سکتی ہے۔ جیسا دودھ پلانے والی دائیہ کی اجرت، کھانا اور کپڑا مقرر کیا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استحساناً جائز ہے اگر چہ بیع میں اس طرح وہ ثمن نہیں بن سکتے۔ اسی طرح حیوان اگر حاضر ہو تو بیع میں ثمن بن سکتا ہے اور اگر دین ہو تو ثمن نہیں بنایا جا سکتا۔

منافع کی پہچان کا طریقہ

منافع کے تعین اور معرفت کی تین صورتیں ہیں۔

پہلی صورت:

استیجار کی صورت کا پہلے عقد میں ذکر کرے مثلاً مکان دکان یا زراعت یا کسی اور غرض

۱ [بیہقی: ۶/۱۲۰] ۲ [بیہقی: ۶/۱۲۰] ۳ [نصب الرایۃ: ۴/۱۳۳]

کیلئے زمین کرایہ پر لی تو شروع میں مدت متعین کر دے کہ کتنی مدت، ایک سال، ایک مہینہ یا دو یا تین مہینے تک کرایہ دار کے پاس رہے گی۔ اس طرح تعین سے مقدار منفعت معلوم ہوگی۔ یہ تب ہے اگر زمین وغیرہ ذاتی مملوک ہو۔ اور اگر مذکورہ چیز ذاتی ملکیت نہ ہو، وقف کی ہو اور ناظم وقف سے بطور کرایہ مکان یا دکان وغیرہ یا زمین مدت معلومہ تک کیلئے لے لی۔ تو ناظم وقف نگرانی کرتا رہے گا۔ اگر مکانات کے کرایے پر اسی حال پر برقرار رہے یا کم ہو گئے تو مدت تک رہنے دیگا اور اگر مکانات کے کرائے بڑھ گئے تو عقد کو فسخ کر کے نیا کرایہ مقرر کرسکتا ہے۔ گزشتہ مدت کا کرایہ تو وہی سابقہ والا ہی لے گا اور آئندہ کیلئے نئے معاہدے کے تحت نیا کرایہ وصول کرتا رہے گا۔

اگر زمینوں کے کرائے بڑھ گئے مگر زمین فی الحال ایسی حالت میں ہے کہ معاہدہ فسخ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً اس پر فصل لگی ہوئی ہے تو یہ ہوگا جب کرائے بڑھے تھے اس وقت تک سابقہ کرایہ اور کرائے بڑھنے کے بعد سے تکمیل مدت تک اجرت مثلی ہوگی۔ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اوقاف کی زمینوں اور مکانوں کو طویل المدت کیلئے کرائے پر دینا جائز نہیں ہے تاکہ کرایہ دار اس کی ملکیت کا دعویٰ نہ کر سکے۔ زمین میں تین سال سے زیادہ اور منقولہ اشیاء میں ایک سال سے زیادہ مدت کیلئے دینا طویل مدت ہے جو جائز نہیں ہے۔ یتیم کی زمین کا بھی یہی حکم ہے۔ کرایوں کے بڑھنے کا اعتبار آس پاس کے تمام مکانوں کے کرائے بڑھنے سے ہوگا۔ کہیں ایک دو مکانوں کے کرائے بڑھا دیئے گئے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

علامہ خجندی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر ایک شخص نے ایک گھر ایک مہینے کیلئے کرایہ پر لیا ہے اگر معاہدہ مہینے کے شروع میں ہوا ہے تو تمام مدت کا اعتبار چاند کے حساب سے ہوگا یعنی چاند نظر آئے تو مہینے کی مدت پوری ہوگی اگرچہ انتیس دن ہوں اور اگر معاہدہ درمیانِ مہینے میں ہوا ہو تو پھر پورے تیس دن کے بعد مدت مکمل ہوگی اور اگر سال کے معاہدے کے ساتھ کرایہ پر لیا ہے اگر مہینہ کی ابتداء میں معاہدہ ہوا ہے تو پورے بارہ مہینے چاند کے حساب سے ہوں گے بالاتفاق اور اگر معاہدہ مہینے کے کچھ ایام گزرنے کے بعد ہوا ہے تو سال کے تین سو ساٹھ دن پورے ہونے کے بعد مدت تمام ہوگی یہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور حضرات صاحبینؒ کے نزدیک چاند کے حساب سے گیارہ مہینے جبکہ ایک مہینہ دنوں کے حساب سے مدت ہوگی۔

منافع کی معرفت کی دوسری صورت:

منافع کو مقرر کرنا مثلاً ایک شخص نے کپڑے سلوانے کے لئے درزی کی خدمات حاصل

کیں۔ اور کپڑے کی نوعیت کہ ریشم، کھدر یا اون کا ہے اور فی کپڑا کتنی اجرت دے گا اس کا بھی تعین کرلیا اس طرح منفعت معلوم ہوگئی اور عقد صحیح ہوگا۔ گاڑی، سائیکل یا موٹر سائیکل کرایہ پر لیتے ہوئے مدت کی تعین کرنا چاہئے۔ یا جس جگہ جانا چاہتا وہ جگہ بتادے مدت یا جگہ کا تعین نہ ہو تو اجارہ جائز نہ ہوگا اور عقد باطل ہوگا۔

تیسری صورت:

اشارے سے منافع کا علم ہوتا ہے اور معقود علیہ کی تعیین ہوتی ہے۔ جیسے ایک شخص نے کسی کا سامان ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری متعین جگہ تک پہنچانے کیلئے کہا۔ چنانچہ اٹھائے جانے والے کو دکھانا اور جہاں پہنچانا ہے اس کی تعیین ضروری ہے، اگر ان چیزوں میں سے ایک بھی مفقود ہوگئی تو عقد اجارہ باطل ہوجائے گا۔ اور عقد کے وقت سامان چڑھانے اور اتارنے کا تذکرہ نہ ہوا ہو تو یہ اجیر کی ذمہ داری ہوگی۔ کیوں کہ سامان کو اتارنے سے کام مکمل ہوتا ہے۔

مکانات، محلات، دکان اور ہوٹلوں کو کرایہ پر لینا جائز ہے اگرچہ کرایہ پر لیتے ہوئے یہ نہ بھی بتایا جائے کہ اس کے اندر کیا عمل کریگا۔ اس لئے کہ جو جس کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ بظاہر وہی کام اس میں ہوگا۔ وہی مراد ہوگا۔ مستاجر ہر کام اس میں کرسکتا ہے جس میں عمارت کو نقصان نہ ہو۔

گھر کرایہ پر لینے کے بعد کرایہ دار کو اختیار ہوگا۔ اس میں جس کو ٹھہرانا چاہے ٹھہرا سکتا ہے۔ اور خود بھی رہ سکتا ہے حتیٰ کہ آگے کسی اور کو اس کرائے سے زاید کرائے پر دے سکتا ہے جو وہ مالک کو دے رہا ہے۔ البتہ اس سے زائد کو استعمال کرنا اس کے لئے بہتر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس کو گھر کی تعمیر وغیرہ میں استعمال کرے تو جائز ہے۔

کسی نے رہنے کیلئے مکان کرائے پر لے لیا اور گھر کی چابیاں اس کے ہاتھ میں دے دی گئیں اب اس نے اس میں رہائش رکھی یا نہیں بہرصورت کرایہ ادا کرنا اس پر لازم ہوگا، الا یہ کہ حکومت وقت یا کسی اور وجہ سے اس میں رکاوٹ ہو تو کرایہ دینا لازم نہیں ہوگا۔ غیر منقول چیز کو کرایہ پر لیکر اس پر قبضے سے پہلے آگے کرائے پر دینا جائز نہیں ہے۔ جیسا کے بیع میں مبیع پر قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ غیر منقول کو کرایہ پر لیکر قبضہ سے پہلے کرایہ کیلئے دینا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے البتہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اس کو جائز نہیں کہتے۔ بعض نے کہا تینوں حضرات کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

زراعت کیلئے زمین کرایہ پر لینے کا حکم

کاشت کاری کیلئے زمین کرایہ پر لینا جائز ہے لیکن صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ جو اس میں کاشت کریگا وہ عقد کے وقت واضح کر دے، کیوں کہ بعض کاشت سے زمین کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس لئے عقد اجارہ کے وقت جو فصل کاشت کرے اس کی تعیین کرے۔ تاکہ بعد میں باعث جھگڑا نہ ہو۔ یا صاحب زمین خود کہہ دے، جو بھی کاشت کرو، اجازت ہے۔ تب بھی صحیح ہے کیوں کہ اس سے جہالت مرتفع ہوگئی جو باعث نزاع بن سکتی تھی اگر عقد اجارہ منعقد ہونے کے بعد مالک زمین اور مستاجر کے درمیان کاشت کرنے کی نوعیت کے متعلق اختلاف ہو جائے، تو ہر ایک کو حق فسخ حاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو اس شرط پر یہودیوں کو دیا کہ وہ اس پر کاشت کریں اور اس میں کچھ حصہ ان کیلئے ہوگا[1] مستاجر کو زمین تک پہنچنے کیلئے راستہ اور زمین کو سینچنے کیلئے پانی دینے کا حق ملے گا۔

گاڑیاں کرائے پر لینے کا حکم

سواری کیلئے کرایہ پر گاڑیاں لینا جائز ہے اور حمل برداری کیلئے بھی، کیوں کہ یہ معلوم منفعتیں ہیں۔ موجر صرف مستاجر کو سواری کرنے کی شرط لگا سکتا ہے لہٰذا مستاجر کسی اور کو سوار کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ کیوں کہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے اور انداز سواری ہر ایک کا جدا ہوتا ہے۔ تو صرف مستاجر کیلئے چلانے کی شرط پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوگا۔ شرط کے باوجود مستاجر نے غیر کو چلانے کی اجازت دی اور وہ ٹکرا گئی۔ تو گاڑی کی قیمت کا ضامن ہوگا اگر مستاجر خود سوار تھا تو ضامن نہیں ہوگا۔

اسی طرح بار برداری کیلئے گاڑی کرایہ پر لی اور بار کی مقدار اور اس کی نوعیت کو واضح کر دیا تو اس مقدار اور نوع کی کوئی بھی چیز بھی اس پر لوڈ کر سکتا ہے اس صورت میں اس کے کسی عمل کے بغیر خود گاڑی کو نقصان پہنچا تو یہ ضامن نہیں ہوگا۔ اگر معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقدار سے زیادہ سامان لوڈ کیا اور گاڑی کا نقصان ہو گیا تو مستاجر ضامن ہوگا۔ اگر کسی شخص نے گاڑی یا اور کوئی سواری اس معاہدے کے تحت کرایہ پر حاصل کی کہ وہ اس میں اتنے من چینی لادے گا۔ اگر مقدار مقررہ سے زیادہ لادے اور گاڑی کا نقصان ہو جائے تو جتنی مقدار زائد بوجھ ڈالا تھا اسی مقدار کی بقدر ضامن ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے نقصان کا سبب ماذون اور غیر ماذون ہے اور

[1] [بخاری ۳۴۸]

ہلاکت کا باعث بوجھ ہوا لہٰذا جتنا زیادہ ہوا وہ اس کی بقدر ضامن ہوگا۔ اگر مقام متعین تک جانے کیلئے گاڑی لی اور اس مقام سے آگے نکل گیا تو یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی اور خلاف ورزی کی صورت میں ضامن ہوگا۔ پھر واپس لوٹ کر گاڑی مالک کو سپرد کیا تو صرف جانے کی اجرت اس پر لازم ہوگی، آنے کی نہیں ہوگی کہ جب اجرت میں آنے جانے کا معاہدہ ہوا ہو، آنے کی اجرت اس لئے واجب نہیں ہوئی کہ اس نے مقررہ جگہ سے تجاوز کر کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ جس کی وجہ سے اس پر ضمان لازم ہوگا۔ حنفیہ کے نزدیک اجرت اور ضمان دونوں جمع نہیں ہوں گے۔

ایک متعین مقام تک جانے کیلئے گاڑی اجرت پر لی، مگر گیا نہیں اور گاڑی کو اپنے پاس محبوس رکھا اور وہ کسی حادثہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی تو اس کا ضمان اس پر واجب ہوگا اجرت نہیں۔ ضمان اس لئے واجب ہوگا کہ اس نے معاہدے کے خلاف کیا۔ اس طرح گاڑی لی ایک جگہ کیلئے اس پر سوار ہوکر دوسری جگہ چلا گیا اور حادثہ کا شکار ہوگیا تو اس پر ضمان واجب ہوگا اگر چہ قریب جگہ پر کیوں نہ لے جائے کیوں کہ اس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اگر کسی مکان معلوم تک جانے کیلئے گاڑی لی وہاں تک گیا مگر معروف راستے سے نہیں کسی دوسرے راستے لے گیا۔ گاڑی کو حادثہ ہوا تو ضامن نہیں ہوگا بشرطیکہ لوگ بطور راستہ اس کو بھی استعمال کرتے ہوں اور اگر ایسے راستے سے گیا جس پر عام لوگ نہیں چلتے اور گاڑی خراب ہوگئی تو ضامن ہوگا۔

اجیر کا ضمان

اجیر کی دو قسمیں ہیں: (۱) اجیر مشترک (۲) اجیر خاص

اجیر مشترک کام سے پہلے اجرت کا مستحق نہیں ہوتا۔ اور وہ کسی مخصوص ایک کے لئے کام نہیں کرتا اس کا کام کسی خاص وقت کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ جیسے ڈاکٹر، حکیم، ٹرانسپورٹ کمپنیاں اور درزی وغیرہ، چیزیں ان کے ہاتھوں میں امانت ہوتی ہیں۔ اگر ان کی طرف سے زیادتی کے بغیر ہلاک ہو جائیں تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ ضامن نہیں ہوں گے اگر چہ ضمان کی شرط لگا بھی دی جائے کیوں کہ امانت میں ضمان کی شرط لگانا شریعت کے تقاضے کے خلاف ہے۔ تو شرط باطل ہوگی۔ دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔ فرمایا: "لاضمان علی مؤتمن"[1] "جس کے پاس امانت رکھی جائے اس پر کوئی ضمان نہیں"

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے اموال کی حفاظت کیلئے اجیر مشترک پر ضمان لگایا جائے گا۔ کیوں کہ اجیروں کو جب ضمان کا علم ہوگا تو وہ احتیاط

[1] [دار قطنی: ۳/۴۱]

اور حفاظت سے کام کریں گے۔

بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اجیر مشترک کو ضامن قرار دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رنگریز اور کاریگر کو ضامن بناتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اسکے بغیر لوگوں کو نقصان ہونے کا خطرہ ہوگا [1]۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالہیثم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ بصرہ سے ان کے پاس تیل کی ایک بوتل آئی اور بوتل کی قیمت تین سو یا چار سو تھی۔ انہوں نے ایک مزدور سے اجرت کے عوض اٹھا کر گھر پہنچانے کا معاہدہ کیا اور بوتل مزدور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔ انہوں نے اس سے ضمان کا مطالبہ کیا۔ مقدمہ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں پہنچا، قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اجرت اس لئے دی جاتی ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے اور خلاف ورزی کی صورت میں ضمان دے، قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ضمان واجب کر دیا [2]۔ مگر فتویٰ پھر بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے۔ لیکن ''صاحب الدر'' نے لکھا ہے، متاخرین فقہاء نے نصف قیمت پر صلح کرنے پر فتویٰ دیا ہے۔ اور ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ اگر اجیر صالح آدمی ہے تو ضمان نہیں اور اگر صالح نہیں ہے تو ضمان ہے اور اگر مستور الحال ہے تو تب ضمان ادا کرنے پر اسے مجبور کر دیا جائے گا۔ اجیر مشترک کے فعل سے جو تلف ہو جائے اس کی ضمان اس پر واجب ہوگی۔ کیوں کہ اس کے عمل سے تلف ہوا ہے۔ الا یہ کہ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود تلف ہو تو ضمان نہیں ہوگی اور اگر جان بوجھ کر لاپرواہی کی ہے تو تاوان واجب ہوگی۔ آپریشن کرنے والا ڈاکٹر مرض کی جگہ سے متجاوز نہیں ہوا مگر پھر بھی مریض جانبر نہیں ہوا اور ہلاک ہوگیا تو اس پر کوئی تاوان نہیں ہوگا اور اگر بیماری کی جگہ سے تجاوز کر لیا اور مریض ہلاک ہوگیا تو تاوان آئے گا۔ اس لئے کہ اس جگہ سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ حکم اس وقت ہے جب مریض یا اس کے ذمہ دار سرپرست سے آپریشن کی اجازت لی گئی ہو۔ اگر مریض کی اجازت کے بغیر آپریشن کرے اور مرض کے مقام سے تجاوز بھی نہیں کیا اور مریض ہلاک ہوگیا تو ضمان واجب ہوگا۔

اگر ختنہ کرنے والے نے ختنہ کرتے ہوئے بچے کا حشفہ (عضو تناسل کا وہ حصہ جو کھال کٹنے کے بعد ظاہر ہو) کاٹ دیا اور بچہ مرگیا تو اس پر نصف دیت لازم ہوگی اور اگر بچہ مرا نہیں تو پوری دیت ادا کرے گا۔ مرنے کی صورت میں نصف دیت اس لئے واجب ہے کہ اس کی موت دو چیزوں سے واقع ہوئی۔ ایک کھال کٹنے اور دوسرا حشفہ کٹنے سے ان میں سے پہلے کی اجازت تھی دوسرے کی نہیں جس کی ضمان ہوگی اور ٹھیک ہونے کی صورت میں کھال کٹنا گویا ہوا ہی نہیں اور حشفہ

---

[1] [الدار قطنی ۳/۴۱] [2] [الدار قطنی ۳/۴۱]

کاٹنے کی اجازت نہیں تھی تو ذکر کاٹنے پر پوری دیت ہے کیوں اس کی افادیت ختم ہوگئی۔

(۲) اجیر خاص:

مدت متعینہ میں اپنے آپ کو مستاجر کے حوالہ کرنے کی صورت میں اجرت کا مستحق ہوگا اگرچہ کام نہ بھی کیا ہو۔ جیسے کسی ادارے یا خاص شخص کا ملازم۔ اس میں معقود علیہ خود کو مستاجر کے حوالے کرتا ہے لہٰذا اس مدت میں کسی اور کیلئے کام کرنا جائز نہیں ہوگا مدت میں خود کو اس کے حق میں محبوس رکھنے کے عوض اجرت ملے گی۔ کام ہو یا نہ۔ ڈیوٹی میں حاضری ضروری ہے۔

کسی نے خاص اپنی خدمت کیلئے کسی کی خدمات حاصل کیں اور شرط لگائی کہ وہ کسی اور کی خدمت نہیں کرے گا۔ اگر اجیر نے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے کسی اور کی خدمت کی تو اس کی تنخواہ سے اتنی مدت کی اجرت کی بقدر کمی کر دی جائے گی اگر اجیر خاص سے کوئی چیز تلف ہو جائے تو اس پر کوئی ضمان وتاوان نہیں ہوگا۔ مثلاً اس سے چوری ہوگئی یا کسی نے اس سے غصب کرلیا۔ اس طرح خود اس کے عمل سے تلف ہو جائے تب بھی ضمان نہیں ہوگی بشرطیکہ اس نے طریقے اور اصول کے مطابق عمل کیا اور اگر بے طریقہ کرنے کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے تلف ہو جائے تو ضمان واجب ہوگی۔

اگر ہسپتال کے مالک نے کسی نرس کو مریضوں کو طریقے کے مطابق دوا دینے کیلئے اور ان کی نگاہ داشت کے غرض سے ملازم رکھا اور اس نے مریض کو غلط دواء دی یا مکسنگ میں غلطی کی جس کی وجہ سے کئی مریض جاں بحق ہوگئے تو وہ ضامن نہیں ہوگی اور اجرت بھی اس کو ملے گی۔ البتہ ہسپتال کا مالک ضامن ہوگا کیونکہ نرس یا ڈسپنسر اجیر خاص ہے۔

اجیر کب اجرت کا مستحق ہوگا

معقود علیہ (منفعت) کے حصول یا عقد میں اجرت پہلے دینے کی شرط لگائی ہو تو اجرت دی جائے گی۔ صرف نفس عقد سے اجرت کا مستحق نہیں ہوگا۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ "أعط الاجيرأ جره قبل ان يجفّ عرقه"[1] "مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت اس کو دیدو" اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کام سے فارغ ہوتے ہی اجرت دے دینی چاہیے۔ اس لئے کہ پسینہ کام کرنے پر نکل آتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صرف عقد سے منفعت کا استیفاء ممکن نہیں۔ کیوں کہ یہ لحہ بہ لحہ حاصل ہوتا رہتا ہے اور یہ ہے بھی عقد معاوضہ تو برابری کا

---

[1] البیہقی ۱۲۱/۲

متقاضی ہے۔تو نفس عقد سے اجرت واجب نہیں ہوگی۔ جب وہ اپنا کام مکمل کرے تو معقود علیہ (منفعت) کا مستحق ہو جائے گا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہلے اس کے قائل تھے۔ پھر اس قول سے رجوع فرمایا۔اجیر روزانہ اپنی اجرت کا مطالبہ کرسکتا ہے کیوں کہ تھوڑا تھوڑا کر کے منفعت وجود میں آتی ہے اور حضرات صاحبینؒ کا یہی قول ہے اگر عقد میں وصول اجرت کا وقت متعین کر دیا گیا تو عقد کے معاہدے کے تحت عمل کیا جائے گا۔ اگر کرایہ پر دینے والا عقد کے اندر کرایہ پہلے وصول کرنے کی شرط لگا دے تو اس کو حق حاصل ہوگا کہ کرایہ وصول کرنے تک مکان حوالہ نہ کرے۔ منافع کی حیثیت بیع کی سی ہے اور اجرت ثمن کی طرح، جس طرح بائع کو حصول ثمن تک مبیع کو اپنے پاس رکھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح مؤجر کو بھی حصول اجرت تک مکان کو حوالہ نہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس طرح اگر کرایہ دار وقت سے پہلے کرایہ ادا کرے تو موجر (کرایہ پر دینے والا) اس کا مالک ہوگا یہ ایسا ہے جس طرح مؤجل دین کو وقت مقرر سے پہلے ادا کیا جائے۔ اگر گھر مستاجر کے حوالہ کرنے سے پہلے منہدم ہوگیا یا اس کا کوئی حقدار نکل آیا جس نے مکان واپس لے لیا یا مستاجر کا یا موجر کا انتقال ہوا تو مالک مکان پر وصول کردہ اجرت واپس کرنا ضروری ہوگا۔

کن چیزوں سے اجارہ فاسد ہوتا ہے؟

ان تمام شرطوں سے اجارہ فاسدہ ہوتا ہے جن شرطوں پر بیع فاسد ہو جاتی ہے اور یہ وہ شرطیں ہیں جو مقتضاءِ عقد کے خلاف ہوں اور جس غیر واضح بات سے بیع میں فساد آتا ہے اجارہ بھی اس سے فاسد ہو جاتا ہے۔ مثلاً معقود علیہ میں جہالت ہو یا اجرت یا مدت مجہول ہو کیوں کہ عقد میں جہالت منازعت و خلفشار کا باعث ہوتی ہے۔

اگر اجیر خاص کیلئے شرط لگا دے کہ جو اس کے فعل سے تلف ہوگا اس کا تاوان اس پر ہوگا یا اجیر مشترک کیلئے شرط لگا دے کہ اس کے فعل کے بغیر جو تلف ہوگا تو اس کی ضمان اس پر واجب ہوگی تو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عقد اجارہ فاسد ہو جائے گا۔ جب اجارہ فاسد ہو جائے تو اجیر و مستاجر کے درمیان طے شدہ اجرت واجب نہیں ہوگی بلکہ اجرت مثلی واجب ہوگی۔ یعنی اس جیسے کام کی جو اجرت مارکیٹ میں ہے وہی واجب ہوگی۔ طے شدہ ثمن یا اجرت جب واجب ہوتی ہے جب عقد صحیح ہو۔

اگر مستاجر ایسی شرط لگا دے جو عقد کے تقاضے کے موافق ہو تو عقد اجارہ فاسد نہیں ہوگا: جیسے اجیر مشترک کیلئے یہ شرط کہ اگر اس کے فعل سے تلف ہو جائے تو ضمان واجب ہوگی۔ اسی طرح

عقد اجارہ میں خیار الشرط جائز ہے کیوں کہ یہ عقد معاوضہ ہے اور اقالہ سے فسخ کرنا درست ہے جیسا کہ بیع میں جائز ہے۔

چند مسائل

اگر کوئی نوکر رکھے تو اس کو اپنے ساتھ سفر پر مجبور نہیں کرسکتا، ہاں اگر عقد کے معاہدہ میں شامل ہو تو اور بات ہے۔ اگر کوئی شخص دن کے وقت خاص اپنی خدمت کیلئے ملازم رکھے، تو طلوع فجر سے لیکر سونے کے وقت تک ڈیوٹی دینا اس پر لازم ہے اور اس کے فرائض میں کپڑے دھونا، کھانا پکانا، دوسرے کام کاج مہمانوں کی خدامت داخل ہے، البتہ عورت کو ملازمہ رکھنا فتنے میں پڑنے کے خطرے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ اجیر مشترک کیلئے کام کی تکمیل سے پہلے اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔ ہاں اگر عقد کے شروع میں اجرت پہلے لینے کی شرط لگائی ہو تو مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

اگر کسی شخص کو ولیمہ کا کھانا پکانے کیلئے اجیر رکھے، تو سالن نکالنے کی ذمہ داری پکانے والے پر ہوگی کیوں کہ کام کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے۔ اگر کھانا خراب ہو جائے یا جل جائے یا کچا رہ جائے تو باورچی ذمہ دار ہوگا۔ اور اگر کسی کو گھر کا کھانا پکانے کیلئے ملازم رکھے تو سالن نکالنا اس کے فرائض میں شامل نہیں ہوگا۔ اگر اس کے آگ زیادہ جلانے کی وجہ سے گھر کو آگ لگ جائے اور جل جائے تو وہ ضامن نہیں ہوگا اس لئے کہ آگ جلائے بغیر کام کرنا اس کے لئے ممکن نہیں اور اسے آگ جلانے کی اجازت بھی ہے اور گھر مین کسی فرد کے جل جانے سے صاحب مکان پر کوئی تاوان بھی نہیں آئے گا۔

ٹرانسپورٹ کمپنی کا نمائندہ یہ کہے کہ یہ سامان اگر آپ چاہتے ہیں کہ آج پہنچ جائے تو ایک ہزار روپے لیکر پہنچایا جائے گا اگر دو دن بعد پہنچ جائے تو پانچ سو روپے وصول کیا جائے گا۔ اگر صاحب سامان منظور کرے تو معاہدے کے موجب آج پہنچا دیا تو ہزار کا مستحق ہوگا۔ اور اگر دو دن بعد میں پہنچائے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسمی (پانچ سو) واجب نہیں ہوگا بلکہ اجر مثل واجب ہوگا مگر وہ پانچ سو سے نہیں بڑھے گا۔

کسی نے مدت مقرر کئے بغیر ایک مکان کرایہ پر لیا یہ کہہ کر کہ ماہانہ تین ہزار روپے کرایہ دوں گا تو ایک مہینے میں عقد صحیح ہوگا اور باقی مہینوں میں عقد فاسد ہوگا ہاں اگر کل مدت یعنی کل مہینے متعین کر کے کہہ دے ماہانہ تین ہزار کرایہ ہوگا تو سب میں عقد درست ہوگا۔ کیوں کہ پہلی صورت میں اجارہ مجہول ہے اس لئے صحیح نہیں ہوگا اور ایک ماہ میں صحیح اس لئے ہوگا کہ وہ معلوم ہے اور دوسری

صورت میں مدت کی تعیین سے جہالت رفع ہوگئی تو عقد اجارہ درست ہوگا۔ البتہ پہلی صورت ایک مہینہ مکمل ہونے کے بعد دوسرے مہینے کا ایک گھنٹہ اس میں سکونت پذیر ہوتے ہوئے گزر گیا تو اس میں بھی عقد صحیح ہوگا کہ مالک مکان کو جب یہ مہینہ پورا نہ ہو نکالنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

اور اگر ایک بلڈنگ دکان یا مکان ایک سال کی مدت کیلئے ۲۰ ہزار روپے کے عوض کرایہ پر لی تو یہ عقد درست ہے۔ اگرچہ ماہانہ اجرت کی مقدار مقرر بھی نہ کی ہو۔ اگر یہ عقد مہینہ کے شروع میں ہوا ہو تو سارے سال کے مہینوں کا اعتبار چاند کے حساب ہوگا۔ اور اگر یہ معاہدہ مہینے کے درمیان کسی دن میں ہوا ہو تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دنوں کے حساب سے ہوگا یعنی سال کے تین سو ساٹھ دن پورے مراد ہوں گے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پہلا مہینہ تو ایام کے اعتبار سے گنا جائے گا اور باقی مہینے چاند کے حساب سے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں مروی ہیں ایک امام اعظمؒ کے موافق جبکہ دوسری روایت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے موافق۔

جن کاموں پر اجرت لینی جائز نہیں

سانڈ کی جفت کرانے کی اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جفتی کا عوض وصول کرنے سے منع فرمایا۔"[1]

اذان، اقامت، حج، امامت، تعلیم قرآن اور تعلیم فقہ پر اجرت حاصل کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ یہ افعال کرنے والے کیلئے عبادات ہیں اور عبادت کر کے کسی سے اجرت نہیں لی جاتی جیسے نماز پڑھ کر اور روزہ رکھ کر اس کی اجرت لینا جائز نہیں اسی طرح مذکو میں بھی۔

دلیل:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے: "إقرؤا القرآن ولا تأكلوابه ولا تستكثروابه، ولا تجفواعنه، ولاتغلوا فيه"[2]

دوسری دلیل:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے اہل صفہ کے کچھ احباب کو قرآن کریم پڑھایا ان میں سے ایک صاحب نے مجھے ایک کمان ہدیہ کی۔ میں نے کہا یہ مال نہیں ہے میں اس کے ذریعے اللہ کے راستے میں تیراندازی کروں گا۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

[1] [ابوداؤد: ۳/۲۶۷]　[2] [ابوداؤد: ۷/۲۶۴]

خدمت میں حاضر ہوا کہ پوچھ لوں۔ چنانچہ میں نے خدمت نبوی میں آ کر عرض کیا یا رسول اللہ! ﷺ جن لوگوں کو میں نے قرآن پڑھایا ان میں سے ایک صاحب نے ایک کمان مجھے ہدیہ عطا کی۔ وہ مال تو ہے نہیں میں اس کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ میں تیر اندازی کروں؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ان کنت تحب ان تطوق طوقامن نارفأ قبلها"[1] "اگر جہنم کی آگ کا طوق گردن میں ڈالنا پسند ہے تو اسے قبول کرلو۔"

تیسری دلیل:

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ مجھے میری قوم کا امام بنا دیجئے۔ فرمایا: کمزور کی طرح نماز پڑھاؤ" (یعنی ہلکی نماز) اور ایسا مؤذن اختیار نہ کرو جواذان دینے پر اجرت لیتا ہو۔"[2]

اگر کسی شخص کو حج بدل کرنے کیلئے رقم دی جائے تو اپنے نفقہ اور آمد ورفت کے خرچہ کے علاوہ اور کوئی معاوضہ نہیں لے سکتا باقی رقم واپس کر دے گا۔

لیکن صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بعض مشائخ نے اس زمانے میں قرآن پڑھا کر اجرت لینے کو مستحسن قرار دیا ہے۔ کیوں کہ آج کل دینی امور میں کمزوری اور سستی آ گئی ہے اگر اجرت کو منع کیا جائے تو حفظ قرآن کریم کا سلسلہ ہی بند ہو جائے گا۔ فتوی اسی قول پر ہے۔ فقہاء متاخرین نے امامت، فقہ پڑھانے، کسی مردے کی طرف سے حج بدل کرنے پر اجرت لینے کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح اذان، اقامت، پر اجرت لینے کو بھی جائز قرار دیا ہے اور اس کے جواز پر فتویٰ دیا ہے۔ یہ حضرات حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: صحابہ کرام کی ایک جماعت عرب کے قبائل کی کسی بستی میں گئی۔ گاؤں والوں سے کچھ کھانا کھلانے کا تقاضا کیا۔ انہوں نے میزبانی سے انکار کیا۔ اس دوران قبیلے کے کسی سردار کو سانپ ڈس گیا تو اس کے پاس آ کر کہنے لگے: ہمارے سردار کو سانپ نے ڈسا ہے اگر تمہارے پاس کوئی دوا دارو یا جھاڑ پھونک ہو تو کر دیجئو، حضرات صحابہ نے کہا: ہم نے تم لوگوں سے کھانا کھلانے کا تقاضا کیا اور تم نے انکار کیا۔ ہم دم نہیں کریں گے جب تک تم لوگ اس کی اجرت نہ دو گے۔ وہ لوگ بکریوں کا ایک گلہ انہیں دینے کیلئے تیار ہو گئے۔ تو ایک صحابی نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر اپنا تھوک مجتمع کر کے اس جگہ پر لگا دیا تو وہ ٹھیک ہو گیا وہ لوگ بکریاں لیکر حاضر ہو گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم حضور ﷺ سے پوچھے بغیر انہیں وصول نہیں کریں گے۔ چنانچہ خدمت اقدس ﷺ میں آ کر

---

۱ [معجم الطبرانی: ۵/۴۳۵] ۲ [مسند احمد ۵/۱۲۵]

صورت حال بتادی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبسم فرمایا، اور فرمایا اس کے ذریعے دم کرنے کو تمہیں کس نے بتایا؟ بکریاں وصول کرو اور میرے لئے بھی ان میں حصہ کرلو۔[1]

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے نصوص کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو منع فرمایا: امام زہری رحمۃ اللہ علیہ، ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ بن راہویہ اس قول کی طرف گئے ہیں اور علماء کی دوسری جماعت کا کہنا ہے۔ قرآن پڑھا کر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ پہلے اجرت لینے کی شرط نہ لگائے۔ یہ قول امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور ایک جماعت قرآن پڑھا کر اجرت کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے۔ اس قول کے قائل امام عطاء رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ حضرات حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا تھا جس نے ایک عورت کو خطبہ نکاح دیا تھا مگر مہر کیلئے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ "زوجتکھا علی مامعک من القرآن" "قرآن کا جو علم تیرے پاس ہے اس کے عوض اس عورت کا نکاح میں نے تیرے ساتھ کرادیا۔"

البتہ جہاد پر اجرت لینا بالاتفاق جائز نہیں۔ اس لئے کہ اجیر جب عین جہاد کے میدان میں حاضر ہو جائے تو خود اس پر فرض عین ہو جائے گا۔ فرض عین کی ادائیگی پر بالاتفاق اجرت نہیں لی جاتی۔ میت کو نہلانے، اٹھا کر قبرستان لے جانے اور قبر کھودنے کی اجرت لینا جائز نہیں اگر ان کے علاوہ اور کوئی موجود نہ ہو یہ اعمال اس پر ضروری ہے۔ ہاں اس کے لئے اور لوگ بھی موجود ہوں تو اجرت لینا جائز ہے۔ قبر پر قرآن پڑھوانے کیلئے ایک متعین مدت کیلئے کسی کو اجرت پر مقرر کرنے کے جواز وعدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے جائز اور بعض نے عدم جواز کا قول کیا ہے اور فتویٰ عدم جواز پر ہے۔ گانے بجانے، نوحہ کرنے اجرت مقرر کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ افعال معصیت ہیں۔

قاضی کیلئے اپنے سامنے حد لگانے کے لئے اجرت دینا جائز نہیں۔

ہاں اگر مستقل ملازم رکھا جائے تو جائز ہے۔ کیوں کہ عقد مدت معلومہ پر واقع ہوتا ہے عمل کرے یا نہ کرے اور مدت معلوم ہے اور محض مارنے کیلئے اجارہ مجہول ہونے کی وجہ سے درست نہیں۔

---

[1] [بخاری: ۱۲۳۱]

مشترک چیز کا اجارہ

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مشترک چیز میں عقد اجارہ صحیح نہیں ہے الا یہ کہ دونوں شریک متفق ہو کر اجرت پر دیدیں تو درست ہے چاہے وہ قابل تقسیم ہو یا نا قابل تقسیم۔ شریک کے بغیر کوئی بھی مستاجر کے حوالہ نہیں کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک گھر میں دو شریک ہیں۔ ایک نے شریک کے بغیر دوسرے کے ہاتھ اپنا حصہ کرایہ پر دے دیا تو یہ جائز نہیں ہے اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے۔ وہ کہتے ہیں اپنا حصہ خالی کر کے حوالہ کرنا ممکن ہے۔

اگر کسی کاریگر کے عمل کا اثر ظاہر موجود ہو تو کام کرنے کے بعد اجرت حاصل کرنے تک اس کو اپنے پاس محبوس رکھنے کا اختیار ہے۔ اس طرح درزی کو بھی اختیار حاصل ہے کہ کپڑوں کو سینے کے بعد سلائی کی اجرت وصول کرنے تک کپڑوں کو اپنے پاس روکے رکھے۔ اگر اپنے عمل کی اجرت حاصل کرنے کی غرض سے اس کو اپنے پاس روکے رکھا اور وہ آفت ناگہانی کی نذر ہو گیا اور اس میں اس کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہو تو اس پر کوئی تاوان نہیں آئے گا۔ کیوں کہ روکنے میں وہ تعدی کرنے والا نہیں ہے۔ البتہ مالک کے حوالہ نہ کرنے کی وجہ سے اس کے عمل کا کوئی اجر اس کو نہیں ملے گا۔ کیوں معقود علیہ قبل التسلیم ہلاک ہو گیا اور حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک وہ ضامن ہوگا۔ اس لئے کہ روکے رکھنے سے پہلے وہ اس کے ہاتھ قابل ضمان ہے تو روکنے کی وجہ سے وہ بطریق اولیٰ ضامن ہوگا۔ البتہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے اختیار رہوگا۔ چاہے تو بننے سے پہلے کی قیمت ادا کرے اور کاریگر کیلئے کوئی اجرت نہیں ہوگی۔ چاہے بننے کے بعد کی قیمت لے لے اور کاریگر کی اجرت ادا کرے اور اگر کام کرنے والے کے کام کا اثر ظاہر نہ ہو تو اجیر کو اسے روکنے کا حق نہیں ہوگا۔ جیسے بار بردار کہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پہنچانے سے اس شے پر کوئی ظاہری اثر نہیں اور یہاں معقود علیہ (جس پر معاہدہ ہوا) محض عمل ہے لہٰذا تو اس کو روکنے کا تصور نہیں ہے۔ اس قسم کا اجیر اگر اس کو روکے اور وہ اس کے پاس ہلاک ہو جائے تو اس پر تاوان کے واجب ہونے اور نہ ہونے میں علماء مختلف الاقوال ہیں بعض تاوان کے قائل اور بعض قائل نہیں ہیں۔

عمل کو اجیر کے کرنے کے ساتھ مشروط کرنا

اگر مستاجر اجیر پر یہ شرط لگائے کہ کام وہ خود کرے گا دوسروں سے نہیں کرائے گا تو اجیر کیلئے دوسروں سے کام لینا جائز نہیں ہوگا۔ اگر شرط نہیں لگائی مثلاً درزی سے کہا یہ کپڑا میرے لئے

سی دو تو درزی کو اختیار ہوگا کہ خود سی دے یا اپنے کاریگروں سے سلوا دے۔

اجرت مقرر کیئے بغیر کام کرانا

اگر اجرت کا تعین نہ ہو تو عقد اجارہ فاسد ہے۔ کام کرنے کی صورت میں اجرتِ مثلی واجب ہو جائے گی البتہ صرف تخلیہ سے اجرت واجب نہیں ہوگی جب تک عمل سامنے نہیں آئے گا۔ اور اجرت صحیحہ میں کام کر کے خود کو فارغ کرنے سے بھی اجرت واجب ہوگی۔ عمل کرے یا نہ کرے یا فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔

اجارے کی نوعیت میں اختلاف

کام کرانے والے کا اگر کاریگر سے اختلاف ہو جائے اور کام کرانے والا کاریگر سے کہہ دے کہ میں نے تو تمہیں کہا تھا کہ اس طرح بنا دو، اجیر نے کہا کہ تم نے یہ نہیں کہا تھا بلکہ دوسری طرح بنانے کیلئے کہا تھا تو کام کرانے والے کی بات قسم کھانے کی صورت میں مانی جائے گی۔ اس لئے کہ اجازت کام کرانے والے کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ اس کا منکر ہے اور منکر کا قول قسم کے ساتھ قبول ہوگا۔ اگر وہ قسم کھائے گا تو اجیر ضامن ہوگا۔ اگر تعمیر کرانے والا مستری سے کہے کہ تم نے یہ خاص کام میرے لئے بغیر اجرت کے کیا ہے۔ معمار کہے نہیں اجرت کے عوض کیا ہے۔ اگر معمار کے پاس گواہ موجود نہ ہو تو صاحب تعمیر سے حلف لیکر اس کے قول کو قبول کیا جائے گا۔ یہ قول امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے

اجارہ کو فسخ کرنا

کسی نے گھر کرایہ پر لینے کے بعد دیکھا کہ اس میں ایسا نقص ہے جو رہائش میں نقصان دہ ہے تو اس کو عقد فسخ کرنے کا اختیار ہے۔ عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں۔ خود فسخ کر سکتا ہے۔ اگر عقد اجارہ کے وقت نقص و کمی کو دیکھا تھا تو فسخ کا اختیار نہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ عیب پر راضی ہو گیا تھا۔ اگر ایک مکان کے دو حصے کرایہ پر لے لئے اور اس میں سے ایک میں ایسا نقصان معلوم ہو جو سکونت کی راہ میں رکاوٹ ہے تو اس کو دونوں حصوں میں عقد فسخ کرنے کا اختیار ہوگا ایک حصہ کو اپنے پاس رکھ کر دوسرے کو واپس کر دے ایسا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ دونوں کو ایک صفقہ میں خریدا ہے۔ اگر عیب سکونت میں کوئی خلل نہیں ڈالتا ہو تو فسخ کا اختیار نہ ہوگا۔ پہلی صورت میں موجر اس کمی کی اصلاح کر کے درست کر دے تو فسخ کا اختیار نہ ہوگا۔

کرایہ کا مکان اگر کمزور ہو جائے تو اس کی درستگی کی ذمہ داری مالک مکان پر ہے کرایہ دار پر نہیں۔ البتہ اس کو درست کرنے کیلئے مالک کو مجبور نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ مالک کو اس کی ملکیت کی درستگی کیلئے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر موجر اس کو ٹھیک نہیں کرتا تو مستاجر کو عقد فسخ کرنے کا حق ہے۔

اگر مستاجر گھر میں کچھ اصلاحات اپنی طور پر کر دے، تو اس کی طرف سے مہربانی ہوگی مالک سے اس کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اگر کسی نے مکان کرایہ پر ایک متعین مدت تک کیلئے دیا پھر اس کو فروخت کیا اور مشتری کو اس کے کرایہ کی مدت کا علم ہے تو مشتری کو بائع سے مکان حوالے کرنے کا مطالبہ کرنے کا حق مدت پوری ہونے سے پہلے ہی ہوگا۔ اگر مشتری کو اس کا علم نہ ہو بلکہ خریدنے کے بعد معلوم ہو تو مشتری کو اختیار ہوگا چاہے بیع کو فسخ کر دے چاہے مدت کی تکمیل تک انتظار کرے۔ اجارہ کرنے والے متعاقدین میں سے ایک کا انتقال ہو جائے اور اجارہ خود اپنے لئے کیا تھا تو عقد اجارہ فسخ ہو جائے گا کیوں کہ برقرار رہنے کی صورت میں اس کی مملوک منفعت یا مملوک اجرت کا اس کا غیر مستحق ہوگا اور یہ جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر عقد اجارہ کسی اور کیلئے کیا تھا (مثلاً وکیل نے اپنے مؤکل کیلئے۔ موصی نے موصی لہ کیلئے اور باپ نے اپنے چھوٹے بیٹے کیلئے کیا تھا) تو اس کے مرنے سے عقد فسخ نہیں ہوگا کیوں کہ اس سے صورت عقد کے ذریعے اس کے مملوک منفعت یا اجرت کا غیر مملوک ہونا لازم نہیں آتا۔

اگر متعاقدین میں سے ایک کا انتقال ہو جائے اور زمین پر ایسی فصل ہے جو ابھی کٹنے کے قابل نہیں ہوئی تو مستاجر کو اختیار ہوگا کہ فصل تیار ہونے تک اسے دے اس پر زائد اجرت نہیں لی جائیگی۔ اور اگر اجرت کی مدت مکمل ہوگئی مگر فصل ابھی تک اس قابل نہیں ہوئی کہ اس کو کاٹا جائے تو اس کو کھیت پر رہنے دیا جائیگا اور اجرت اجرتِ مثلی ہوگی۔ عقد کے بعد عذر پیش آنے کی صورت میں عقد کو فسخ کیا جاسکتا ہے مثلاً کسی نے دکان یا کوئی محل تجارت کرنے کی غرض سے کرائے کیلئے لے لیا۔ مگر کسی آفت کی وجہ سے دیوالیہ ہوگیا، یا اپنا گھر وغیرہ کرایہ پر چڑھانے کے بعد مال خسارے کے تحت آگیا اور قرضوں کے بوجھ تلے دب گیا۔ اس کے بعد قرضوں کی ادائیگی کے لئے سوائے اس مکان کے اور کوئی چیز نہیں تو عدالت عقد اجارہ کو فسخ کر کے اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت قرض خواہوں کے درمیان تقسیم کرے گی۔ دین غیر ظاہر عذر ہے تو نقض عقد کیلئے قاضی کے فیصلے کا محتاج ہے اور اگر عذر ظاہر ہو اور واضح ہو تو قاضی کے فیصلے کے بغیر بھی خود اس کو فسخ کرسکتا ہے۔ یہ گویا خیار عیب کی طرح ہے۔ عدالت کے فیصلے کی صورت اس طرح ہوسکتی ہے کہ گھر کرائے

پر دینے والا مفلس اور دیوالیہ مالک دیون کی ادائیگی کیلئے اس مکان کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے مگر ایک مدت تک کرایہ پر دینے کی وجہ سے مشتری کو قبضہ دلانے پر قادر نہیں ہے۔ تو مشتری عدالت میں جائے گا اور گھر حوالہ کرنے یا بیع فسخ کرنے کا مطالبہ کرے گا اور عدالت بیع کو برقرار رکھ کر اجارہ کو فسخ کر دے گی۔ عدالت اس طرح حیلے کئے بغیر ڈائرکٹ اجارہ کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ اس صورت میں کسی کے حق کو بلا وجہ باطل کرنا لازم آئے گا۔ جو عدل کے خلاف ہے اور جائز نہیں ہے۔ اگر شہر چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو جائے، تب بھی اجارہ کو فسخ کرسکتا ہے۔ کسی کو مدت معلومہ کیلئے معاہدے کے ساتھ ملازم رکھا۔ مگر اس کو چوری کی عادت تھی تو اس کو فارغ کرسکتا ہے کیوں کہ اس کے منافع سے استفادہ ضرر کے ساتھ ہو رہا ہے۔

اسی طرح کسی شخص نے ایک جگہ جانے کیلئے ریل، جہاز یا بس وغیرہ کا ٹکٹ خریدا مگر اس کو کوئی عذر ایسا پیش آ گیا جس کی وجہ سے وہ سفر پر نہیں جاسکا۔ تو ٹکٹ کو واپس کر کے اپنا کرایہ واپس لے سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کو عذر لاحق ہو گیا۔ سفر پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اور ٹکٹ دینے والا افسر کمپنی کے سامنے اس کی وکالت کرسکتا ہے اور اگر اس وجہ سے واپس کر رہا ہے کہ دوسری جگہ اس سے سستا ٹکٹ مل رہا ہے تو اس کو فسخ نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اس نے پہلے اس پر راضی ہو کر عقد کیا تھا۔ اسی طرح کمپنی کو بھی یہ اختیار نہیں ہوگا اس کا ٹکٹ واپس لیکر اس سے زیادہ کرایہ دینے والے کو دیدے اور کمپنی کو بلا وجہ اس کے ٹکٹ کو منسوخ کرنے کا حق بھی نہیں ہوگا۔

﴿کتاب الرہن (گروی)﴾

رہن کا لغوی معنی مطلق روکنا ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"کل نَفسٍ بما کسبت رهينة" [المدثر:۳۸]

"ہر جی اپنے کیے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔"

اور اصطلاح شرع میں رہن وصول دین کیلئے اعتمادی عقد ہے تا کہ راہن مرتہن کو اس کا مال بروقت ادا کرے اس غرض کیلئے یہ عقد کیا جاتا ہے۔ اس کی مشروعیت، قرآن، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے۔قرآن سے ثبوت: فرمان الٰہی ہے "فرهٰن مقبوضة" "تو گروی چیز ہاتھ میں رکھنی چاہئے۔" [البقرہ:۲۸۳] یہ حکم رہن ہے خبر کی صورت میں، یعنی مطلب یہ ہے اگر تم سفر میں ہو لکھنے والا کوئی تمہیں نہ ملے، تو رہن کے طور پر کوئی چیز وثیقہ کے طور پر اپنے پاس رکھو۔

حدیث سے ثبوت: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک یہودی سے گندم خریدی اور اپنی زرہ اس کے پاس رہن رکھ دی۔ [بخاری:۴۹۸]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارک میں لوگ معاملات کرتے اور گروی رکھنے اور رکھوانے کا رواج تھا۔آپ نے منع نہیں فرمایا: اور اس کے جواز پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی اجماع ہوا۔اس لئے کہ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی راہن رہن کہتے وقت یہ کہے کہ میں نے یہ چیز آپ کے پاس آپ کا جو قرض میرے اوپر ہے اس کے لئے گروی رکھ دی ہے۔ البتہ اس کے لئے قبول شرط نہیں ہے۔ کیوں کہ عقد تبرع ہے، جیسا ھبہ، صدقہ وغیرہ۔

مال متقوم میں رہن (گروی) حضر اور سفر میں جائز ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارک سے اب تک رہن کا معاملہ جاری ہے۔سفر میں بھی حضر میں بھی، رہن میں قبضہ برقرار رہنا حنفیہ کے ہاں ضروری ہے۔راہن مرہون کو فارغ کر کے مرتہن حوالہ کر دے تو عقد تام ہوگا۔ جب تک مرتہن اس پر قبضہ نہ کرے تو راہن کو اختیار ہوگا چاہے اس کو جاری رکھے چاہے رہن سے رجوع کر دے، اگر مرتہن کے حوالہ کر دے، تو مرتہن کے ضمان میں داخل ہو گیا، رہن مرتہن کے ہاں تلف ہو جائے تو وہ ذمہ دار ہوگا۔ دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول ہے "الرهن بمافيه" [1]

---

[1] [بیہقی:۶/۴۰]

مرتہن کے رہن پر محض قبضے سے رہن چیز اس کی ذمہ داری میں داخل ہوگی روایت میں آتا ہے ایک شخص نے اپنا گھوڑا مرتھن کے پاس رہن رکھا اور وہ اس کے پاس ہلاک ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا حق ختم ہوگیا''[1]

جن لوگوں نے رہن کے امانت ہونے کا دعویٰ کیا ہے انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے۔ ''لایغلق الرهنُ من صاحبه الذی رهنه له غنمه وعلیه غرمه''

مگر ان کا استدلال صحیح نہیں ہے کیوں کہ اُن کے نزدیک حدیث مرسل سے استدلال درست نہیں اور یہ حدیث مرسل ہے، دوسری وجہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دین کی وجہ سے رہن مرتہن کی ملکیت نہیں ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمانہ جہالت کی عادت کو ختم کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کیوں کہ اس میں دوسرے کے مال کا اس کے امر کے بغیر مالک ہونا لازم آتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے رہن کو ہلاک کیا اگر رہن کی قیمت دین سے کم ہے تو راہن سے رجوع کرے اور اگر زیادہ ہے تو وہ اس کا امین ہے۔ اسی طرح حضرت علی کا قول ہے ''اگر رہن کی قیمت قرض سے زیادہ ہے یا قرض رہن سے زیادہ ہے اور رہن ہلاک ہوجائے تو کمی کی تلافی کیلئے ایک دوسرے سے رجوع کریں گے۔''[2]

کوئی شخص یہ کہہ دے کہ فلاں آدمی جو بھی تیرے ساتھ معاملہ کرے میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس پر دوسرا یہ کہہ دے اس بات کی ضمانت کیلئے میرے پاس کوئی شئی گروی رکھ دو تو یہ جائز نہیں مبایعت سے پہلے، اگر اس صورت میں وہ کوئی چیز رہن رکھ دے اور اس کے ہاتھ سے رہن ہلاک ہوجائے، تو کوئی ضمان نہیں آئے گا۔ کیوں کہ رہن تو امانت تھی۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے فلاں چیز تمہارے پاس رہن رکھ دی۔ تم یہ چیز میرے پاس فروخت کرو اور اگر اس کے رہن پر بیع سے پہلے قبضہ کرلیا اور وہ اس کے ہاتھ سے ہلاک ہوگئی تو تاوان آئے گا۔ کیوں کہ اس نے ثمن قرض کے عوض رہن رکھا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہوا جیسے بیع کرتے وقت بیع کرنے سے پہلے بھاؤ تاؤ کیلئے بیع کو ہاتھ میں لیا اور وہ ہلاک ہوگئی تو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ رہن ہلاک ہونے کی صورت رہن کی قیمت اور دین میں سے جو کم ہے۔ اتنی مقدار میں تاوان دینا پڑے گا۔ چنانچہ اگر دین رہن کی قیمت سے کم ہو تو دین ہی ختم ہوگا۔ مزید قیمت کا مطالبہ نہیں کرسکتا اور اگر دین رہن کی قیمت سے زیادہ ہو تب بھی اپنے دین کو حاصل کرنے والا شمار ہوگا۔ جب رہن کے وقت دین اور رہن کی قیمت برابر ہوں اور اگر رہن کے وقت دین مال رہن کی قیمت سے زیادہ ہو تو قیمت کی بقدر دین

---

[1] [بیہقی: ۴۱/۶]　[2] [بیہقی: ۴۴/۶]

منہا ہوگا۔ باقی دین راہن سے وصول کیا جائے گا۔ کیوں کہ دین کو وصول کرنا مالیت کی بقدر ہوگا اور قیمت کا اعتبار قبضہ کے وقت کی قیمت کا ہے۔ اگر مرتہن نے گروی مال پر تصرف کیا، مثلاً اس کو فروخت کیا یا اجارہ پر دلایا یا عاریت کے طور پر کسی کے حوالہ کیا یا کسی کے پاس رہن رکھا، یا لباس تھا اسے پہن لیا۔ سواری تھی کسی طرح اپنے استعمال میں لے آیا اور وہ مال ہلاک ہوگیا تو مکمل قیمت کا ضامن ہوگا جو قیمت دین سے زائد تھی وہ امانت تھی اور امانت کے اندر تصرف کر کے ہلاک کرنے کی صورت میں تاوان دینا پڑتا ہے۔ ہاں اگر راہن نے تصرف کرنے کی اجازت دی ہو تو استعمال جائز ہوگا۔ رہن مرتہن کی حفاظت میں ہوتا ہے حفاظت کرنے والوں میں بیوی بچے شامل ہیں۔ اگر ان کے ہاتھوں بغیر زیادتی کے ہلاک ہوگیا تو دین سے زائد قیمت کا تاوان نہیں ہوگا اور اگر ان افراد کے علاوہ کسی اور کو حفاظت کرنے کیلئے دیدیا یا کسی کے پاس بطور امانت رکھ دیا اور ہلاک ہوگیا تو زائد قیمت کا تاوان دے گا۔ کیوں اس پر خود اس کی حفاظت لازم تھی۔ اس نے دوسرے کے ہاتھ دیکر تعدی کی۔ جس کی وجہ سے ذمہ دار ہوگا۔

اگر کسی نے زمین گروی رکھ دی جس پر فصل تھی، درخت تھے، جس پر پھل لگے ہوئے تھے اور عقد کے وقت پھلوں کا کوئی ذکر نہیں کیا تو رہن صحیح ہوگا اور اگر پھلوں کے تلف ہونے کا خطرہ ہو تو حاکم کے حکم سے ان کو فروخت کرسکتا ہے اگر حکومت کی اجازت کے بغیر فروخت کیا تو ضامن ہوگا۔

زمین پر لگی فصل کے بغیر صرف زمین کو یا زمین کے بغیر صرف فصل کو یا درختوں کے بغیر صرف پھلوں کو گروی رکھ دینا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ گروی چیز ایسی چیز سے متصل ہے جو رہن نہیں ہے۔ تو قاعدہ یہ ہے کہ اگر مرہون غیر مرہون سے متصل ہو تو رہن صحیح نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس صورت میں صرف مرہون پر قبضہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی وجہ سے دو آدمیوں کے درمیان مشترک شئی کو رہن رکھنا درست نہیں ہے۔ اگر گھر کے اندر کچھ سامان بھی ہو اور گھر کو سامان سمیت رہن رکھ دیا اور گروی صرف گھر رکھنے کا معاہدہ ہوا ہو تو ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اگر راہن و مرتہن اتفاق سے رہن کسی عادل آدمی کے پاس رکھ دیں تو جائز ہے۔ اور راہن اور مرتہن میں سے کسی کے لئے بھی اس سے رہن لینا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے ساتھ راہن اور مرتھن میں سے ہر ایک کا حق متعلق ہے ایک کے لینے سے دوسرے کا حق تلف ہوگا دوسرے کا حق تلف کرنے کا اختیار ان میں سے کسی کو نہیں ہے اور اگر اس عادل شخص نے ایک کی اجازت کے بغیر دوسرے کو دیدیا اور وہ تلف ہوگیا تو وہ تاوان بھرے گا۔ کیوں کہ وہ راہن کا بھی

مودع (جس کے پاس امانت رکھی گئی) ہےاور مرتہن کا بھی اور کسی کی امانت کو کسی اور کو دینے سے ضمان آتا ہے اور اگر مال مرہون عادل کے پاس ہلاک ہوگیا تو مرتہن کے ضمان میں ہلاک ہوگیا کیوں کہ عادل مرتہن کے قائم مقام ہے اور قائم مقام کے ہاتھ سے ہلاک ہونا اصل کے ہاتھ سے ہلاک ہونا ہے۔

عادل شخص جس کے پاس مرہون موجود ہے راہن یا مرتہن کے مرنے سے معزول نہیں ہوگا کیوں کہ عقد رہن، راہن ومرتہن کے مرنے یا ان میں سے کسی ایک کے مرنے سے باطل نہیں ہوگا۔اور اگر اس عادل شخص کے حوالہ عقد بیع کے بعد کیا گیا تو راہن اس کو معزول کرسکتا ہے اور اگر عقد رہن کے وقت اس کے پاس رکھنے کا معاہدہ ہے تو پھر اس کو اختیار نہیں ہوگا کہ اس کو معزول کرے۔ اگر راہن نے مرتہن کو یا عادل کو یا کسی اور کو وقت ادائیگی دین کے مکمل ہونے پر مرہون فروخت کرنے کا وکیل بنایا تو جائز ہے کیونکہ یہ اپنا مال فروخت کرنے کی توکیل ہے۔ وقت کی تکمیل پر مرتہن کو مال مرہون اپنے قبضے میں رکھنے اور دین کی ادائیگی تک واپس نہ کرنے کا حق حاصل ہے مگر مرتہن عدالت میں اپنا دین حوالہ کرانے کی درخواست دائر کردے تو اسے مرہون کو حاضر کرنے کا حکم دیا جائیگا۔ وہ جب مرہون کو حاضر کرے گا تو عدالت راہن کو پہلے دین ادا کرنے کا حکم دے گی تا کہ اس کا حق متعین ہو جائے۔ اگر مرتہن نے اپنا قرض ایسی جگہ طلب کیا جہاں عقد نہیں ہوا تھا اگر مرہون کو وہاں کوئی دشواری نہ ہو اور اس پر کوئی خرچ نہ آتا ہو تو اس کو حکم دیا جائے گا کہ مرہون کو حاضر کرو۔ اگر مرہون کو حاضر کرنے میں دشواری ہو یا اس پر رقم خرچ ہوتی ہو تو مرتہن کو حاضر کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے میں اس کو نقصان ہے۔ جب کہ مرتہن کے لئے حوالہ کرنا لازمی ہے اس کے مقام تک پہنچانا لازمی نہیں ہے۔

اگر راہن نے دین کا کچھ حصہ ادا کردیا اور کچھ نہیں کیا تو مرتہن کو حق حاصل ہوگا کہ کل مرہون مال پر قبضہ جمائے رکھے تا کہ اپنا حق پورا وصول کرسکے۔ جیسے کہ بائع کیلئے مکمل ثمن وصول کرنے میں مبیع کو حوالہ نہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر راہن نے دین ادا کردیا تو مرتہن سے کہا جائے گا کہ مرہون واپس کردو اور دین کی ادائیگی کے بعد مرہون مرتہن کے ہاتھ ضائع ہو جائے تو دین کے بدلے منہا کردیا جائے گا اور جو کچھ اس نے راہن سے وصول کیا واپس کردیا جائے گا۔

اگر مرتہن نے راہن کو اپنا دین معاف کردیا اور بعد معافی مرہون مرتہن کے پاس ہلاک ہو جائے تو استحساناً معاف سمجھا جائے گا۔ قیاس کا تقاضا اگرچہ تاوان دینے کا ہے۔ اگر راہن نے مرتہن کی اجازت کے بغیر مرہون بیچ دیا تو بیع مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ اگر مرتہن اجازت

دے تو بیع نافذ ہوگی اور اگر مرتہن اس کی اجازت نہ دے تو بیع فسخ نہیں ہوگی۔ البتہ مشتری (خریدنے والے) کو اختیار ہوگا یا مرہون چھڑانے کا انتظار کرے یا عدالت میں چلا جائے۔ اور قاضی کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے کیوں کہ راہن بائع مبیع پر قبضہ دلانے پر قادر نہیں ہے، اس صورت میں بیع کو فسخ کرنے کا اختیار صرف عدالت کو ہے مرتہن کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے۔

اگر راہن نے مرہون کو ہلاک کر دیا تو اس کے قائم مقام کے طور پر دوسری چیز بطور رہن رکھ دے، اور اگر کسی اجنبی شخص نے مرہون کو ہلاک کر دیا تو اس کے ساتھ مخاصمت کا حق مرتہن کو ہے اور اس سے اس کی قیمت بطور تاوان وصول کرے گا اور وہ اس کے پاس بطور رہن رہے گی اور قیمت کا اعتبار ہلاک ہونے کے دن کا ہوگا۔ مرہون پر راہن کی جنایت پر تاوان ہوگا۔ کیوں کہ اس نے مرتہن کے حق قبضہ کو زائل کرنے کی جنایت کی اور مرتہن کی مرہون پر جنایت بقدر دین باعث تاوان ہوگی۔

صورت مسئلہ اس طرح ہوگی مثلاً ایک شخص (راہن) نے مرتہنکے پاس دس ہزار روپے قرض کے وثیقے میں پچاس ہزار کی موٹر سائیکل گروی رکھ دی اور کسی وجہ سے مرتہن کے پاس جل گئی تو راہن کا قرض ادا ہوگیا اور باقی جو زائد قیمت ہے وہ اس کے پاس امانت تھی اور اس میں اس کا کوئی عمل دخل نہ ہونے کی وجہ سے تاوان نہیں آئے گا اور معاف ہوگا اور اگر موٹر سائیکل مرتہن کی غلطی اور زیادتی کی وجہ سے جل گئی تو دین کی ادائیگی کے ساتھ جو زائد رقم ہے اس کا بھی تاوان ادا کرنا اس پر لازم ہوگا اور اس وقت کی جو بھی قیمت ہوگی جتنی بھی زیادہ ہوگی ادا کرنا اس پر لازم ہوگا۔

اگر راہن کا انتقال ہو جائے تو اس کا وصی اس کو فروخت کر کے قرض ادا کرے گا کیوں کہ جس کو اس نے وصیت کی ہے وہ اس کا نائب ہے، اگر اس نے کسی کو وصیت نہیں کی تو قاضی اس کو فروخت کرنے کیلئے آدمی مقرر کرے گا یہ جب ہے جب اس کے ورثاء چھوٹے ہوں اور اگر بڑے ہوں تو وہ خود مردے کے نائب ہوں گے اور ان پر دین کو ادا کر کے مرہون کو چھڑانا ضروری ہوگا۔

﴿کتاب الشرکۃ﴾

شرکت کا لغوی معنی ہے ملنا ملانا کہ اور اصطلاح شرع میں مال اور منافع میں حصہ داری کے معاہدے کو شرکت کہا جاتا ہے۔ شرکت کی مشروعیت نصوص شرعیہ سے ثابت ہے چنانچہ السائب بن ابی السائب کہتے ہیں کہ وہ اسلام سے پہلے تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شریک تھے جب فتح مکہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا: میرے بھائی میرے شریک تجارت! خوش آمدید: "لایداریٰ ولا یماری"[۱]۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دو شریکوں میں تیسرا میں ہوں جب تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کریں اور جب ایک دوسرے کے ساتھ خیانت کرنے لگیں گے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاؤں گا۔[۲] تیسری دلیل مشروعیت شرکت کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارک میں لوگ شرکت سے کاروبار کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں منع نہیں فرمایا۔

اقسام شرکت

شرکت کی دو قسمیں ہیں: (۱) شرکت املاک (۲) شرکت عقود۔

شرکت املاک کا دوسرا نام شرکت ملک بھی ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) اضطراری (۲) اختیاری

شرکت جبری یا اضطراری یہ ہے مثلاً دو شخص اکٹھے کسی کے مال کے وارث بنیں یا دو آدمیوں کے مال آپس میں اس طرح مختلط (مکس) ہوگئے کہ ان میں تمیز کرنا ناممکن ہوگیا اور شرکت اختیاری یہ ہے کہ دو آدمیوں نے مل کر ایک مشترکہ زمین خریدی۔ یا ایک ہی چیز کی کسی نے دو شخصوں کیلئے وصیت کی اور انہوں نے اس کو قبول کیا یا اپنے اختیار سے اپنے مالوں کو آپس میں ملا دیا۔ شرکۃ املاک کا حکم یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے حصے کے متعلق اجنبی ہے۔ ایک کیلئے دوسرے کے حصے میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اپنے حصے کو اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کرسکتا ہے اور دوسرے کے ہاتھ اس کی اجازت کے بغیر فروخت نہیں کرسکتا۔

---

۱ [المستدرک:۲/۶۱] ۲ [المستدرک:۲/۵۲]

شرکت عقود

وہ شرکت ہے جو عقد و معاہدے کے ذریعے کی جائے۔ اس کا رکن ایجاب وقبول ہے۔ ایک کہے میں نے تیرے ساتھ اتنے میں شرکت کی اور دوسرے نے کہا میں نے قبول کیا اور اس کے صحیح ہونے کی شرط معقود علیہ (وہ مال جس پر شرکت ہو رہی ہے) کا قابل وکالت ہونا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف سے تصرف میں ایک دوسرے کی وکالت کر سکیں اور عقد شرکت میں مقصود بھی یہی ہے۔ لہٰذا گداگری کا پیشہ اختیار کرنا اور لکڑیاں جمع کرنے میں عقد شرکت نہیں جائز، کیوں کہ اس میں مال میں ملکیت اس کو حاصل ہوگی جس نے کام کیا۔

شرکۃ عقود کی قسمیں

(۱) شرکۃ مفاوضۃ (۲) شرکۃ عنان (۳) شرکۃ صنائع (۴) شرکۃ وجوہ۔

(۱) شرکۃ مفاوضہ: کا دوسرا نام شرکۃ مساوات بھی ہے۔ مثلاً دو آدمیوں کی شرکت جو مال، تصرف اور دین میں بالکل برابری کی بنیاد پر آپس میں معاہدہ کریں اور شرکت مفاوضہ اور شرکت مساوات دو آزاد بالغ، عاقل مسلمانوں کے مابین ہوگی اور لفظ مساوات کے بغیر منعقد نہیں ہوگی کیوں کہ لوگوں کی اکثریت اس کی شرائط سے ناواقف ہے اور یہ لفظ شرکۃ کے معنی اور شرائط کو جامع ہے اور یہ عقد وکالت وکفالت کی بنیاد پر منعقد ہوگا۔ وہ اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک کاروباری حوالے سے ذمہ دار ہوگا یہ کفالت ہے۔ ایک کا عمل دوسرے کا عمل شمار ہوگا یہ وکالت ہے اور مساوات کا معنی بھی وکالۃ اور کفالت کا متقاضی ہے۔ گویا ان میں سے ایک نے شرکت کے معاملے کو ایک دوسرے کے حوالہ کیا ہے اور وہ اس کے کام سے راضی ہے تو یہ وکالت وکفالت کو مقتضی ہے۔ لہٰذا کفالت کے تقاضے کے مطابق بائع کو ان میں سے ہر ایک سے ثمن کا تقاضا کرنے کا حق حاصل ہے اور ادا کرنے والا اپنے مشتری شریک پر نصف کا مطالبہ کرے۔ کیوں کہ اس نے کفالۃ کے طور پر ادا کیا ہے۔ ایک پر دین لازم ہوگا تو دوسرا بھی اس میں شریک ہوگا اور وہ بھی ضامن ہوگا۔ جن میں اشتراک جائز ہے وہ یہ ہیں: بیع، شراء، اجارہ اور جن میں اشتراک (پاٹنرشپ) جائز نہیں ہے وہ یہ ہیں: نکاح، خلع، جنایۃ، قتلِ عمد کی صلح۔ لہٰذا اگر دو شریکوں میں سے ایک نے نکاح کر لیا تو وہ اسی کے ساتھ خاص ہے، کیوں کہ نکاح میں عقد شرکۃ جائز نہیں اور عورت کو اختیار نہ ہوگا کہ وہ اپنے مہر کا مطالبہ اپنے شوہر کے پاٹنر سے کرے، کیوں کہ مہر ایسی شئی کا بدل ہے جس پر اشتراک نہیں ہوسکتا۔

ان میں سے ایک کو وراثت کا مال مل گیا اور اس کے قبضے میں آگیا تو شرکت مفاوضہ ختم ہو کر شرکۃ عنان بن جائے گی۔ کیوں کہ رأس المال میں جس میں شریکین کے درمیان مساوات ضروری ہے، برابری نہیں رہی، رأس المال میں برابری شرکۃ مساوات میں شروع میں بھی ضروری ہے اور بعد میں بھی۔ اور ہاں اگر ایک شریک ایسے مال کا مالک ہو گیا جس میں اشتراک صحیح نہیں مثلاً جائیداد، یا اس کو کسی نے رقم کے علاوہ عام سامان ہدیہ کر دیا اور وہ اس کے قبضہ میں آگیا تو شرکۃ مفاوضۃ باطل نہیں ہوگی، کیوں کہ ان میں شرکۃ صحیح نہیں تو رأس المال کی زیادتی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ہر ایک شریک کو وکیل بنانے، کسی سے مضاربت کا کاروبار کرنے، کسی کے پاس امانت رکھنے، کام کیلئے مزدور و ملازم رکھنے کا اختیار ہوگا۔ کیوں کہ ان تمام امور کا تعلق کاروبار سے ہے اور وہ اس مال میں امین ہے اور اسے اپنے شریک کی اجازت سے شرکت مفاوضہ کا اختیار ہوگا۔

اور اجازت کے بغیر نہیں اگر اس کی اجازت کے بغیر شرکت مساوات کی تو شرکۃ مساوات نہیں رہے گی بلکہ وہ شرکت العنان بن جائے گی۔ شرکۃ مساوات سکہ رائج الوقت یعنی رائج کرنسی کے بغیر کسی اور میں صحیح نہیں ہوگی۔ کیوں کہ آج کل سونے چاندی کے قائم مقام یہی رائج الوقت کرنسیاں ہیں۔ عام سامان میں شرکۃ مساوات نہیں ہوسکتی ہاں ان کو فروخت کر کے ان کی قیمت پر شرکۃ جائز ہوگی۔

۲۔ شرکۃ العنان

شرکت کی اس قسم کو عنان اس لئے کہا جاتا ہے کہ عنان لگام کو کہتے ہیں، اور لگام سے گھوڑے کو روکا جاتا ہے، اور اس شرکت میں سارے مال میں شرکۃ نہیں ہوتی بعض مال شرکۃ میں شامل کرنے سے روکا جاتا ہے۔ اس مناسبت سے اس کو عنان کے لقب کے ساتھ ملقب کر دیا گیا۔ اس میں مساوات رأس المال شرط نہیں۔ رأس المال میں برابری بھی ہوسکتی ہے اور کمی بیشی بھی۔ اس طرح منافع میں بھی ایک کی دوسرے پر برتری جائز اور درست ہے۔ کیوں کہ بعض دفعہ کام کی نوعیت کے اعتبار سے اور بعض دفعہ مال کی زیادتی کی وجہ سے۔ منافع میں اتار چڑھاؤ ہوسکتا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی منافع میں کمی بیشی ہوسکتی ہے کہ کام کے اعتبار سے ایک ماہر، تجربہ کار اور محنتی ہوسکتا ہے اور دوسرا ناتجربہ کار اور سست بھی ہوسکتا ہے تو ماہر و تجربہ کار برابری پر راضی نہیں ہوسکتا۔ ایک نے کام کیا اور دوسرے نے کسی عذر یا بغیر عذر کے کام نہیں کیا۔ تو ایسے میں گویا دونوں نے کیا اور منافع طے شدہ معاہدے کے تحت ہی ملے گا۔ جیسا کہ ایک نہایت غریب روایت میں

موجود ہے۔ "الربح علی ما شرطا، والوضيعة علی قدر المالين" یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ شرکۃ العنان میں مال کو آپس میں ملانا شرط نہیں ہے۔ جو مال عقد شرکت کے بعد اختلاط سے پہلے ہلاک ہو جائے، تو اسی کا مال ہلاک ہونا شمار ہوگا جس کا وہ ہے چاہے اسی کے ہاتھ سے ضائع ہو یا دوسرے پارٹنر کے ہاتھ سے، اور اگر ضیاع ملانے کے بعد ہوا تو نقصان کا بوجھ دونوں پر پڑے گا۔

شرکۃ العنان کن چیزوں سے صحیح ہوتی ہے؟

شرکۃ العنان بھی نقدی میں صحیح ہے، سامان تجارت میں شرکت عنان درست نہیں ہوگی۔ اسی طرح ان چیزوں میں بھی شرکۃ عنان نہیں ہوسکتی جس میں وکالت صحیح نہیں ہے، جیسے لکڑیاں جمع کرنا۔ اور شرکۃ عنان وکالت کی بنیاد پر منعقد ہوتی ہے۔ یعنی تجارت کے ذریعے حاصل شدہ مال جس کے بھی عمل سے حاصل ہو دونوں شریک اور حصہ دار ہوں گے۔ یہ شرکت کفالۃ کی بنیاد پر منعقد نہیں ہوگی،۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے ایک نے معاہدات کئے اور مطالبہ اس کے علاوہ دوسرے شریک سے بھی ہو جائے، کیوں کہ مساوات میں، مساوات کے معاہدے سے ہر ایک برابر ہے جبکہ عنان میں ایسا نہیں ہے۔ ان میں سے ایک نے خریداری کی، تو ثمن کا مطالبہ اسی سے ہوگا دوسرے سے نہیں۔ ہاں یہ ادائیگی ثمن کے بعد اپنے ساتھی کے حصے کا ثمن جو اس نے ادا کیا ہے اس سے لے سکتا ہے، جب کہ اپنے ذاتی مال سے دیا ہو۔ اور اگر مشترکہ مال سے ثمن ادا کیا ہے تو اس کی طرف ثمن کی ادائیگی کے سلسلے میں رجوع نہیں کرسکتا۔

شرکت عنان کے بعد کاروبار شروع کرنے سے پہلے دونوں کے مال یا ان میں سے ایک کا مال ہلاک ہو جائے تو شرکۃ فسخ ہو جائے گی کیوں کہ شرکت اسی مال پر منعقد ہوئی تھی۔ وہ ختم تو شرکۃ بھی ختم، ان میں سے ایک کا مال ختم ہوا تو بھی شرکۃ باطل ہو جائے گی۔ ایک نے اپنے مال سے سامان خریدا تھا دوسرے کا مال سامان خریدنے سے پہلے ہلاک ہوگیا تو جو مال خریدا گیا ہے وہ دونوں میں معاہدے کی رو سے مشترک ہوگا۔ کیوں کہ عقد شرکت کے بعد خریدا گیا ہے، تو ایک کے مال ہلاک ہونے سے وہ تبدیل نہیں ہوگا البتہ اس کے حصے میں جتنا ثمن آتا ہے وہ اس سے لے سکتا ہے۔ کیوں کہ اس نے نصف اپنے لئے اور نصف وکالہ کے طور پر خریدا ہے۔

ایک آدمی بیک وقت شریک اور اجیر نہیں ہوسکتا

شرکۃ العنان میں ایک شریک کیلئے ایک یقینی منافع مقرر کرنا جائز نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ طریقہ اسے شریک ہونے سے نکال کر اجیر بناتا ہے۔ اور عقد کو شرکت سے نکال کر عقد اجارہ میں تبدیل کردیتا ہے۔ کیوں کہ متعین مقدار اجیر کیلئے ہوتی ہے نہ کہ شریک کیلئے۔ البتہ شرکۃ العنان کے شریک کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنا مال فروخت کرنے کیلئے کسی اور کو دیدے تاکہ وہ بیچ کر ثمن بھی اس کو دے اور منافع بھی اور یہ عقد شرکت میں عام ہوتا ہے کہ بطور مضاربت کسی کو دیدے یا تصرف کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنالے کیوں کہ خرید وفروخت میں وکیل بننا بنانا تجارت کے امور میں سے ہے اور شرکت ہوتی ہی تجارت کیلئے ہے۔ اسی طرح ایک شریک کیلئے ودیعت کے طور پر کسی کے پاس امانت رکھنا یا کسی کو عاریۃً دینا جائز ہے۔ کیوں کہ یہ تجارت کی ضروریات میں سے ہے۔ اسی طرح نقد اور قرض دونوں طرح کا کاروبار کرنا بھی درست ہے، ہاں اگر دوسرے شریک نے اس طرح کرنے سے منع کیا ہے تو جائز نہیں ہوگا۔

۳: شرکۃ الصنائع

دو کاریگر مل کر ایک کام اس شرط پر لیں کہ کام پر ملنے والی اجرت ان کے درمیان مشترک ہوگی۔ یہ اشتراک ضمان عمل اور اجرت میں ہے۔ نفس عمل میں نہیں اور یہ شرط لگانا جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رزق عطا فرمادے، دونوں میں برابر ہوگا اور اس میں برابری اور مساوات کا لفظ استعمال کریں۔ شرکہ صنائع کبھی شرکت عنان میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے، شرکۃ صنائع کیلئے اہل کفالہ ہونا شرط نہیں ہے اور ملنے والی اجرت میں برابری یا تفاضل کی شرط لگانا بھی جائز ہے اور اگر اس کو مطلق رکھا تو وہ شرکۃ عنان ہوگی اور ان میں سے ایک نے کام کیا دوسرے نے نہیں تب بھی حاصل شدہ اجرت دونوں میں برابری کی بنیاد پر تقسیم ہوگی اگر نصف نصف کی شرط لگائی ہو، چاہے شرکۃ عنان ہو یا مفاوضہ، اگر تفاضل اور ربح کی شرط لگائی تو اس کے مطابق ہوگا کیوں کہ اجرت ان کے کام کا بدلہ ہے اور کام کے اعتبار سے دونوں مختلف ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک کام کا ماہر ہو اور اچھے انداز سے کرسکتا ہو کہ دوسرا ایسا نہ ہو۔ لہٰذا ایک کیلئے زیادہ لینے کی شرط ہے، یہ اضافہ منافع میں اضافہ نہیں ہے کہ یہ عمل کا بدلہ ہے کیوں کہ ربح اور منافع اور رأس المال میں مجانست ہوتی ہے۔ جبکہ یہاں مجانست نہیں ہے۔ کیوں کہ یہاں رأس المال عمل ہے جبکہ منفعت مال ہے تو یہ عمل کا بدل سمجھا جائے گا۔ ان میں سے کوئی بھی کام لے تو دوسرے پر بھی اس کو کرنا لازم ہوگا۔ کیوں کہ اس نے

شرکتہ میں معاہدہ کیا ہے کہ وہ کام لے اپنے لئے اور شریک کیلئے، اور کام دینے والا دونوں سے کام کرنے کا مطالبہ کرسکتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کام دینے والے سے اجرت کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اجرت دینے والا ان میں سے کسی ایک کو دے کر ذمہ سے بری ہوسکتا ہے، یہ جب ہے جب شرکت برابری کی بنیاد پر ہو اور اگر عنان کے طور پر ہو تو صرف وہ مطالبہکر سکتا ہے۔ جس نے کام کیا ہے۔

۴۔ شرکت الوجوہ

یہ ہے کہ دو شخص ہیں ان کے پاس مال نہیں دونوں نے معاہدہ کیا کہ ہم اپنی ذاتی وجاہت کی بنیاد پر قرض پر چیز خرید کر فروخت کریں گے۔ ثمن منہا کرنے کے بعد جو بچ جائے گا وہ ہمارے درمیان تقسیم ہوگا اس طرح کا اشتراک (پارٹنر شپ) بھی شرعی لحاظ سے جائز ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک خریداری میں ایک دوسرے کا وکیل ہوگا۔ یہ شرکت وکالہ کی بنیاد پر منعقد ہوگی، اور اگر کفالت کی بھی شرط لگائیں گے تب بھی جائز ہے اور وہ مفاوضہ ہوگا اور خریدی ہوئی چیز میں اور ثمن میں دونوں شریک ہوں گے، اور کفالت کے الفاظ سے شرط لائی جاسکتی ہے۔

ملک میں برابری کے ساتھ منافع میں ایک کیلئے زیادتی کی شرط لگانا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ شرکتہ وجوہ میں منفعت ذمہ داری وضمان کی بنیاد پر ہے اور ضمان خریدی ہوئی چیز میں ملکیت کی بقدر ہوگا۔ لہٰذا ملک کی مقدار سے زائد منفعت لینا ایسی چیز کی منفعت لینا ہے جس کا وہ ذمہ دار نہیں اور اگر مشتری (خریدی ہوئی چیز) میں ایک تہائی ملکیت کی شرط ایک کیلئے اور دو تہائی دوسرے کیلئے کی شرط لگائیں گے تو ربح میں بھی اسی طرح حق دار ہوں گے۔

مباح چیزوں میں شرکت

مباح چیزوں کو حاصل کرنے کیلئے عقد شرکت کرنا جائز نہیں۔ مثلاً لکڑیاں جمع کرنا یا شکار کرنا وغیرہ۔ کیوں کہ عقد شرکتہ وکالتہ کے معنی کو متضمن ہے اور مباح کو حاصل کرنے کیلئے وکیل بنانا درست نہیں ہے، کیوں کہ موکل کا امر مباح کیلئے حکم دینا بے معنی ہے کیوں کہ اس کے حکم کے بغیر بھی ایسا کرنا اس کے لئے جائز ہے، تو نیابت وتوکیل کا کوئی فائدہ نہیں ہے اگر دونوں نے شکار کیا یا لکڑیاں جمع کیں تو جس نے جتنا جمع کیا یا شکار کیا تو وہ اسی کا ہوگا۔ دوسرا اس میں حصہ دار نہ ہوگا۔ اگر دونوں نے مل کر ایک لکڑی یا مچھلی کو حاصل کیا تو یہ ان کے درمیان تقسیم ہوگی۔ ایک نے لکڑی اٹھائی اور دوسرے نے اٹھانے یا حفاظت کرنے میں اس کی مدد کی تو مدد کرنے والے کو اجرت ملے گی جو اس شئی کی نصف قیمت سے زیادہ نہ ہوگی۔ اگر لکڑی جمع کرنے یا شکار کرنے میں دونوں نے

شرکت کی ایک کے کام میں دوسرے کا آلہ استعمال ہوا۔ پہلے نے اپنے ذرائع سے حاصل کیا دوسرے نے اپنی گاڑی یا ریڑھے یا کسی اور چیز کے ذریعے اس کو منزل تک پہنچانے کا کام کیا حتیٰ کے فروخت کے قابل ہو گیا پھر بھی شرکت نہیں ہوگی۔ اپنے وسیلے کے ذریعے اس کو حاصل کرنے والا اس کا مالک ہوگا اور صاحب آلہ کو اجرت ملے گی۔ اگر دوسرے نے پہلے والے کے وسیلہ سے اس کو حاصل کیا تو وہ مالک ہوگا۔ صاحب وسیلہ کو اس کی اجرت دے گا۔ کیوں اس نے عقد فاسد کے ساتھ دوسرے کی ملک سے استفادہ کیا۔ تو اس صورت میں اجرت واجب ہوتی ہے۔

شرکۃ کا بطلان

حصہ داروں میں سے ایک کے مرنے سے یا مرتد ہو کر دارالحرب منتقل ہونے سے شرکت باطل ہوتی ہے کیوں شرکۃ میں وکالت بھی ہوتی ہے اور مؤکل اور وکیل میں سے کسی ایک کے مرنے سے وکالت باطل ہو جاتی ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں نیابت

اپنے شریک کار کی اجازت کے بغیر اس کی زکوٰۃ ادا کرنا درست نہیں کیوں کہ یہ معاہدہ شرکت میں شامل نہیں، کیوں کہ یہ تجارت کے امور میں سے ہے۔

مضاربت

یہ ضرب سے مشتق ہے اور ضرب کا معنی زمین پر چلنا ہے ارشاد ربانی ہے ”واذا ضربتم فی الارض“ [النساء:۱۰۱] ”جب تم زمین پر چلو“

کاروبار کی اس قسم کو مضاربۃ کہتے ہیں، وجہ شاید یہ ہے کہ یہ کام چلنے پھرنے سے ہوتا ہے۔ اور اسے ”مقارضہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ عام اصطلاح میں مضاربت سے مشہور ہونے کی وجہ قرآن کریم کی آیت کی موافقت ہے فرمان الٰہی ہے: ”واٰ اخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللّٰہ“ ”اور کتنے لوگ پھریں گے ملک میں ڈھونڈتے اللہ کے فضل کو۔“ [المزمل:۲۰] ”یبتغون من فضل اللّٰہ“ سے مراد تجارت کیلئے سفر کرنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت لوگ مضاربۃ پر کاروبار کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منع نہیں فرمایا: اس کاروبار برقرار رکھا، حضرت اسلم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادے عبداللہ

اور عبید اللہ اسلامی فوج کے ساتھ عراق تشریف لے گئے۔ واپسی میں بصرۃ کے امیر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملے، انہوں نے ان کو خوش آمدید کہا اور بڑے پرتپاک انداز سے استقبال کیا۔ پھر فرمایا: اگر میرے پاس تمہیں فائدہ پہنچانے کی گنجائش ہوتی تو میں ضرور تمہیں کچھ عطا کرتا۔ پھر فرمایا: ہاں! ایک صورت ہے وہ یہ کہ میرے پاس اجتماعی اور سرکاری مال ہے جس کو میں امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ ایسا کرو تم اس کو لے لو اور یہاں عراق سے اس کے بدلے کوئی چیز خرید لو اور مدینہ میں جا کر فروخت کرو۔ منافع اپنے پاس رکھو اور رأس المال، (اصل مال) حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو دیدو،

انہوں نے کہا یہ ٹھیک ہے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا: اتنی رقم ان سے وصول کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے عراق سے کچھ چیزیں خرید کر مدینہ منورہ میں فروخت کیں۔ جس سے ان کو منافع ملا، منافع اپنے پاس رکھ کر رأس المال (بھیجا ہوا اجتماعی مال) امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا رعایت فوج کے تمام افراد کے ساتھ کی گئی جو تمہارے ساتھ ہوئی؟ کہنے لگے نہیں: فرمایا: امیر المؤمنین کے صاحبزادگان ہونے کی وجہ سے تمہارے ساتھ یہ عنایتیں ہوئیں۔ لاؤ، رأس المال بھی حوالہ کرو اور منافع بھی دو، (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ) تو خاموش ہو گئے اور عبید اللہ نے عرض کیا: امیر المؤمنین! یہ تو مناسب نہیں ہے کیوں کہ اگر یہ مال ہلاک ہوتا یا اس میں کوئی کمی آتی تو ہم تاوان بھرتے اس کا تاوان ہم ہی پر آتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا: لاؤ منافع بھی دینا پڑے گا۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ خاموش رہے اور عبید اللہ رضی اللہ عنہ پھر بول پڑے تو مجلس میں کسی شخص نے کہا: امیر المؤمنین اس کو مضاربۃ کیوں نہیں بناتے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ٹھیک ہے اس کو میں نے مضاربۃ کر دیا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصف منافع مع رأس المال کے لے لیا اور اس کا نصف منافع حضرت عبداللہ اور عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس رکھا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت یعقوب کو مضاربت پر مال دیا کہ منافع دونوں میں مشترک ہوگا۔[2]

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کسی شخص کو مال مضاربت پر دیکر فرماتے، اس کو لیکر بطن وادی سے نہ گزرنا اور اس سے جانور نہ خریدنا اور سمندر میں اس کو لیکر سفر نہ کرنا، اگر ان میں سے کسی شرط کی بھی خلاف ورزی کرے گا تو ہلاک ہونے کی صورت میں اس مال کا ضامن ہوگا۔ اور

---

۱ [الموطا:۲/۸۸] ۲ [بیہقی:۶/۱۱۱]

مضاربت کی مشروعیت کی عقلی دلیل بھی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو اس طرح کے کاروبار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے کہ بعض لوگوں کے پاس مال تو ہوتا ہے مگر کاروباری طریقوں سے ناواقف ہوتے اور بعض کاروبار کے طور طریقے سے خوب آگاہ اور اس کام کو طریقے سے کرنے کے ماہر ہوتے ہیں مگر ان کے پاس مالی کمزوری کی رکاوٹ ہوتی ہے تو دونوں قسم کے لوگوں کو مضاربت پر کام کرنے کیلئے حاجت وضرورت پیش آتی ہے تاکہ ناتجربہ کار کا مال اور فن تجارت سے واقف کا عمل دونوں کارگر ہوں۔

کن الفاظ سے عقد مضاربت منعقد ہوتا ہے؟

یعنی رب المال مضارب سے کہہ دے کہ یہ مال میں نے تجھے مضاربت کیلئے دیا ہے یا یہ کہہ دے کہ یہ مال لے اور کاروبار کر، منافع ہمارے درمیان مشترک ہوگا۔ نصف میرا اور نصف تیرا، یا کہے کہ ایک تہائی منافع میرا دو تہائی تیرا اسی طرح ایک چوتھائی میرا تین چوتھائی تیرا ہوگا۔ ایک کا مال دوسرے کی محنت ہوگی۔

مضاربت کے صحیح ہونے کی شرط

(۱) مضاربت صرف اس نقدی کے ساتھ صحیح ہوگی جس سے شرکت درست ہوتی ہے۔

(۲) عقد کے وقت اصل سرمایے کی تجدید وتعیین ہو اور مضارب کے حوالے کر دیا گیا ہو اور اصل مالک کے قبضہ میں نہ ہو۔ رب المال (اصل مالک) کے کام کرنے اور تجارت میں عملی دخل اندازی کی شرط لگانا جائز نہیں۔ اگر رب المال کے عمل کی شرط لگائی گئی تو مضاربت فاسد ہو جائے گی۔ کیوں کہ مضارب کے قبضے کی عدم تکمیل ہے، اور مکمل قبضہ کئے بغیر وہ اس پر کماحقہ تصرف کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

(۳) منافع کسی ایک کیلئے متعین طور پر مقرر نہ ہو، بلکہ شائع ہو، اس لئے کہ ایک کیلئے ایک متعین اور مقرر مقدار کرنے سے شرکت ختم ہوتی ہے کیوں کہ یہ ممکن ہے نفع صرف اتنا ہی ہو جو ایک کیلئے مقرر کیا گیا ہے مثلاً یوں شرط لگائی گئی کہ منافع میں ایک ہزار یا پانچ سو یا کم وبیش رب المال کیلئے یا مضارب کیلئے ہوگا تو اس سے عقد مضاربت فاسد ہوگا۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ منافع صرف اتنا ہی ہو جتنا مقرر کیا گیا ہے تو دوسرا یکسر محروم ہوگا۔ لہٰذا اس قسم کی شرط لگانے سے مضاربت جاری رہی تو منافع حاصل ہو یا نہیں تو مضارب کو بہر صورت اجر مثل ملے گا۔ البتہ ربح (پرافٹ) میں اس کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس نے عقد فاسد کے ساتھ عمل

کیا ہے۔تو مقتضاء عقد کے مطابق اس کو کچھ نہیں ملے گا، البتہ مضاربت فاسدہ میں مال ہلاک ہوجائے تو مضاربت پر قیاس کرتے ہوئے اس پر کوئی تاوان نہیں آئے گا۔

(۴) ہر ایک کیلئے ربح (پرافٹ) کی مقدار کیا ہوگی معلوم ہونا ضروری ہے (مثلاً کل منافع کا نصف، یا ایک تہائی یا دو تہائی وغیرہ)۔

(۵) مضارب کو جو ملے گا وہ ربح سے ملے گا اور اگر رأس المال میں سے حصہ مقرر کیا جائے تو فاسد ہوگا۔پس مضارب ربح (پرافٹ) میں رب المال کا شریک ہےاور مضارب کا سرمایہ (رأس المال) تجارت وکاروبار کرنا اوراس کے لئے چلنا پھرنا ہے۔جب رأس المال اس کے حوالہ ہوگیا تو وہ اس کے ہاتھ میں امانت ہے۔کیوں کہ اس نے مالک کی اجازت سے اس پر قبضہ کیا ہے۔جب اس میں تصرف کرے گا تو اس کی طرف سے وکیل ہوگا جب منافع حاصل ہوگا تو شریک ہوگا کیوں کہ رأس المال کے بغیر منافع کی ملکیت نہیں آتی اور اس کو رأس المال کا عارضی مالک بنایا گیا ہےتو اس کا حصہ قرض کے طور پر باقی رہے گا اور جب مضاربت فاسد شرط کی وجہ سے فاسد ہوجائے تو وہ اجارۂ فاسدہ کے حکم میں ہوگا اور اجارۂ فاسدہ میں اجرت مثلی ہےتو یہاں بھی مضارب کو اجرت مثلی ملے گی۔

مضارب کا رب المال کی شرط کی مخالفت کرنا

مضارب اگر رب المال کی لگائی ہوئی شرط کی خلاف ورزی کرے گا تو غاصب کے حکم میں ہوگا اور مال کے ہلاک ہونے کی صورت میں تاوان اس پر آئے گا البتہ منافع (پرافٹ) سارا مضارب کا ہوگا البتہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ مال اس کے لئے حلال نہیں ہوگا ربح مضارب کا اس لئے ہوگا کہ اس نے غاصب کا درجہ اختیار کیا اور غصب میں غاصب صرف راس المال کا ضمان ادا کرتا ہےاور اگر مضارب رب المال کی شرط کی مخالفت سے باز آکر دوبارہ اس کی شرط کے مطابق کاروبار کرنے لگا تو مضاربت بھی دوبارہ صحیح ہوجائے گی۔

مضاربت کی اقسام

مضاربت کی دو قسمیں ہیں: (۱) مضاربت عامۃ (۲) مضاربت خاصہ۔

مضاربت عامہ کی پھر دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: یہ ہے کہ مال مضاربت پر دیدے مگر اس کو شرط کاروبار کی کچھ بھی نہ کہے تو اس صورت میں اس مال میں وہ تمام تصرفات کرسکتا ہےجن کی تجارت میں ضرورت پڑسکتی ہے۔اس میں بطور

رہن لینا دینا، کرایہ کیلئے لینا دینا اور ہر وہ عمل جو کاروبار میں ہوتا ہے کیا جا سکتا ہے مگر کسی کو مفت دینا، یا بطور مضاربت آگے کسی اور کو دینا، کسی سے شراکتی کاروبار کرنا اور مضاربت کے لئے دین لینا وغیرہ نہیں کر سکتا ہے۔

دوسری قسم: یہ ہے کہ رب المال مضارب سے کہے کہ اپنی رائے کے مطابق جو چاہو کاروبار کرو، تو اس صورت میں مذکورہ جائز کاروبار کرنا درست ہیں اور اسی طرح مضاربت کیلئے دینا بھی اس لئے جائز ہے کہ یہ تجارتی امور میں داخل ہیں البتہ کسی کو قرض یا تبرعاً دینا تجارتی امور میں داخل نہیں اور رب المال کا حکم اس کو شامل نہیں ہوسکتا۔

مضاربت خاصہ: کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم یہ ہے کہ رب المال مضارب کو کسی خاص شہر میں کاروبار کرنے کی قید لگا دے، مثلاً کہدے تم صرف لاہور میں کاروبار کر سکتے ہو۔

دوسری قسم: یہ ہے کہ کسی خاص شخص کے ساتھ کاروبار کرنے کی شرط لگا دے، مثلاً کہے کہ فلاں شخص کے ساتھ معاملات کرو، اسی سے خریدو اور اسی کے ہاتھ فروخت کرو، تو مضارب کیلئے اس کی پابندی ضروری ہے اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس شخص کے معتمد ہونے کی بنا پر اس کے ساتھ کاروبار کرنے کا حکم دیا اور ایسا کرنا جائز ہے۔

تیسری قسم: یہ ہے کہ کسی خاص نوع کا کاروبار کرنے کی شرط لگا دے، مثلاً کہے کہ تم اس سے صرف کپڑے کا کاروبار کر سکتے ہو یا کہے کہ تم صرف چاولوں کی تجارت کر سکتے ہو اس صورت میں بھی مضارب کیلئے اس کی پابندی ضروری ہے۔ مخالفت جائز نہیں ہے۔

اگر رب المال ایک شہر کے ایک ہی بازار میں کاروبار کی شرط لگا دے، مثلاً کہہ دے تم صرف انارکلی بازار میں کاروبار کر سکتے ہو، یا کہہ دے صرف شاہ عالمی میں کاروبار کر سکتے ہو کسی دوسرے بازار میں نہیں تو مضارب کیلئے اس کی پابندی ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ایک شہر کے تمام بازار کاروباری لحاظ سے تقریباً مساوی ہیں، ہاں اگر رب المال یوں کہہ دے تم صرف منڈی میں یا بازار و مارکیٹ میں کاروبار کر سکتے ہو اور اس نے خلاف ورزی کر کے دوسری جگہ کاروبار کیا اور مال ہلاک ہو گیا تو ضامن ہو جائے گا۔ کیوں کہ دوسری جگہ کاروبار نہ کرنے کی صراحت کی ہے۔ چونکہ رأس المال (سرمایہ) مضارب کے ہاتھ میں امانت ہے ہلاک کی صورت میں ضمان نہیں مگر ایک حیلہ کے ذریعے مضاربت کی صورت میں بھی اس کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

مضارب کو ضمان کے تحت لانے کا حیلہ

رب المال مضارب کو بطور قرض رقم دے اور اس کے حوالہ کرے اور اس پر گواہ مقرر کر دے۔ پھر اسی مال کو رب المال مضارب سے بطور مضاربت کے واپس لے لے، پھر دوبارہ اس کو دیکر کہے کہ کاروبار کے سلسلے میں میری مدد کرو، اس صورت میں اگر یہ مال اس کے ہاتھ سے ہلاک ہو جائے گا تو ہر صورت میں قرض ادا کرنا اس پر لازمی ہے اور منافع کمایا تو وہ دونوں میں مشترک ہوگا۔

مضارب کی مختلف حیثیات

مضارب کے پانچ مراتب ہیں: ابتداء میں وہ امین ہے، جب اس پر تصرف کرے گا تو وہ وکیل ہوگا، جب منافع کمایا تو وہ شریک وحصہ دار ہوگا، جب مضاربت فاسد ہو جائے تو وہ اجیر ہے، جب رب المال کے حکم کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ غاصب ہوگا۔

مضاربت میں وقت کی تعیین

اگر رب المال مضارب کیلئے وقت کی تعیین کر دے اور مدت گزر جائے تو مضاربت ختم ہو جاتی ہے اس لئے کہ توقیت مقید ہے اور وہ وقت مقررہ کے ساتھ مقید ہے اور مضارب وکیل ہے وہ وقت مقررہ کے ساتھ موقت ہوتا ہے۔

مضاربت میں مضاربت

رب المال نے مضارب کو مال دیکر کہا کہ اس سے اللہ تعالیٰ جو رزق عطاء فرمائے گا وہ ہمارے درمیان برابر ہے اور مضارب کو آگے بطور مضاربت کے کسی اور کو دینے کی اجازت دیدے اور مضارب نے آگے مضاربت پر کسی کو اس شرط پر دیدیا کہ منافع کا ایک تہائی دوسرے مضارب کو ملے گا تو اس صورت میں نصف منافع رب المال کا، اور ایک تہائی مضارب ثانی کا، جب کہ ایک ۱/۶ منافع مضارب اول کو ملے گا۔ اس لئے کہ نصف مالک کیلئے اور نصف تھا مضارب اول کیلئے جب اس نے مضارب ثانی کیلئے ایک تہائی کی شرط لگائی تو اس کے لئے صرف چھٹا حصہ باقی بچا اور وہ اس کے لئے حلال ہے اور اگر مضارب اول نے مضارب ثانی کو نصف منافع کی شرط پر دیا تو اس کے لئے کچھ نہیں بچے گا کیوں کہ نصف تو رب المال کا اور نصف لے گا مضارب ثانی تو مضارب اول کیلئے کچھ نہیں بچے گا۔

مضارب کا خرچہ

مضارب کا سفری خرچہ و کھانا، سواری وغیرہ کا کرایہ واپس اپنے شہر پہنچنے تک، مال مضاربت سے نکالا جائے گا۔

جب اپنے شہر پہنچ جائے تو اپنا ہی خرچ ہوگا اور سفری اخراجات ضرورت یا تجارت میں سے ہیں، سفر میں کھانا پینا گاڑی کا کرایہ، کپڑوں کی صفائی، رہنے سہنے، ہوٹل وغیرہ کے اخراجات وغیرہ سفری ضروریات میں سے ہیں اور یہ سارے اخراجات مضاربت کے منافع سے وصول کئے جائیں گے۔ اگر منافع نہ ہوتو رأس المال سے خرچ کیا جائے گا۔

اگر مضارب نے اپنے ذاتی مال سے خرچ کیا یا اپنے نفقہ کیلئے قرض لیا تو اس کو مضاربت کے مال سے وصول کرے گا۔ اگر مضارب دو آدمیوں کا مال لیکر مضاربت کر رہا ہے تو دونوں کے مالوں سے نفقہ وصول کرے گا۔ اگر مضاربت فاسد ہو جائے تو مضارب کیلئے کوئی خرچہ نہیں ہوگا کیوں کہ وہ اجیر ہے اور اجیر اپنا نفقہ خود برداشت کرتا ہے۔

مضاربت کا بطلان

مضارب کے مرنے سے مضاربت باطل ہو جاتی ہے اور رب المال کے مرنے اور رب المال کے مرتد ہو کر دارالحرب جانے سے بھی مضاربت باطل ہو جاتی ہے کیونکہ مرتد ہونے کی وجہ سے اس کی ملکیت اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوگئی، مرتد ہو کر دارالحرب منتقل ہونا گویا مرنا ہے، جب تک دارالحرب کی طرف منتقل نہیں ہوتا اس وقت تک مضاربت موقوف رہے گی اگر دوبارہ اسلام کی طرف لوٹ آیا تو مضاربت باطل نہیں ہوگی۔ اور مضارب کے مرتد ہونے سے مضاربت باطل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ رب المال کی ملکیت قائم ہے۔ اگر رب المال نے مضارب کو معزول کیا اور مضارب کو معلوم نہیں ہوا اور وہ حسب معمول کاروبار کرتا رہا تو اس کا یہ تصرف جائز ہے کیوں کہ وہ رب المال کی طرف سے وکیل ہے اور وکیل کی معزولی کا اسے معلوم ہونے تک کام صحیح ہوسکتا ہے۔ اگر مضارب کو معزولی کا علم تو ہو گیا مگر مال مضاربت سامان کی صورت میں ہے تو ان کو بیچ کر نقدی حاصل کرسکتا ہے معزولی اس کو اس سے نہیں روک سکتی ہے کیوں کہ مضاربت خریدنے سے مکمل ہوتی ہے اور صحیح ہوتی ہے۔ خریداری کے بعد رب المال کیلئے مضارب کو معزول کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا حق ربح (پرافٹ) میں ثابت ہو چکا ہے اور اگر معزولی کے وقت سارا مال مضاربت نقد ہو، تو پھر مضاربت کیلئے تصرف جائز نہیں ہے۔

رب المال اور مضارب میں جدائی ہوئی اور سرمایہ پر قرض تھا اور مضارب نے اس سرمایہ سے منافع کمایا تھا، تو عدالت ادائیگی ءدیون کیلئے مضارب کو مجبور کرے گی کیوں کہ مضارب اجیر کے حکم میں ہوتا ہے اور ربح (پرافٹ) گویا اس کی اجرت ہے، تو اجیر کے تمام احکام اس پر لاگو ہوں گے۔ اور اگر جدائی ہوئی اور سرمایہ پر دین ہو اور مضارب نے سرمایہ سے کوئی منافع نہ کمایا ہو تو دین کی ادائیگی رب المال پر واجب ہے۔ کیوں کہ مضارب اس صورت میں وکیل محض ہے اور وکیل محض کا عمل تبرعاً ہوتا ہے اور متبرع کو ادائے تبرع پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ دیون رب المال کی ملک ہے اور اس میں مضارب کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اس سے کہا جائے گا کہ ادائیگی دیون کا تقاضا رب المال سے کیا جائے گا۔ اس لئے کہ عقد کے حقوق عاقد کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔

مال مضاربت میں سے کچھ ہلاک ہونے کا حکم

مال مضاربت میں سے جو ہلاک ہوگا اس کی تلافی ربح سے کی جائے گی رأس المال سے نہیں کیوں کہ ربح (پرافٹ) رأس المال (سرمایہ) کا تابع ہے، ہلاک شدہ کو تابع کی طرف منسوب کرنا اولیٰ ہے جیسا کہ زکوۃ میں نصاب کے ہلاک شدہ مال کو عفو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اگر ہلاک شدہ کی قیمت پرافٹ سے زیادہ ہو تو رأس المال کی طرف بھی لوٹائی جائے گی کیوں مضارب امین ہے اور امین پر تاوان نہیں آتا۔

منافع کی تقسیم کے بعد ہلاک شدہ کا حکم

اگر منافع کو تقسیم کیا گیا مگر مضاربت اپنی جگہ برقرار ہے یعنی ان کی شرکت قائم ہے اور رأس المال میں سے کچھ حصہ یا سارا ہلاک ہوگیا تو رب المال مضارب سے رأس المال کی قیمت پوری ہونے کی بقدر رجوع کرے گا کیوں کہ منفعت رأس المال پر اضافے کا نام ہے اور رأس المال کے وجود کے بغیر منفعت نہیں ہوسکتی تو گویا پہلی تقسیم صحیح نہیں ہوئی۔ پہلے رأس المال کو پورا کیا جائے گا پھر مضارب کا نفقہ پھر منفعت۔

پرافٹ تقسیم کیا گیا اور مضاربت ختم کردی گئی۔ ختم کرنے کے بعد دوبارہ عقد مضاربت کیا گیا۔ پھر مال ہلاک ہوگیا یا کچھ ضائع ہوگیا تو پہلے تقسیم شدہ منافع سے اس کی تلافی نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ پہلی مضاربت مکمل ہوگئی اور دوسری مضاربت جدید عقد ہے تو دوسرے عقد میں ہلاک ہونے کا پہلے عقد کے منافع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿کتاب الوکالۃ﴾

لغت میں وکالت حفاظت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل“ [العمران:۱۷۳]

”اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور بہترین حفاظت کرنے والا ہے۔“

اور تفویض واعتماد کے معنی میں بھی مستعمل ہے، قرآن کریم میں آیت ہے:

”ومن یتوکل علی اللّٰہ فھو حسبہ“

جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہی اس کے لئے کافی ہوتا ہے“ [الطلاق:۳]

یہ دونوں معانی تقریباً ایک ہی ہیں کیوں کہ جو کسی پر اعتماد کر کے اپنا معاملہ اس کے سپرد کرتا ہے تو گویا اس کو اس کی حفاظت کا امر کرتا ہے۔ اور اس کا شرعی معنی ہے کسی پر اعتماد کر کے اپنا کام کرنے کا ذمہ دار بنانا۔

عقد وکالۃ کی مشروعیت

وکالت کی مشروعیت کا ثبوت قرآن، سنت رسول ﷺ، اجماع اور قیاس سے ثابت ہے: قرآن کریم میں کا ارشاد ہے: فابعثوا احد کم بورقکم ھذہ الی المدینۃ فلینظر ایھا أزکیٰ طعاماً“ [الکھف:۱۹] ”اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو شہر میں یہ روپیہ دیکر اپنا، پھر دیکھے کون سا کھانا ستھرا ہے۔“

اور حدیث شریف میں ہے: حضرت عروۃ البارقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان کو ایک دینار دیکر قربانی کیلئے بکری خریدنے کا حکم دیا۔ انہوں نے ایک دینار میں دو بکریاں خریدیں، ایک کو ایک دینار میں فروخت کیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں ایک بکری کے ساتھ ایک دینار بھی پیش کیا۔ تو آپ ﷺ نے ان کے لئے کاروبار میں برکت کی دعا کی، تو اس دعا کا اثر یہ ہے کہ اگر مٹی بھی اٹھاتے اس میں سے منافع ملتا۔[1]

اسی طرح حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ام سلمٰی کے ساتھ نکاح میں عمرو بن امیہ الضمری کو وکیل بنایا تھا۔ نیز اجماع سے بھی اس کی مشروعیت

[1] [سنن ابوداؤد ۳/۲۵۶]

ثابت ہے۔ چنانچہ دور نبوت سے آج تک اس طرح عقد کیا جاتا آ رہا ہے اور عقلاً بھی اس کی ضرورت ثابت ہے۔ کیوں کہ بعض لوگ خود بعض کام نہیں کر پاتے، تو ان امور کو نمٹانے کیلئے کسی کو وکیل بنانے کی ضرورت پڑتی ہے، تو ان کی ضرورت بھی اس کے جواز کی داعی ہے۔

موکل، وکیل اور وکالت

کسی تصرف معلوم میں غیر کو اپنا نائب و قائم مقام بنانے کو وکالت کہتے ہیں اور یہ وکالت کے لفظ سے ہی منعقد ہوتی ہے مثلاً یوں کہ کہے کہ میں نے فلاں کام سرانجام دینے کیلئے تمہیں وکیل بنایا، یا فلاں شئی کو خریدنے یا بیچنے کیلئے تمہیں وکیل بنایا۔ وکیل اس کو بنایا جائے گا جو تصرف کرنے کے قابل ہو اور عقد کو سمجھ کر کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خیبر جانا چاہا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا اور عرض کیا کہ میں خیبر جانا چاہتا ہوں، فرمایا: جب تم میرے وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے پندرہ وسق (۹۰۰ صاع) لے لو اور اگر تم سے کوئی نشانی مانگے تو اپنا ہاتھ اس کے گلے پر رکھو۔[۱] جو عقد خود کرنا جائز ہے اس میں وکیل بنانا بھی جائز ہے۔ اور تمام حقوق کے لین دین میں توکیل جائز ہے، کیوں کہ ہر کام کو ہر ایک نہیں سمجھتا اور اس پر یہ مشہور حدیث بھی دلالت کرتی ہے، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: إنما أنا بشر وإنه يا تيني الخصم فلعل بعضهم أن يكون أبلغ من بعض، فأحسب أنه صادق فأقضي له، فمن قضيت له بحق مسلم فانما هي قطعة من النار، فليحملها أوليذرها"[۲] "میں انسان ہی ہوں، ہوسکتا ہے کہ میرے پاس آنے والا خصم گفتگو میں دوسرے کے مقابلے میں بلیغ ہو، اس کی بلاغت کو دیکھ کر ممکن ہے کہ میں اس کے حق میں فیصلہ دوں (تو سن لو!) میں کسی کے لئے کسی مسلمان کے حق کا فیصلہ کرلوں تو وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، چاہے اس کو لے لے چاہے چھوڑ دے۔"

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خصومت کو پسند نہیں فرمایا کرتے تھے۔ کبھی کسی سے خصومت کا اتفاق ہوتا بھی تو عقیل بن ابی طالب کو وکیل بناتے اور جب عقیل بوڑھے ہوگئے تو مجھے وکیل بنانے لگے"۔[۳]

وکیل کی موجودگی اور عدم موجودگی میں توکیل کا حکم

وکیل کی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں صورتوں میں اس کو وکیل بنانا جائز ہے۔

[۱] [سنن بیہقی: ۸۰/۶]　[۲] [مسلم: ۱۳۳۷/۳]　[۳] [بیہقی: ۸۱/۶]

عبدالرحمٰن بن سہل رضی اللہ عنہ اور ان کے دو چچا زاد بھائیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عبداللہ بن سہل کے قتل کا ذمہ دار یہود کو بنایا تھا۔ اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اپنے بھائی کے متعلق پہلے بولنے لگے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بڑے کو بولنے دو۔ یا فرمایا: چاہیے کہ بڑا پہلے بولے، تو ان سے دونوں بھائیوں نے اپنے بھائی کے قتل کے متعلق گفتگو کی۔"[1] مؤکل کی موجودگی میں توکیل کی صورت ہے۔ توکیل فی الخصومۃ میں حدود و قصاص کو مستثنیٰ کیا جائے گا۔ کیوں کہ حدود و قصاص میں مؤکل کی موجودگی کے بغیر فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ معاف کردے اور معاف کرنا مستحب ہے، جب کہ وکیل کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ خصم (مقابل) کی رضامندی کے بغیر توکیل جائز نہیں ہے۔ الا یہ کہ مؤکل بیمار ہونے یا عدالت سے تین دن کے سفر کی مسافت میں ہونے کی وجہ سے عدالت میں حاضر نہ ہوسکتا ہو تو اپنا مقدمہ لڑنے کیلئے مدمقابل کی رضامندی کے بغیر بھی کسی کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔ اگر بیماری اس کو عدالت میں حاضری سے روکنے والی نہ ہو تو حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک مدمقابل کی رضامندی کے بغیر توکیل جائز نہیں ہوگی۔ تین دن کی مسافت سے کم مسافت والے کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ دلیل اس کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

"ان اللّٰہ یھدی قلبک ویثبت لسانک فإذا جلس بین یدیک الخصمان فلا تقضیّن حتی تسمع من الاخر کما سمعت من الأول فانہ أحری أن یتبیّن لک القضاء"[2] "اللہ تعالیٰ تیرے دل کی راہنمائی فرمادے، تیری زبان کو درست کردے، جب دو خصم تیرے سامنے بیٹھ جائیں جب تک دونوں کی گفتگو نہ سنو ہرگز فیصلہ نہ کرو، دونوں کی گفتگو کو سننا فیصلہ کو مزید واضح کردے گا۔" عورت اگر پردہ نشین ہو وہ مدمقابل خصم کی رضامندی کے بغیر کسی کو وکیل بنا سکتی ہے کیوں کہ پردہ نشینی کی وجہ سے وہ مردوں سے گفتگو کرنے کی عادی نہیں ہوتی اور جب عدالت میں حاضر ہوگی تو شرم و حیا کی وجہ سے گفتگو نہیں کر پائے گی اور اپنا مدعا ثابت نہیں کرسکے گی جو اس کے حق کے فوت ہونے کا سبب بنے گا۔ اس لئے متاخرین فقہا نے عورت کیلئے خود حاضری کے بجائے وکیل بنانے کو مستحسن جانا ہے۔ لیکن اگر عورت پردہ نشین نہ ہو اور عام مردوں کی مجالس میں بیٹھنے کی عادی ہو تو مدمقابل کی اجازت کے بغیر وکیل بنانا جائز نہیں ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خصم کی رضامندی کے بغیر بھی وکیل بنانا جائز ہے۔ یعنی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قاضی کی عدالت میں خصم وکالت کو رد کرسکتا ہے جبکہ حضرات صاحبینؒ کے نزدیک خصم رد نہیں کرسکتا۔

---

[1] [مسلم: ۱۲۹۲/۳]　[2] [ابوداؤد: ۳۰۱/۲]

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ قاضی (جج) کے علم میں ہو کہ موکل کی توکیل کا مقصد وکیل کی چرب لسانی، بات بنانے کی مہارت اور حیلہ کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے مد مقابل کو نقصان پہنچانا ہے تو اس کو چاہئے کہ وکیل کو خصم کی رضا کے بغیر قبول نہ کرے اور اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو تو بغیر رضائے مقابل کے قبول کر لے۔

توکیل خصم کی رضامندی کی شرط صرف خصومات میں ہے۔ باقی دین کو وصول کرنے یا ادا کرنے میں بغیر رضائے خصم بالاتفاق جائز ہے۔

وکلاء جو عقود سرانجام دیتے ہیں دو طرح کے ہیں (۱) وہ عقود جو وکیل کے ساتھ متعلق ہیں (۲) وہ عقود جن کا تعلق موکل کے ساتھ ہے۔

ضابطہ: ہر وہ عقد و معاہدہ جس میں وکیل اس کو اپنی طرف منسوب کرسکتا ہے (جیسے بیع، اجارہ وغیرہ) اس کے حقوق بھی وکیل کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں موکل کے ساتھ نہیں۔ یعنی بیع یا اجارہ کو مؤکل کی طرف منسوب کر کے یوں کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بیع میں فلاں کیلئے کر رہا ہوں۔ یا یہ میں فلاں کیلئے خرید رہا ہوں۔ بلکہ عقد کو اپنی طرف منسوب کر کے کہہ سکتا ہے: یہ چیزیں تم سے خرید رہا ہوں۔ جب یہ بات ہے تو اب اگر وہ بائع بن رہا ہے تو مبیع کو حوالہ کرنا ثمن پر قبضہ اس کی ذمہ داری ہے اگر مشتری ہے تو اس سے ثمن کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے لیکن موکل نے اس کو وکیل بنایا ہے اس لئے ملکیت اس کی نہیں ہوگی بلکہ موکل کی ملکیت ہوگیۃ اور ہر وہ عقد جس کو وکیل اپنی طرف منسوب نہیں کرسکتا بلکہ مؤکل کی طرف منسوب کرتا ہے (مثلاً، نکاح، خلع، قتل عمد پر صلح کرنا، صدقہ، قرض دینا، پارٹنر شپ میں کاروبار کرنا اور مضاربت وغیرہ) اس کے حقوق بھی موکل کے ساتھ متعلق ہوں گے۔ وکیل کے ساتھ نہیں۔ کیوں کہ ان معاملات میں یہ سفیر محض ہے لہٰذا شوہر کے وکیل سے مہر کا مطالبہ اور عورت کے وکیل سے عورت کو حوالہ کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

بیع کا وکیل بنانے والا موکل مشتری سے ثمن کا مطالبہ کرے تو مشتری کو ثمن اس کے حوالے نہ کرنے کا اختیار ہے۔ کیوں کہ عقد سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ بیع کے حقوق عقد کرنے والے سے متعلق ہوتے ہیں، ہاں مشتری اگر ثمن موکل کے حوالہ کر دے تو جائز ہے کیوں کہ نفس ثمن جس پر اس نے قبضہ کیا ہے اسی کا حق ہے، اب وکیل کو مشتری سے دوبارہ ثمن کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ کیوں کہ اس مطالبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ مشتری سے ثمن لے بھی لے تو دوبارہ واپس کرنا ضروری ہے۔

مجہول توکیل (وکیل بنانے) کا حکم

جو شخص کسی کو کوئی چیز خریدنے کیلئے وکیل بنائے تو شئی کی جنس کی تعیین بھی کرے اور اس کی صفت بھی واضح کر دے۔ اور اگر جنس کو مجہول رکھا مثلاً میرے لئے گاڑی خریدو یا کہے کپڑے خریدو، تو یہ توکیل صحیح نہیں ہے اگر چہ ثمن کی تعیین بھی کرے مثلاً کہے کہ میرے لئے دو لاکھ کی گاڑی خریدو۔ کیوں کہ اس صورت میں وکیل کو اس کے حکم کی پیروی کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ جب تک گاڑی یا کپڑے کی نوعیت نہ بتائے گا تو وہ کچھ نہیں خرید پائے گا۔

نوع یہ ہے مثلاً کہے جاپانی کے ٹی چار ہزار جاپانی پجیرو یا کرولا یا ٹیوٹا وغیرہ۔

عیب پر مطلع ہونا

وکیل نے سامان خریدا، بائع کو ثمن بھی حوالہ کر دیا پھر سامان میں موجود عیب پر مطلع ہوا تو جب تک مبیع اس کے قبضے میں ہے اس کو واپس کرنے کا اختیار ہے، کیونکہ یہ عقد کے حقوق میں سے ہے اور اس کو عقد کے تمام حقوق حاصل ہیں، اگر بیع کو موکل کے حوالہ کر دیا تو موکل کی اجازت کے بغیر واپس نہیں کر سکتا، کیوں کہ وکالت مکمل ہوگئی۔

مؤکل کیلئے خریدے ہوئے مال کا حکم

موکل نے وکیل کو کسی مخصوص و متعین شئی خریدنے کا حکم دیا تو وکیل کیلئے اس کو اپنے لئے خریدنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ حکم دینے والے نے اس پر اعتماد کر کے اس کو وکیل بنایا ہے۔ اپنے لئے خریدنا اس کے ساتھ دھوکہ ہوگا اور دھوکہ دینا جائز نہیں ہے۔ اور وکیل حکم کی خلاف ورزی کرنے سے معزول ہو جاتا ہے گویا اس نے خود اپنے آپ کو معزول کیا اور یہ موکل کی موجودگی کے بغیر جائز نہیں۔

مبیع کا وکیل کے ہاتھ میں ہلاک ہونا

کسی کو مال خریدنے کا وکیل بنایا گیا، اس نے مال خریدا اور ثمن میں اپنا مال دیدیا اور مبیع پر قبضہ کر لیا تو ثمن کا مطالبہ موکل سے کرے گا اور اپنا مال اس سے وصول کرے گا کیوں کہ وکیل بنانے کی وجہ سے اپنی طرف سے ثمن دینے کا حکم دلالۃً ثابت تھا۔ کیوں کہ جب موکل کو معلوم تھا کہ عقد کے حقوق عاقد کی طرف لوٹتے ہیں تو گویا اس کے لئے راضی تھا اور اگر اس کی حفاظت میں آنے سے پہلے مبیع ہلاک ہو جائے تو موکل کے مال سے ہلاک ہوگی اور وکیل کا ادا کردہ ثمن ساقط

نہیں ہوگا۔ اور وکیل اپنا ثمن وصول کرنے تک مبیع کی حفاظت کرے اور اگر اس نے اپنی حفاظت میں لی لی اور اس کے ہاتھ سے ہلاک ہوگئی تو رہن کی ضمان کی طرح ضمان تاوان آئے گا تو مبیع کی قیمت اور ثمن کی قیمت میں سے جو بھی کم ہوگا اس کی بقدر تاوان آئے گا۔ مثلاً ثمن پندرہ روپے تھا۔ اور مبیع کی قیمت دس روپے تو مؤکل وکیل سے پانچ روپے کا مطالبہ کرے گا یہ قول امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق مبیع کے ضمان کی طرح ضمان واجب ہوگا۔ یعنی ثمن قلیل ہو یا کثیر ثمن ساقط ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی ہے۔

وکیل کا آگے کسی اور کو وکیل بنانا

وکیل کسی اور کو موکل کی اجازت کے بغیر وکیل نہیں بنا سکتا، ہاں البتہ اگر مؤکل نے اس کو مطلق اجازت دی مثلاً یوں کہہ دیا ہو کہ اپنی رائے کے مطابق جو مرضی کرو، تو اس کو اختیار ہے کہ وہ کسی اور کو وکیل بنا سکتا ہے۔

اختیار نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مؤکل نے وکیل کو تصرف کرنے کا کام اس لئے سونپا ہے کہ وہ اس کی رائے سے واقف اور اس پر اعتماد کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے دوسرے پر اسے اعتماد نہ ہو کیوں کہ لوگوں کی آراء مختلف ہوتی ہیں تو وکیل کے بغیر کسی اور کو اپنا کام سونپنے پر راضی نہیں ہوگا۔ ہاں اگر موکل اس پر راضی ہوگیا تو وکیل بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جب موکل کی اجازت یا اس کی مطلق حکم دینے کی صورت میں آگے وکیل بنایا تو وکیل اول کیلئے وکیل ثانی کو معزول کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی اس کے مرنے سے وہ معزول ہوگا البتہ مؤکل اول کی موت سے دونوں معزول ہوں گے، اگر وکیل نے موکل کی اجازت کے بغیر وکیل بنایا۔ اس نے وکیل اول کی موجودگی میں کوئی خرید وفروخت کی تو عقد درست ہوگا کیوں کہ وہ اس کی رائے کے مطابق منعقد ہو۔ اسی طرح اگر وکیل اول کی غیر موجودگی میں کوئی عقد کیا اور وکیل اول نے اس کو درست قرار دیا تو یہ بھی جائز ہے کیوں کہ یہ بھی اس کی رائے کے مطابق وقوع پذیر ہوا۔

البتہ اس بات میں فقہاء میں اختلاف ہے کہ عقد کے حقوق کس کے متعلق ہوں گے، وکیل اول کے یا وکیل ثانی کے، تو امام بقالی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول وکیل اول اور قاضیخان رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کے مطابق وکیل ثانی سے متعلق ہوں گے۔

وکالۃ سے معزول کرنا

موکل کو اختیار ہے جب چاہے وکیل کو معزول کرسکتا ہے، کیوں کہ وکیل بنانا اسی کا حق

ہے اور باطل کرنے کا بھی اسے حق حاصل ہوگا۔ الا یہ کہ اس کے ساتھ غیر کا کوئی حق متعلق ہو گیا ہو، کیوں کہ حقدار کی رضامندی کے بغیر اس کو معزول نہیں کرسکتا مثلاً کسی نے مرہون مال کو کسی تیسرے عادل شخص کے پاس بطور امانت رکھا اور مدت رہن کی تکمیل پر فروخت کرنے کا وکیل بنایا۔ پھر راہن نے اس کو معزول کر دیا تو معزول کرنا صحیح نہ ہوگا اگر وکیل بنانا رہن کے ساتھ مشروط ہو۔

اگر وکیل دور ہو، مؤکل نے بذریعہ خط یا بذریعہ زبانی پیغام کے وکیل کو معزول کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں نے تجھ کو وکالت سے معزول کر دیا اور وکیل کو پیغام یا خط پہنچ گیا تو وہ معزول ہو جائے گا۔ معزول ہونا وکیل کے علم میں آنا ضروری ہے۔ چنانچہ موکل نے معزول کر دیا اور وکیل کو معلوم نہیں ہے تو معزول نہیں ہوگا اور اگر موکل نے وکیل کی عدم موجودگی میں اس کو معزول کر دیا اور اس پر گواہ بھی مقرر کر دیا مگر وکیل کو معلوم نہیں ہوسکا اور وہ حسب معمول خرید وفروخت کرتا رہا تو اس کا یہ تصرف جائز ونافع ہوگا۔

وکالۃ کے بطلان کی صورتیں

(۱) موکل کے مرجانے اور مکمل طور پر مجنوں ہونے کی وجہ سے وکیل معزول ہو جائے گا۔ ہاں اگر موکل ایسی جگہ پر ہو جہاں وہ وکیل کو معزول کی خبر نہیں پہنچا سکتا تو جنون سے معزول نہیں ہوگا۔ موکل کی موت یا جنون کی وجہ سے وکیل معزول اس لئے ہوگا کہ وکیل جو تصرف کرتا ہے وہ مؤکل کے حکم سے کرتا ہے اور اگر وہ مرجائے تو اس کا حکم بھی باطل ہوگا۔ اور وکیل کا تصرف بغیر حکم اور امر کے ہوگا لہٰذا جائز ہونا ہی وکالت کو باطل کرے گا۔ اور جنون مطبق نہ ہو۔ کبھی ہوش میں آتا ہے اور کبھی دماغ کام نہیں کرتا تو یہ بے ہوشی کے حکم میں ہوگا۔ اس سے وکالۃ باطل نہیں ہوگی اور بے ہوشی مرض ہے اور مرض وکالۃ کو باطل نہیں کرتا۔ مکمل جنون کی حد بقول بعض ایک مہینہ اور بعض کے بقول سال کا اکثر حصہ ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پورا سال ہے۔

(۲) مؤکل کے خود تصرف کرنے سے بھی وکالت باطل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کسی چیز کو خریدنے یا فروخت کرنے کا وکیل بنایا پھر موکل خود اس کو خریدنے یا فروخت کرنے لگا یا اس کے لئے کوئی دوسرا وکیل بنایا اور اس نے تصرف کیا تو پہلی وکالت باطل ہوگئی کیوں کہ جب اس نے خود تصرف کیا تو وکالت ختم ہوگئی۔

وکیل کیلئے اپنے اصول وفروع سے خرید وفروخت کا حکم

خرید ورفروخت کے وکیل کیلئے اپنے ماں، باپ، دادا، بیٹے، پوتے اور بیوی وغیرہ سے خریدنا یاان کو بیچنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس میں وکیل پر منفعت حاصل کرنے کا الزام آتا ہے کیوں کہ وکیل امین ہوتا ہے۔ مذکورہ افراد اوران کے اس منافع ومشترک ہیں۔ یہی حکم اجارہ اورصرف کا بھی ہے اسی وجہ سے اس کے حق میں ان حضرات کی گواہی بھی قابل قبول نہیں۔

ہاں موکل نے ان حضرات کے ساتھ کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے یا وکیل کومکمل اختیار دیا ہے کہ وہ جس سے خریدے یا جن کوفروخت کردے کرسکتا ہے تو اس صورت میں مذکورہ افراد سے خریدنے یاان کو بیچنے کی اجازت ہوگی۔ موکل کے مال کوخود اپنے آپ کوفروخت کرنے کا اختیارنہیں ہوگا۔ اگرچہ موکل اس کی تصریح بھی کردے۔

موکل نے کہا میرا نکاح کسی عورت سے کرادوتو وکیل نے اس کا نکاح اپنی بیٹی سے کرادیا اگر بیٹی نابالغ ہوتو بالاجماع جائزنہیں ہے اوراگر بالغ ہوتب بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں اور ابو یوسف اور محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے، اسی طرح اس عورت کا نکاح اس کے ساتھ کرانا صحیح نہیں ہوگا جس کی گواہی اس کے حق میں مقبول نہیں ہاں اگر اپنی بہن وغیرہ کا نکاح اس کے ساتھ کرادیا تو بالاتفاق جائز ہے۔

بیع وشراء میں وکیل مطلق کے تصرف کا اثر

مطلق کوئی شئی فروخت کرنے کا وکیل بنایا تو وہ قلیل کثیر ہرلحاظ سے بیع کرسکتا ہے، کیوں کہ بیع کا حکم محدود اور مقید نہیں ہے بلکہ عام ہے اور بیع نام ہے مال کو مال کے ساتھ تبدیل کرنے کا۔ وہ قلیل کوبھی شامل ہے۔ عام ہونے کی وجہ سے سامان کے بدلے بیچنے کوبھی شامل ہے۔ جس طرح رقم کے عوض فروخت کرنا اس کے تحت داخل ہے اسی طرح نقد اور دین کے ساتھ بیچنے کوبھی شامل ہے۔ یہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ ہاں اگر موکل نے کہا: اس کوایک ہزار نقد کے بدلے فروخت کروتو اس طرح کرنا ہی جائز ہوگا۔

اور خریدنے کے وکیل کو مارکیٹ ریٹ کے مطابق یا تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ خریدنے کا اختیار ہوگا البتہ غبن فاحش (بہت زیادہ قیمت) پرخریدنا جائزنہیں ہوگا۔ غبن فاحش عام قیمت سے بہت زیادہ کو کہتے ہیں۔ اشیاء کے اوپر لکھی ہوئی قیمت آخری قیمت ہے۔ عام تاجر اس قیمت سے کم کرکے دیتے ہیں لہٰذا لکھی ہوئی قیمت (پرائز) سے زیادہ قیمت پرخریدنا غبن فاحش

کے تحت داخل ہوتا ہے اور زمین میں عام ریٹ سے بیس فی صد زیادہ لینا غبن فاحش ہوگا۔

کیا وکیل بالخصومت وکیل بالقبض ہوتا ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وکیل بالخصومت وکیل بالقبض بھی ہوتا ہے۔ یعنی ایک شخص نے کسی شخص کے ساتھ خصومت کیلئے کسی کو وکالت کرنے کا حکم دیا جس پر اس کا قرض ہے اور اس کے پاس اس کی رسید بھی موجود ہے تو وکیل اگر گواہوں یا مدیون کے اقرار کے ساتھ اس کو ثابت کر دے تو وکیل کو دین اپنے قبضے میں لینے کا اختیار ہوگا۔ اگر چہ موکل نے دین کو قبضہ کرنے کا باقاعدہ حکم نہ بھی دیا۔ ہو اور آج کل لوگوں کی نیتوں میں فساد واقع ہونے کی بنا پر وکیل کو قبضے کا اختیار نہ ہوگا۔ اور دین وصول کرنے پر کسی کو وکیل بنایا تو اس کو عدالت میں مقروض کو لانے اور خصومت کا اختیار بھی ہوگا کیوں دین کو وصول کرنے کا مطالبہ دین کے بغیر نہیں ہوسکتا بعض دفعہ مطالبہ میں مخاصمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قول امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

جبکہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کہتے ہیں۔ وکیل بالقبض وکیل بالخصومت نہیں ہوسکتا، کیوں بعض لوگ قبضہ کرنے اور دین وصول کرنے کی تو اہلیت رکھتے ہیں مگر کیس لڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

کسی شخص نے قرض خواہ کی طرف سے قرضہ وصول کرنے کا وکیل ہونے کا دعویٰ کیا اگر مقروض اس کی تصدیق کر دے تو مقروض کو حکم دیا جائے گا کہ دین اس کے حوالے کر دے، اگر مدیون اس کی تصدیق نہ کرے، یا اس کو جھٹلا دے تو مدیون کو دین حوالہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا۔

جب مدیون نے دین ان کے حوالہ کر دیا تو دوبارہ اس سے واپس کرنے کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اگر قرض خواہ آکر اس کی تصدیق کر دے تو ٹھیک ہے۔ معاملہ صاف ہے۔ اور اگر تصدیق نہ کرے اور کہہ دے کہ میں نے اس کو دین وصول کرنے کا وکیل نہیں بنایا تھا تو مقروض دین، قرض خواہ کو دیدیگا اور وکیل سے اپنا ادا کردہ مال واپس لے گا اگر اس کے پاس موجود ہو، اگر موجود نہ ہو تو قرض خواہ پر رجوع نہیں کرسکتا، کیوں کہ اس نے پہلے اس کی تصدیق کر کے اس کے حق پر ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ اس صورت میں قرض خواہ مظلوم ہے۔ اور مظلوم کیلئے کسی پر ظلم کرنا درست نہیں۔ ہاں اگر مدیون نے وکیل کے دعوے کی تکذیب کی تھی مگر محض اس کے دعویٰ کی بنیاد پر اس کو دیدیا تھا اور صاحب مال نے آکر مدیون سے مطالبہ کیا تو مدیون وکیل سے مطالبہ کرے گا کیوں کہ اس نے اس کو وکیل مانے بغیر محض اس کے دعوے کی بنیاد پر صحیح ہونے کی امید کے ساتھ دیا تھا۔ جب اس کی امید منقطع ہوئی تو اپنے مال کی وصولی کیلئے وکیل سے مطالبہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ان تمام صورتوں

مین وکیل کوحوالہ کرنے کے بعد جب تک صاحب مال حاضر نہیں ہوتا اس وقت تک اس سے واپس کرانے کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

امانت رکھنے والے کے وکیل کواس کی امانت دینے کا حکم

اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ میں فلاں شخص کا وکیل ہوں کہ اس کی امانت وصول کروں گا تو محض اس کے دعوے کی بنیاد پر امانت کے طور پر رکھا ہوا مال اس کے حوالہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر چہ امین (جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے) اس کی تصدیق کردے، اگر کوئی دعویٰ کرے کہ مودع (امانت رکھنے والا) کا انتقال ہوگیا ہے اوراس کی رکھی ہوئی امانت کا وہ وارث ہے۔ جس کے پاس امانت موجود ہے وہ بھی اس کی تصدیق کردے تو حکم دیا جائے گا کہ مال اس کے حوالہ کردو، کیوں کہ جب اس نے موت اور وارث ہونے کی تصدیق کردی تو مال کا اصل مالک وہی ہوگیا۔ کیونکہ مورث کے انتقال کے بعد مال کا اصل مالک وارث ہی ہوسکتا ہے اگر کوئی شخص امانت رکھنے والے سے اس کوخریدنے کا دعویٰ کرے اور مودع اس کی تصدیق بھی کردے تو بھی امانت حوالہ کرنے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

وکالت میں وکیل کے مال کا خرچ کرنا

مؤکل نے ایک شخص کوایک ہزار روپے دے کرکہا کہ اس سے میرا قرض ادا کردو، وکیل نے وہی ہزار روپے نہیں بلکہ اپنے روپوں میں سے ہزار روپے دیدیا تو جائز ہے۔ وہ مؤکل کے روپوں کو اپنے پاس رکھ لے گا، اس طرح ایک ہزار روپے دیکر کہا: ان روپوں کی میرے لئے فلاں چیز خریدو، وکیل نے اپنے پاس سے روپے دیکر خریدا اور موکل کے روپوں کو اپنے پاس رکھا، یہ بھی جائز ہے۔

وکالت سے متعلق چند متفرق مسائل

موکل نے ایک شخص کو مال دیکر کہا: میری اجازت کے بغیر اس میں تصرف مت کرو، اگر وکیل نے موکل کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کردیا تو وہ غاصب کے حکم میں ہوگا۔ ہلاک ہونے کی صورت میں تاوان ادا کرے گا۔ دین وصول کرنے کیلئے وکیل کو اجرت دینا جائز ہے۔

﴿کتاب الکفالۃ﴾

کفالۃ کا لغوی معنی: ''ملانا ہے'' ارشاد خداوندی ہے:

''فکفلھا زکریا'' [آل عمران: ۳۷]

''اور سپرد کی زکریا کو۔''

یعنی اسکے امور نمٹانے کیلئے اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی ملا کر ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''انا و کافل الیتیم فی الجنۃ ھکذا''[۱] ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اس طرح اکٹھے جنت میں ہوں گے۔''

اور شرعی معنی یہ ہے کہ مطالبہ میں اصل کے ذمے کو کفیل کے ذمہ کے ساتھ ملانا۔ یہی وجہ ہے کہ اصیل (وہ جس سے کسی حق دینے کا مطالبہ کیا جائے) کو اگر معاف کر دیا گیا تو کفیل کیلئے بھی معافی ہوگی۔ مگر کفیل کو بری کرنے کی صورت میں اصیل بری نہیں ہوگا کیوں کہ دین اس کے ذمہ ابھی باقی ہے۔ کفالۃ تاوان اور اعتماد کا عقد ہے، انسانی ضرورت کے پیش نظر مشروع ہے اور مکفول لہ کیلئے اپنے حق کے احیاء تک رسائی ہے۔ کفالت میں اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں ملامت، درمیان میں ندامت اور اخیر میں غرامت (تاوان بھرنا)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت لوگوں میں عقد کفالت کا رواج تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے ''الزعیم غارم'' ''کفیل ضامن ہوتا ہے''[۲] ایک مقام پر ارشاد فرمایا: ''أخذ من متھم کفیلاً تثبتاً و احتیاطاً'' میں احتیاط اور تثبت کے لئے متہم شخص کفیلاً لیتا ہوں۔''[۳] کفالت کی دو قسمیں ہیں کفالۃ بالنفس (۲) کفالۃ بالمال۔ کفالۃ بالنفس میں ایک کفیل مکفول بہ اور مکفول لہ، جبکہ کفالۃ بالمال میں کفیل، مکفول عنہ اور مکفول لہ ہوتا ہے۔ چنانچہ کفالۃ بالنفس میں صاحب حق کو مکفول لہ، اور مطلوب شخص مکفول بہ، حاضر کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے والا کفیل ہوتا ہے جبکہ کفالۃ بالمال میں صاحب حق مکفول لہ، ذمہ داری لینے والا کفیل اور جس کی ذمہ داری لی جاتی ہے وہ مکفول عنہ کہلاتا ہے۔

---

[۱] [بخاری: ۱۲۷۸] [۲] [ترمذی: ۳۶۸/۲] [۳] [بیہقی: ۲۷/۶]

"کفالة بالنفس" (مطلوبہ انسان کو حوالہ کرنا) میں کفیل یوں کہے گا میں فلاں شخص کو، یا فلاں کی ذات کو حاضر کرنے کی ضمانت دیتا ہوں، یا یوں کہے فلاں کو حاضر کرنا میری ذمہ داری ہے یا میرے اوپر لازم ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ "انا اولی بالمؤمنین من انفسهم من ترک مالا فلأهله، ومن ترک دینا أوضیاعاً فالیّ وعلیّ"[۱] اگر مکفول (جس کو حاضر کرنے کی ضمانت دی گئی ہو) متعین وقت میں حاضر کرنے کی ضمانت دے تو کفیل پر مطالبہ کرنے کی صورت میں وقت مقررہ پر مکفول بہ کو حاضر کرنا نہایت ضروری ہے۔ کفیل نے اس کو ایسی جگہ میں مکفول لہ کے حوالہ کر دیا جہاں وہ اس کو حاضر عدالت کر سکتا ہے تو کفیل بری ہوگا۔ اور اگر ایسی جگہ میں حوالہ کیا جہاں مکفول لہ کیلئے اس سے کیس لڑنا ممکن نہ ہو تو بری نہ ہوگا۔ اگر وقت متعینہ پر شہر سے مکفول لہ غائب ہو گیا تو عدالت کفیل کو اتنا وقت دے گی کہ وہ اس کو لانے کیلئے آئے جائے اگر مدت گزر گئی اور کفیل اس کو حاضر نہیں کر سکا تو عدالت کفیل کو پکڑے گی اور اگر اس کی عاجزی و بے بسی ظاہر ہو جائے تو اس کو آزاد کر دیا جائے گا۔

حبیب رحمۃ اللہ علیہ (قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت کے ملازم) سے روایت ہے کہ ایک شخص نے قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے عبداللہ کے ساتھ مخاصمت کی، ایک شخص نے اس کو حاضر کرنے کی ضمانت دی، قاضی شریح نے ضمانت دینے والے کو محبوس کیا۔ جب رات ہوئی تو فرمایا: جاؤ عبداللہ کے پاس رات گزارو اور کھانا کھاؤ"[۲] یہ جب ہے جب کفیل کو مطلوب کی جگہ معلوم ہو اور اگر کفیل کو مطلوب کی رہائش معلوم نہ ہو تو مکان کی جگہ معلوم ہونے تک مطالبہ ساقط ہوگا۔ کفالت بالنفس میں مکفول بہ (مطلوب) خود مکفول لہ کے حوالہ کر دے تو قبول کرنے پر مجبور کیا جائیگا اور کفیل بری ہوگا۔ کسی نے ایک مہینہ بعد حاضر کرنے کی ضمانت دی اور مہینہ مکمل ہونے سے قبل حاضر کر دیا تو ذمہ سے بری ہو گیا، کیوں کہ اس نے گویا دین مؤجل (مؤخر) کو پہلے ادا کر دیا۔ کیوں کہ تاخیر کفیل کا حق تھا۔ اس نے اپنا حق تاجیل ساقط کر دیا۔

اور اگر کفیل نے کہا کہ اگر اس نے وہ ایک ہزار جو اس کے اوپر قرض ہے فلاں وقت تک ادا نہ کیا تو میں ادا کروں گا۔ اور مکلفول لہ وقت مقرر میں ادا نہیں کیا۔ تو کفیل سے ایک ہزار روپیہ وصول کیا جائیگا اور کفالت بالنفس سے پھر بھی بری نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ اس دین کے علاوہ اور بھی دین ہو۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی عورت سے کہا: میں تیرے شوہر کو کل حاضر کروں گا اگر نہ

---

[۱] [ابوداؤد: ۳/۱۳۷۱]　[۲] [بیہقی: ۶/۷۷]

کرسکا تو مہر میں ادا کروں گا تو یہ کفالت وضمانت جائز ہے۔ چنانچہ وقت پر اس کے شوہر کو حاضر نہ کرسکا تو مہر ادا کرنا اس پر لازم رہے گا مگر شوہر کو حاضر کرنا پھر بھی اس پر لازم ہوگا۔ کیوں کہ اس نے کفالہ بالنفس کے ساتھ کفالہ بالمال کو بھی اپنے ذمہ لیا ایک کو پورا کیا تو دوسرا باقی رہے گا۔

حدود وقصاص میں ضمانت دینا

حدود وقصاص میں نفس کے حوالے کرنے کی ضمانت دینا جائز نہیں کیوں ان صورتوں میں ضمانت دینے کیلئے مکفول بہ کو حاضر کرنا ممکن نہیں ہے اور وہ حق جس کو پورا کرنا ضامن کیلئے ممکن نہ ہو تو اس میں ضمانت جائز نہیں ہے۔

کفالت (ضمانت) کا ساقط ہونا

مکفول بہ کے مرنے سے کفیل بری ہوگا۔ کفیل کے مرنے سے بھی کفالت (ضمانت) ختم ہو جاتی ہے۔

مالی ضمانت

مالی ضمانت جائز ہے۔ چاہے مال مکفول بہ معلوم ہو یا مجہول۔ بشرطیکہ دین صحیح ہو، مثلاً یوں کہے کہ میں اس کی طرف سے ایک ہزار کی ضمانت دیتا ہوں یا کہے کہ جو مال تیرا اس کے اوپر واجب ہے اس کی ضمانت دیتا ہوں۔

دین صحیح وہ ہے جو صرف ادا کرنے سے یا معاف کرنے سے بری ہو جائے۔ اور مکفول لہ کو اختیار ہوتا ہے چاہے اصل مطلوب سے مطالبہ کرے یا کفیل سے۔

کفالۃ بالمال کو معلق کرنا: مالی ضمانت کو اس کے مطابق شرط کے ساتھ معلق کرنا جائز ہے۔ کیوں کہ وہ ثبوت حق کیلئے سبب بنے گا اور غیر مناسب شرط لگانا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً کہے کہ ہوا چلنے کے وقت یا بارش ہونے کی صورت میں ذمہ دار ہوں۔ اس طرح معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔ نہ اس طرح شرط لگانے سے اس کی پابندی ضروری ہے اسی طرح یوں کہنا بھی غیر مناسب شرط ہے کہ اگر فلاں گھر میں داخل ہو گیا تو اس دین کی ادائیگی میری ذمہ داری ہے۔

کفالۃ بالمال میں اجازت

مکفول عنہ کی اجازت کے بغیر بھی کفالۃ جائز ہے، اگر کفیل نے مکفول عنہ کی اجازت سے ضمانت دی ہے اور مکفول عنہ کی طرف سے ادا کر دیا تو جو ادا کیا ہے اس کو مکفول عنہ سے وصول

کرے گا۔ کیوں کہ اس نے تو اس کے حکم سے اس کا قرض اتار دیا ہے اور اگر اس کی اجازت کے بغیر ذمہ داری لی اور دین ادا کر دیا تو مکفول عنہ سے رجوع نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس نے اپنی طرف سے تبرع کیا۔ البتہ کفیل دین ادا کرنے سے پہلے مکفول عنہ سے اس کا مطالبہ نہیں کر سکتا، اگر کفیل کو ادائیگی پر مجبور کیا گیا تو کفیل مکفول عنہ کو مجبور کر سکتا ہے۔ اگر اس کو محبوس کیا گیا تو وہ مکفول عنہ کو محبوس کر سکتا ہے کیوں کہ یہ ساری کارروائی مکفول عنہ کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو رہی ہے۔ مکفول لہ نے اصل مطلوب کو معاف کر دیا تو کفیل بھی بری ہو جائے گا۔ اگر کفیل کو بری کر دیا تو مکفول عنہ (مطلوب) بری نہیں ہوگا کیونکہ دین ابھی اس کے اوپر باقی ہے اس طرح مکفول لہ نے اصیل (مطلوب) کیلئے مدت بڑھا دی تو کفل کیلئے بھی مدت بڑھ جائے گی اور اگر کفیل کیلئے بڑھا دی تو مکفول عنہ کے لئے نہیں بڑھے گی اعیان مضمونہ بنفسہا میں کفالت صحیح ہے، جیسا کہ خریدنے کیلئے شئی کو قبضہ کرنا، پھر اس کی واپسی کیلئے ضمانت دینا درست ہے۔ اگر کسی نے بائع کیلئے اس ثمن کو حوالہ کرنے کی ذمہ داری لی کہ مشتری نے بیع کو خرید کر قبضہ کر لیا مگر ثمن ابھی ادا نہ کیا ہو، تو یہ صحیح ہے، جو اشیاء خود بنفسہ ضمان نہیں بلکہ غیر کی وجہ سے باعث ضمان بنتی ہیں تو ان میں ضمانت درست نہیں ہے، جیسے وہ مبیع جس پر مشتری نے ابھی قبضہ نہیں کیا تو وہ بنفسہ باعث تاوان نہیں ہے بلکہ غیر کی وجہ سے ہے یعنی ثمن کی وجہ سے اس کا تاوان آتا ہے۔ لہٰذا اس کیلئے کفیل بننا درست نہیں ہے۔

کفالۃ کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ مکفول لہ اس کو مجلس عقد میں قبول کرے، چاہے کفالۃ بالنفس ہو یا کفالہ بالمال۔

اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا اور وہ مقروض تھا، مگر کوئی مال نہیں چھوڑا۔ اور کسی شخص نے قرض خواہوں کو اس کی طرف سے قرض ادا کرنے کی ضمانت دی تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ضمانت درست نہیں ہے اگرچہ وہ وارث ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اس کے مفلس مرنے کی وجہ سے دین تو اس پر سے ساقط ہو گیا۔ یہ گویا اس طرح ہوا کہ دین کی ادائیگی کے بعد کسی کو کفیل بنایا جو بے فائدہ ہے۔ حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ کفالۃ (ضمانت) درست ہے کیوں کہ وہ ثابت شدہ دین کا کفیل بنا۔ جس کو ادا کرنے والا کوئی نہیں ہے اور ساقط کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت میں پھر اس سے مواخذہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنی طرف سے تبرع کرے، تو جائز ہے اور اگر کچھ مال چھوڑ کر مرا جو بعض دین کی ادائیگی کیلئے کافی ہے تو اس کی طرف سے ضامن بننا جائز ہے۔

﴿کتاب الحوالۃ﴾

حوالۃ کا لغوی معنیٰ

حوالہ تحویل سے مشتق ہے، تحویل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کو کہا جاتا ہے۔اور اصطلاح میں قرض کو مقروض کے ذمہ سے دوسرے کے ذمہ ڈال دینے کو حوالہ کہتے ہیں: حوالہ کی بحث کو سمجھنے کیلئے چار اصطلاحات کو سمجھنے کی ضرورت ہے، (۱) محتال یا محال لہ (۲) محیل (۳) محیل علیہ (۴) محال بہ۔محتال یا محال لہ، قرض خواہ (یعنی وہ شخص جس کا قرض ہو) کو کہتے ہیں۔
محیل: وہ شخص جس پر قرض ہو (مقروض) محال علیہ وہ شخص جس پر دین کی ادائیگی کی ذمہ داری ڈال دی جائے اور وہ قبول کرلے۔محتال بہ قرض کو کہا جاتا ہے مثلاً: ارشد پر امجد کے دو ہزار روپے قرض ہیں۔ارشد نے احمد کو اپنا قرض حوالہ کیا اور احمد نے اس کو قبول کیا۔تو امجد محال لہ یا محتال ہے۔ارشد محیل اور احمد محتال علیہ اور قرض (دو ہزار) محتال بہ ہے۔

عقد حوالہ جائز ومشروع ہے۔حدیث سے اس کی مشروعیت ثابت ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ "مطل الغنی ظلم، فإذا اتبع احدکم علی ملئی فلیتبع"[1] "مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی کو حوالہ کیا مالدار پر تو چاہئے کہ حوالہ قبول کرے۔" حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول کرنے کا حکم دیا۔اگر جائز نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا حکم نہ دیتے۔
بعض علماء نے حدیث کے ظاہر امر کو دیکھ کر اس کے وجوب کا قول کیا ہے جبکہ حضرات حنفیہؒ نے اس کو مباح فرمایا ہے۔کیوں کہ کسی کی مرضی کے بغیر اس پر کسی چیز کو لازم نہیں کیا جاسکتا۔اس لئے "فلیتبع" کا امر، اباحت کیلئے ہے وجوب کیلئے نہیں۔

حوالہ دیون میں جائز ہے۔اعیان میں نہیں۔اور مدیون، دائن قرض خواہ اور محال علیہ کی رضامندی سے صحیح ہوتا ہے۔البتہ "الزیادات" میں لکھا ہے کہ محیل (مدیون) کی رضا کے بغیر بھی حوالہ صحیح ہوتا ہے۔کیوں کہ محال علیہ کی طرف سے ادائیگی دین کو قبول کرنا اپنی ذات پر تصرف ہے غیر پر نہیں ہے۔اس میں محیل کو نہ صرف کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہے، کیوں کہ اگر محیل علیہ نے محیل کے حکم کے بغیر خود اپنی طرف سے دین ادا کردیا۔تو محیل کی طرف اس کی وصولی کیلئے رجوع

[1] [بخاری: ۴۴۹]

نہیں کرسکتا۔

اس طرح صاحب "النھایۃ" نے لکھا ہے کہ حوالہ کے صحیح ہونے کے لئے مدیون کی [illegible]ت اور رضامندی شرط نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کسی شخص نے کسی سے کہا: تمہارا فلاں آدمی پر جو قرض [illegible] اس کی ادائیگی کی ذمہ داری میرے اوپر ہے۔ اس نے قبول کیا تو حوالہ صحیح ہے اگر اس نے اس کا قرض [illegible]تار دیا تو وہ محیل (مدیون) سے رجوع نہیں کرسکتا اور مدیون بھی بری ہو جائے گا۔

حوالہ جب مکمل ہو جائے تو محیل (مدیون) دین سے عہدہ برآ ہو جائے گا۔ کیوں کہ حوالہ ہوتا ہی [illegible] کو منتقل کرنے کے لئے ہے جب ایک ذمہ دوسرے ذمہ میں منتقل ہو جائے تو اس کے ذمہ میں [illegible] باقی نہیں رہے گا۔ تو قرض خواہ محال لہ، محیل (قرضدار) سے دین کا مطالبہ نہیں کرسکتا بشرطیکہ ا[illegible] حق نہ ڈوب رہا ہو اگر اس کا حق ڈوب رہا ہو تو بری نہیں ہوگا۔ محیل کی برأت محتال کے حق کی سلا[illegible] کے ساتھ مقید ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محتال کا حق ڈوبنے کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) مح[illegible] علیہ اگر حوالہ کا حلفیہ انکار کرے، اور محتال کے پاس حوالہ کی کوئی گواہی موجود نہ ہو، اور علامہ تمرتا[illegible] رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ محیل اور محال لہ میں سے کسی کے پاس گواہ موجود نہ ہو۔ (۲) دوسری صورت [illegible] ہے کہ محال علیہ حالت افلاس میں مر جائے کوئی ترکہ نہ چھوڑے جس سے اس کا حق ادا نہ ہو[illegible]۔ اگر محال علیہ کا انتقال ہو جائے اور محال لہ کہہ دے کہ محال علیہ مفلس ہو کر مرا اور محیل کہہ دے [illegible] وہ مال چھوڑ کر مرا ہے۔ تو "المبسوط" کے مطابق اس صورت میں محتال کا قول اس کے حلف کے [illegible] مانا جائے گا۔

مح[illegible] علیہ نے محیل سے کہا کہ میں نے تمہارے حکم سے تمہارا اتنا قرض چکایا ہے۔ لہٰذا میرا مال مجھے [illegible]رو اور محیل (مدیون) کہے کہ تم نے میرا جو قرض تمہارے ذمہ تھا اس کے بدلے میرا قرض ادا کیا [illegible] تو محیل کا قول گواہی پیش کئے بغیر قبول نہیں کیا جائے گا اور محال علیہ کا حق ثابت ہو جائے گا۔ [illegible] کہ وہ محیل کے امر اور حکم سے اس کا دین محتال کو دے چکا ہے۔ البتہ یہ محیل اس پر دین کا دعو[illegible] رہا ہے، اور وہ اس کا منکر ہے مدعی کے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں منکر (مدعی علیہ) کا ق[illegible]بول کیا جائے گا اور حوالہ کے طور پر اس کا دین اتارنا اقرار دین نہیں ہوگا کیوں کہ حوالہ اس کے [illegible]ی وجود پذیر ہوتا ہے۔

محیل محتال (محال لہ) سے کہے کہ فلاں سے وصول کرنے کیلئے اس کو میں نے حوالے کیا [illegible] لہٰذا وصول کردہ مال مجھے دیدو اور محال لہ کہے نہیں بلکہ میں نے اپنا قرض وصول کیا ہے تو اس [illegible]ت میں اگر محال لہ کے پاس گواہ موجود نہ ہوں تو محیل کا قول اس کی قسم کے ساتھ مانا جائے

گا۔اس لئے کہ محال لہ اس پر دین کا دعویٰ کر رہا ہے۔اور محیل اس کا منکر ہے اور حوالہ کا لفظ کبھی وکالت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ہنڈی کا حکم

ہنڈی کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی رقم کسی دوسرے ایسے آدمی کو دے جس کی رقم، رقم سپرد کرنے والے کے شہر میں موجود ہو اور وہ وہاں اس سے حاصل کرے یہ طریقہ اگر کسی شرط کے ساتھ مشروط ہو تو مکروہ ہے۔ اگر مشروط نہ ہو تو جائز ہے۔کراہت کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک تاجر ایک شہر میں ایک ایسے شخص کو رقم بطور قرض دے کہ اس کی رقم تاجر کے شہر میں کسی شخص کے پاس ہے اور اس سے کہہ دے تم مجھے لکھ کر دو کہ یہ رقم میں اس شخص سے لے لوں جس کے پاس آپ کی رقم ہے۔اس نے اس طرح کیا تو یہ مکروہ ہے۔

کیوں کہ اس صورت میں قرض دیکر گویا نفع اٹھایا گیا یعنی راستہ کے خطرات سے بچنے کیلئے ایسا کیا ہے اور قرض سے نفع اٹھانے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے: ”کل قرض جرّ نفعاً فهو رباً. أو كما قال عليه السلام“ ”ہر وہ قرض جو نفع کھینچ لائے وہ سود ہے۔“

فتاویٰ صغریٰ وغیرہ میں لکھا ہے اگر ہنڈی کا کاروبار قرض کی شرط پر ہو تو حرام ہے۔ہاں اگر بلا شرط قرض دے اور اتفاقی طور پر اس کے شہر میں اسے مل جائے تو کوئی گناہ نہیں مکروہ اور حرام ہونے کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) کراہت وحرمت کی صورت بطور قرض دینے میں ہے اگر بطور امانت مال دیدے تو مکروہ نہیں ہوگا۔

(۲) پیسہ دیتے وقت کہہ دے تم لکھ کر دو کہ دوسرے شہر میں اس سے وصول کرلوں گا۔اگر بلا شرط دے دے تو بالکل جائز ہے۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں لوگوں سے دراہم لیتے، پھر عراق میں مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کو لکھتے کہ تم فلاں شخص کو اتنی رقم دیدو، تو لوگ جا کر اس طرح وصول کرتے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: کوئی حرج نہیں جائز ہے۔پھر پوچھا گیا کہ اپنی رقم سے زائد اگر کوئی وصول کرلے تو؟ فرمایا: اگر دراہم وزن کے اعتبار سے برابر ہوں تو جائز ہے۔“[1] واللہ اعلم

---

[1] [سنن بیہقی: ۳۵۲/۵]

﴿کتاب النکاح﴾

نکاح کا لغوی معنی ملانا اور جمع کرنا ہے اور اصطلاح شریعت میں مخصوص ملاپ اور جمع کرنے کو نکاح کہتے ہیں اور مخصوص ملاپ سے مراد وطی اور جماع کرنا ہے۔
کیونکہ میاں بیوی وطی کی حالت میں اکٹھے ہوتے ہیں اور دونوں مل کر ایک شخص بن جاتے ہیں۔

نکاح کا لفظ عقد نکاح میں مجازاً بولا جاتا ہے کیونکہ نکاح کا اصل معنی ملانا ہوتا ہے اور وہ جماع سے حاصل ہوتا ہے۔

اور امام زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نکاح کا لفظ کلام عرب میں وطی اور عقد نکاح دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب شرعاً نکاح کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے وطی مراد ہوگی۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: (ولدت من نکاح) أی من وطی حلال "میں نکاح یعنی وطی حلال سے پیدا ہوا ہوں" اور حیض کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے، کہ سب کچھ کرو سوائے جماع کے[1] اور لفظ نکاح سے عقد نکاح قرینہ کے ذریعے سے معلوم ہوا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ "فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ" "سوان سے نکاح کروان کے مالکوں کی اجازت سے" [النساء: ۲۵] اس آیت میں لفظ نکاح سے عقد نکاح مراد ہے جماع مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ جماع میں تو مالک کی اجازت متصور نہیں ہوتی۔

اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا اشاد گرامی ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ (تو نکاح کرلو جو عورتیں تم کو خوش آویں) [النساء: ۳] اس آیت میں بھی نکاح سے عقد نکاح مراد ہے کیونکہ اس میں عدد کا ذکر کیا گیا ہے لہٰذا وطی مراد نہیں ہوسکتی۔ تو نکاح کا لفظ عقد میں مجازاً بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی ضم والا معنیٰ پایا جاتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَعْصِرُ خَمْرًا "کہ میں نچوڑتا ہوں شراب"[2] اس آیت میں خمر کا لفظ مجازاً بولا گیا ہے کیونکہ شراب کو نہیں نچوڑا جاتا بلکہ انگوروں کو نچوڑا جاتا ہے اور انگوروں کے نچوڑ سے شراب بنتی ہے لفظ خمر کو ابتداً ذکر کر دیا اور عنب کو ذکر نہیں کیا تو یہی مجاز ہے۔

---

[1] [کنز العمال: ۱۶/۳۵۳] [2] [یوسف: ۳۶]

نکاح کا حکم

نکاح کی تین قسمیں ہیں (۱) مستحب (۲) واجب (۳) مکروہ۔

پہلی قسم: کبھی تو نکاح آدمی کیلئے مستحب ہوتا ہے یہ اس شخص کیلئے ہے جسے شادی کی چاہت متوسط درجہ کی ہو اور اس کیلئے شادی کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہوں۔ تو اسے یہ کہا جائے گا کہ تیرے لئے شادی کرنا مستحب ہے۔ شریعت نے شادی مستحب قرار دی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَنْكِحُوا الْاَيَالٰى مِنْكُمْ (اور نکاح کرو رانڈوں کا اپنے اندر) [النور: ۳۲] دوسری جگہ ارشاد ہے: "فَانْكِحُوا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ" "تو نکاح کرلو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں" [النساء: ۳] اور آپ ﷺ نے بھی نکاح کو مستحب کہا ہے ارشاد ہے۔

کہ میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جس نے میری سنت سے اعراض کیا تو وہ مجھ میں سے نہیں [1] اور نکاح تو انبیاء کی سنت ہے اور مرد وعورت دونوں کی پاکدامنی کا ذریعہ ہے اور عفت و پاکدامنی شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے جب بندہ نکاح کرلیتا ہے تو اس کا نصف دین مکمل ہو جاتا ہے اسے دوسرے آدھے کے متعلق اللہ سے ڈرنا چاہئے۔[2]

دوسری قسم: واجب ہے۔ یہ اس شخص کیلئے ہے جسے نکاح کا شدید اشتیاق اور چاہت ہو اور اپنے نفس کے زنا میں پڑنے کا خوف ہو۔

اور باءۃ نکاح کے لوازمات کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اے جوانوں کے گروہ تم میں جو آدمی نکاح کے لوازات کی طاقت رکھے تو اسے چاہئے کہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح کرنا نظر کو نیچے کر دیتا ہے اور شرمگاہ کو بہت محفوظ رکھتا ہے اور جو شخص نکاح کے لوازمات کی استطاعت نہ رکھے تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ رکھنا آدمی کو خصی بناتا ہے (یعنی جنسی ہیجان ختم ہو جاتا ہے)[3]

اس حدیث سے علماء نے نکاح کی شہوت کو کمزور کرنے کیلئے عقاقیر کے استعمال کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ ایسے ہی ایک نوجوان لڑکی سے نکاح پر استدلال کیا ہے۔ اس لئے کہ نوجوان لڑکی سے استمتاع بہت لذیذ، خوشبودار، رہن سہن بہت اچھا، بات چیت میں بہت میٹھی اور چھونے میں بہت نرم ہوتی ہے۔ اور یہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس سے ایسے اخلاق سے پیش آئے جسے وہ

---

[1] [عینی: ۲۰/۶۰] [2] [کنزالعمال: ۲۸۱] [3] [عینی: ۲/۱۲۵]

پسند کرتی ہے (اور وہ یہ پسند کرتی ہے کہ اس کا شوہر اسے اچھے اخلاق کا عادی بنا دے۔)
تیسری قسم: مکروہ ہے اس شخص کیلئے نکاح کرنا مکروہ ہے جسے یہ یقین ہو کہ وہ بیوی پر ظلم کرے گا حالانکہ بیوی پر ظلم کرنا حرام ہے یا اسے یہ یقین ہو کہ اس سے رہن سہن اچھا نہیں رکھے گا یا ابتداء اسے مارے گا۔ مارنے کی بھی مشروط اجازت ہے چنانچہ شوہر اگر جماع کا تقاضا کرے اور عورت اس سے انکار کرے تو ہاتھ سے مارنے کی اجازت ہے۔

کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے عورت ٹیڑھی پسلی کی طرح ہے اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے توڑ دے گا اور اگر اس سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے ٹیڑھے پن سے نفع حاصل کرلے۔[۱] دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو غلام کے مارنے کی طرح نہ مارے کہ دن کو مارے اور رات کو اس سے جماع کرے۔[۲]

عقد نکاح

عقد نکاح کے دو رکن ہیں: ایجاب اور قبول، پہلے کی مثال زَوَّجتک. میں نے تجھ سے شادی کی۔ دوسرے کی مثال "قبلت" میں نے قبول کیا۔

نکاح ماضی کے دو لفظوں سے بھی منعقد ہو جاتا ہے جیسا کہ ماقبل میں گزر چکا اور ایسے ہی ایک لفظ ماضی اور دوسرا مستقبل کا ہو تو اس سے بھی منعقد ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک زَوِّجنی (مجھ سے شادی کرلے) کہے اور دوسرا زوّجتک (میں نے تجھ سے شادی کرلی) کہے۔

اور ایسے ہی اگر آدمی لڑکی سے کہے کہ میں تجھ سے شادی کرتا ہوں اس کے جواب میں لڑکی کہے کہ میں نے شادی کرلی اس سے بھی منعقد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر آدمی وکیل سے کہے کہ میرا نکاح کرا دے اور وکیل کہے کہ میں نے تیرا نکاح کرا دیا۔

وکیل کو نکاح کے دونوں طرف کا ولی بنایا جا سکتا ہے جیسے عنقریب اس کا بیان آجائے گا۔

انعقاد نکاح کیلئے ان الفاظ کے علاوہ اور الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی بیٹی کے باپ سے کہے کہ میں تیری بیٹی کا پیغام نکاح لیکر آیا ہوں اور اس کا والد کہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے کر دیا۔ تو اس وقت پیغام نکاح دینے والے کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ کہے میں قبول نہیں کرتا۔

اسی طرح اگر عورت کہے کہ میں اپنے آپ کو تجھے ہبہ کرتی ہوں یا کہے کہ میں نے اپنا نفس تیرے لئے خاص کر دیا یا کہے کہ میں نے اپنا نفس تجھے صدقہ کر دیا اور شوہر کہے کہ میں نے

---
۱ [عینی: ۲۰/۱۶۵] ۲ [عینی: ۲۰/۱۹۶]

قبول کیا یا آدمی کسی عورت سے کہے کہ سو روپے کے عوض میری بیوی بن جا اور عورت کہہ دے کہ میں نے قبول کیا یا آدمی کہے کہ میں نے سو روپے اپنی بیوی بنانے کیلئے تجھے دیئے اور عورت کہے کہ میں نے قبول کیا۔ یا آدمی کہے کہ میری بیوی بن جا یا کہے میں تیرا شوہر بن گیا اس کے جواب میں عورت کہے میں نے قبول کیا۔ ان تمام الفاظ سے نکاح منعقد ہو جائے گا۔

اگر عورت کسی آدمی سے کہے کہ میں نے اپنا نفس تجھے کرایہ پر دیدیا اور آدمی کہے میں نے قبول کیا تو نکاح منعقد نہ ہوگا کیونکہ کرایہ پر دینا تو مقررہ وقت کیلئے ہوتا ہے اور نکاح مقررہ وقت کیلئے نہیں ہوا کرتا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے ایک ہزار کے عوض کر دے اور آدمی کہے کہ لے لے اور جہاں چاہے لیجا۔ تو اس سے بھی نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ اور اگر بیٹی کا باپ کہے کہ میں نے اپنی فلاں متعین بیٹی کا نکاح فلاں آدمی کے بیٹے سے کر دیا اور بیٹے کا نام نہ ذکر کیا اور بیٹے کا باپ کہے کہ میں نے اپنے بیٹے کیلئے قبول کیا اس کے دو بیٹے ہوں اور کسی بیٹے کا نام نہ لیا حالانکہ دونوں کیلئے لازم تھا کہ بیٹا بیٹی کا نام ذکر کرتے تو نکاح منعقد نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس کا ایک ہی بیٹا ہو تو نکاح صحیح ہو جائے گا۔

اسی طرح اگر بیٹی کا باپ کہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح فلاح آدمی کے بیٹے سے کر دیا اور اپنی بیٹی کا نام نہ ذکر کیا اور اس کی دو بیٹیاں ہوں اور بیٹے کا باپ کہے کہ میں نے اپنے فلاں بیٹے کیلئے قبول کیا اور اس کا نام بھی ذکر کر دے تب بھی نکاح نہ ہوگا کیونکہ بیٹی کے باپ کیلئے اپنی بیٹی کا نام لینا لازم تھا۔ لیکن اگر اس کی ایک ہی بیٹی ہو تو نکاح ہو جائے گا کیونکہ وہ متعین ہے۔

نکاح کا اعلان

نکاح کی خوشی کا اظہار اور اس کا اعلان کرنا پسندیدہ عمل ہے اور اس کی تشہیر سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے

کہ نکاح کا اعلان کیا کرو اور اس موقعہ پر دف بجاؤ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ حلال و حرام کے درمیان فرق دف بجانا اور نکاح کا اعلان کرنا ہے[1]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکاح کے اعلان پر ابھارتے تھے تو ہمارے لئے ان اعمال کا کرنا آداب نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدود میں جائز ہوگا ان اعمال کے علاوہ دیگر رسومات اور بدعات کی طرف تجاوز نہ کریں جن کی طرف فضول خرچی کرنے والے لوگ سبقت کرتے ہیں۔

---

[1] [ابن ماجہ: ۱/۶۱۱]

نکاح کا خطبہ

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نکاح کے خطبہ میں یہ الفاظ پڑھتے تھے۔ "**ان الحمدللّٰہ نستعینه و نستغفره و نعوذ باللّٰه من شرور انفسنا فمن یهده اللّٰه فلا مضل له و من یضلل فلا هادی له و اشهدان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً عبده و رسوله**"۔

"تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں" ہم اس سے اعانت اور مغفرت کے طلبگار ہیں اور اپنے نفس کے شرور سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دیدیں اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دیں اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور تین آیتیں پڑھتے تھے۔ "اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ" "اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے" اور نہ مرو مگر مسلمان [آل عمران:۱۰۲] "اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً" "اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار ہو قرابت والوں سے بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے" [النساء:۱] "اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً" سے "فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِیْماً تک" "ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی کہ سنوار دے تمہارے واسطے تمہارے کام اور بخش دے تم کو تمہارے گناہ اور جو کوئی کہنے پر چلا اللہ اور اس کے رسول اس نے پائی بڑی مراد[1] پھر اس کے بعد اما بعد کہہ کر اپنی مراد بیان کرے۔

نوٹ: نکاح بغیر خطبہ کے بھی جائز ہے۔

شادی کرنے والے کیلئے کن الفاظ سے تبریک پیش کی جائے

دلہا دلہن کو مبارکباد دینا ایک مستحب کام ہے اور برکت کی خاطر ان دونوں پر خوشیوں کی برسات بھی ہونی چاہئے۔ لیکن رفاء اور بنین (شادی کرنے والے کیلئے دعا ہے کہ تم دونوں میں اتحاد و اتفاق رہے اور تمہارے بیٹے پیدا ہوں۔) جیسے الفاظ نہیں کہنے چاہیں کیونکہ یہ الفاظ زمانہ جاہلیت کی مبارکبادی کے ہیں اور ان الفاظ میں مردوں کیلئے خوشی اور عورتوں کیلئے غم کا اشارہ ہے۔ اور اسلام میں برکت کی دعا وہ ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ جب کوئی آدمی

---

[1] [الاحزاب آیت:۷۰،۷۱]

شادی کر لیتا تو آپ ﷺ مبارکباد دیتے اور یہ دعا کرتے تھے۔"بَارَکَ اللّٰہُ لَکُمْ وَ بَارَکَ عَلَیْکُمْ وَ جَمَعَ بَیْنَکُمَا فِیْ خَیْرٍ" "اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور تمہارے اوپر برکت ڈالے اور تمہارے درمیان خیر پیدا کرے۔"[1]

اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بنی جثم کی ایک عورت سے نکاح کیا تو اسے بطور دعا الرّفاء والبنین کہا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اس طرح کہو جس طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بَارَکَ اللّٰہُ فِیْکُمْ وَبَارَکَ لَکُمْ" کہ اللہ تعالیٰ تم میں اور تمہارے لئے برکت دے۔

عقد نکاح کی شرائط

مسلمان مرد اور عورت کا نکاح دو مردوں کی موجودگی میں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی موجودگی میں منعقد ہوسکتا ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ گواہوں کی عدم موجودگی میں نکاح نہیں ہوتا۔[2]

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی آئی ہے کہ وہ عورتیں بدکار ہیں جو اپنا نکاح بغیر گواہ کے کرواتی ہیں۔[3] یعنی گواہوں کا موجود ہونا نکاح میں شرط ہے اور نبی ﷺ کے اہل علم حضرات رضی اللہ عنہم اور اسی طرح تابعین رحمۃ اللہ علیہ اور تبع تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ سب حضرات فرماتے ہیں کہ نکاح گواہوں کی موجودگی میں ہی معتبر ہے۔ اہل علم حضرات میں سے کسی نے بھی اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا صرف متاخرین اہل علم حضرات میں سے بعض نے یہ بات کہی ہے کہ اگر دو گواہ وقفہ وقفہ سے آجائیں یعنی پہلے ایک کچھ وقفہ کے بعد دوسرا گواہ آجائے تو بھی معتبر ہے لیکن کوفہ اور دیگر علاقوں کے اہل علم حضرات اس وقت تک نکاح کو جائز نہیں کہتے جب تک دونوں گواہ عقد نکاح میں بیک وقت موجود نہ ہوں۔

مغنی میں موفق نے کہا ہے کہ نکاح دو گواہوں کے بغیر منعقد نہیں ہوتا اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے۔ حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن عباسؓ، سعید بن میسبؓ، امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ ان سب حضرات کا یہی مذہب ہے۔

نکاح دو فاسقوں اور مستور الحال مردوں کی شہادت سے بھی منعقد ہو جاتا ہے، اس لئے کہ شہادت تو ذمہ داری اٹھانے کا نام ہے اور بہت سے لوگوں میں عادل کی تلاش اور اس کی پہچان

---

۱ [ابن ماجہ ۱/۶۱۴]　۲ [نسائی: ۶/۱۲۸]　۳ [عارضۃ الاحوذی: ۵/۱۷]

کرنا بہت مشکل ہے تو ظاہری حالت کے اوپر اکتفا کر کے حکم لگا دیا جاتا ہے۔

اسی طرح دو اندھوں اور دو کتابی مردوں کی شہادت سے بھی نکاح منعقد ہو جائے گا۔

گواہ مقرر کرنا انعقاد نکاح کی شرط ہے وجوب مہر کی نہیں۔ اور گواہوں کے لئے نکاح کرنے والے متعاقدین کے ایجاب وقبول کو سننا ضروری ہے۔

فاسق: وہ کہلاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے نکل جائے۔

عادل: وہ کہلاتا ہے جو گناہ کبیرہ کا بالکل ارتکاب نہ کرے اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے۔

مستور الحال: وہ ہے جس کا حال فسق اور عدالت سے مجہول ہو یعنی جس کا نہ فسق معلوم ہو اور نہ عدل۔

عقد نکاح کلام کرنے سے منعقد ہوگا اور عقد میں شہادت شرط ہے۔ حضرات حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح میں شہادت کی شرط احادیث کی اتباع اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقلید میں لگائی۔

حضرت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالزبیر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک نکاح کا مقدمہ لایا گیا جس میں صرف ایک مرد اور ایک عورت گواہ تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تو پوشیدہ طور پر نکاح کرنا ہے اس کی تو میں ہرگز اجازت نہ دوں گا اگر تم اس میں مزید آگے بڑھتے تو میں تمہیں رجم کرتا۔[1]

دوسری روایت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نکاح میں ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا۔ فرقہ میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول نقل کیا ہے ہم اس کو اختیار کرتے ہیں اور یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

جب تک شہادت کامل نہیں ہوتی تو نکاح بھی صحیح نہیں ہوگا کیونکہ اس کے بارے میں سخت وعید آئی ہے اور جب شہادت میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں مکمل ہو جائیں گی تو نکاح جائز ہو جائے گا اگر چہ یہ نکاح پوشیدہ طور پر ہی کیوں نہ کیا ہو۔ پوشیدہ نکاح میں اگر گواہ نہ ہوں تو وہ نکاح فاسد ہوگا لیکن اگر شہادت مکمل ہو جائے تو وہ نکاح علانیہ ہی شمار ہوگا اگر چہ انہوں نے پوشیدہ نکاح کیا ہو۔ یہ روایت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مؤطا میں بیان کی ہے۔

کیا عقد نکاح میں ولی کا ہونا شرط ہے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ولی کی پہچان ضروری ہے کہ ولی کون ہوتا ہے؟ ولی

---

[1] الحجۃ ۳/ ۲۲۹

میراث میں عصبات کی ترتیب کے مطابق رشتہ دار ہوتا ہے۔ عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عصبۂ نسبی (۲) عصبہ سببی۔ عصبہ بنفسہ ہر وہ مذکر رشتہ دار ہے جس کے اور نکاح کرنے والی عورت کے درمیان عورت کا واسطہ نہ ہو۔

عصبہ میں قریب ترین مذکر رشتہ دار بیٹا ہے پھر پوتا نیچے تک، پھر باپ، پھر دادا اوپر تک پھر بھائی پھر بھتیجے پھر چچا پھر اس کے بیٹے، پھر باپ کے چچے پھر دادا کے چچے۔

اور عصبہ بغیرہ۔ بیٹیاں، بہنیں اور پوتیاں اور عصبہ مع غیرہ بہنیں۔

اس تقریر کے بعد اب ہم کہتے ہیں کہ احناف میں حضرت موصلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نکاح کے باب میں عورتوں کا کلام معتبر ہے۔

اگر کسی آزاد عاقلہ بالغہ عورت نے اپنا نکاح کسی آدمی سے کرلیا تو جائز ہے (ایسے ہی اگر کسی کو اپنا ولی یا وکیل بنایا) اسی طرح اگر کسی دوسری لڑکی کا نکاح ولی یا وکیل بن کر کیا تو بھی صحیح ہے اور اگر اپنے نکاح میں کسی کو وکیل بنایا یا کسی نے اس کا نکاح کر دیا اور اس نے اجازت دیدی تو نکاح صحیح ہوگا۔ یہی شیخین (امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمھما اللہ) زفر اور حسن بن زیاد رحمھم اللہ کا مذہب ہے۔

اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں کہ نکاح ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا۔

اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک یہ روایت بھی مروی ہے کہ انہوں نے اپنی وفات سے سات دن پہلے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی طرف رجوع کرلیا تھا۔

فقیہ ہندوانی نے یہ بات بیان کی ہے کہ ایک عورت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ان کی وفات سے تین دن پہلے آئی اور کہا کہ میرا ایک ولی ہے جو مال کثیر لئے بغیر میرا نکاح نہیں کرتا۔ تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جا اور اپنا نکاح خود کروالے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے قول اول کی طرف رجوع کرلیا تھا۔ واللہ اعلم

آزاد بالغۃ عورت کا اپنا نکاح خود کروانے کے جواز میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دلیل ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ''جب تک نکاح نہ کرلے کسی خاوند سے اس کے سوا'' [البقرہ:۲۳۰]

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ [البقرہ:۲۳۴]

''تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ کریں وہ اپنے حق میں قاعدے کے موافق۔''

ایک اور جگہ قرآن کریم میں **من معروف** [البقرۃ: ۲۴۰] بغیر الف لام کے ہے۔ ان آیات میں نکاح اور فعل نکاح دونوں کی اضافت عورتوں کی طرف کی گئی ہے۔ یہ اس پر دلالت ہے کہ ان کی عبارۃ نافذ ہوگی۔ کیونکہ نکاح کی نسبت مستقلاً ان کی طرف کی گئی ہے کسی اور کا ذکر ساتھ میں نہیں کیا گیا۔ اور عورت جب اپنا نکاح مہر مثلی پر کفو میں کرلے تو اپنی ذات کے بارے میں اس نے قاعدے کے موافق عمل کیا۔ تو اولیاء کو اس بارے میں کوئی حرج اور تنگی نہ ہونی چاہئے۔

آزاد بالغہ کا اپنا نکاح کروانے کی دلیل امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث سے بھی بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ایّم'' (یعنی وہ عورت جو بیوہ، بالغہ اور عاقلہ ہو) اپنے نکاح کے معاملہ میں اپنے ولی سے زیادہ خود اختیار رکھی ہے اور کنواری لڑکی بھی اس کی حق دار ہے کہ اس کے نکاح کی اس سے اجازت حاصل کی جائے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔''[1]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ ''بیوہ، بالغہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کا حکم نہ حاصل کرلیا جائے۔ اسی طرح کنواری لڑکی کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت نہ حاصل کر لی جائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کی اجازت کیسے ہوگی فرمایا کہ وہ خاموش رہے۔''[2]

النہایہ میں ہے **الایّم** اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو خواہ وہ باکرہ ہو یا ثیبہ ہو۔ ثیبہ کی صورت میں اس کو طلاق مل گئی ہو یا اس کا خاوند فوت ہوگیا ہو۔

اجازت اس عورت سے طلب کی جائے گی جسے اجازت دینے کا حق ہوگا اور بچی سے اجازت نہیں لی جاتی تو استیذان سے بچی مراد ہی نہ ہوگی۔ حدیث میں لفظ ایّم ثیب کے معنی میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''ثیبہ اپنے بارہ میں اپنے ولی سے زیادہ خود حقدار ہے۔ اور چھوٹی لڑکی کو اپنی ذات اور اپنے مال پر کوئی ولایت نہیں تو اجازت طلب کرنے کا کوئی اعتبار نہیں۔''[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت بیان کی ہے کہ ایک لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے باپ نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کر دیا۔ اور میں اسے پسند نہیں کرتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بیٹھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آتے ہیں تو مسئلہ پوچھتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے۔ تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی۔ آپؐ نے اس کے والد کو بلایا اور لڑکی کو اختیار دیا وہ لڑکی کہنے لگی:

---

[1] [نسائی:۶/۸۶] [2] [نسائی:۶/۸۶] [3] [مسلم:۲/۱۰۳۷]

یارسول اللہ! جو میرے والد نے کہا میں اسے نافذ کرتی ہوں۔ میں تو یہ چاہتی تھی کہ عورتوں کو یہ مسئلہ معلوم ہو جائے۔[1]

حضرت خنساء بنت خذامؓ سے روایت ہے کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کرادی اور وہ ثیبہ تھی اس کو یہ نکاح پسند نہ آیا تو آپ ﷺ کے پاس آگئی آپ نے نکاح ختم کرا دیا۔ (ایضاً) حضرت موصلی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالعباس مروزی سے نقل کیا ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ تین احادیث ایسی ہیں جو آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہیں۔ (۱) ''ہر نشہ آور چیز حرام ہے'' (۲) ''ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' (۳) جس نے اپنے آلہ تناسل کو چھو لیا تو اس کو چاہئے کہ وضو کرلے۔'' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی موافقت کی ہے۔

اور جب ولی فی النکاح والی حدیث کا ثبوت نہ ہوا تو آزاد عاقلہ بالغہ کا نکاح بھی صحیح ہو جائے گا اور حدیث پر بھی عمل کیا جائے گا۔ وہ اس طرح کہ حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ جب عورت غیر کفو میں اپنا نکاح کرے تو اسے کہا جائے گا کہ ولی کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر لڑکی اپنا نکاح کفو میں کردے تو عقد نکاح ولی کی اجازت پر محمول نہ ہوگا اور اس کے دلائل ماقبل میں گزر چکے ہیں۔ اور اگر نکاح غیر کفو میں کر دیا تو عقد نکاح ولی کی اجازت پر موقوف رہے گا۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس عورت نے اپنا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر کیا تو اس کا نکاح باطل ہے اس کا نکاح باطل اس کا نکاح باطل ہے۔[2] تو اس حدیث کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا جب عورت اپنا نکاح غیر کفو میں کروالے اور ولی اجازت بھی نہ دے۔ اس صورت میں ولی اجازت دے گا تو نکاح ہوگا ورنہ نکاح بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔[3]

عقد نکاح اور نفاذ عقدِ نکاح کے حق میں لڑکی کے ذی رائے ہونے اور بالغ ہونے سے پہلے پہلے تک ولایت کا حکم لاگو ہوسکتا ہے۔

جب وہ بالغ اور ذی رائے ہوگئی تو اس کی طرف سے ولایت ختم ہو جائے گی اور وہ خودمختار بن جائے گی۔

اور اگر بلوغت کے بعد بھی مضبوط قوت فیصلہ والی نہ ہوئی تب بلوغ کی بنا پر ولایت ختم ہو جائے گی اور مضبوط رائے والی نہ ہونے کی وجہ سے ولایت باقی رہے گی اور لڑکی کے حق میں دو

---

[1] [نسائی: ۸۶/۶] [2] [عارضۃ الاحوذی: ۱۲/۵] [3] ایضاً

ولایتوں میں سے ایک ثابت ہو جائے گی اور ایک ولایت کے حق میں معاملہ ولی کی اجازت پر موقوف رہے گا۔

اور جب لڑکی کو دونوں ولایتوں کا حق حاصل ہو جائے اور ولی بھی موجود نہ ہو تو قاضی اس کا نکاح کرا سکتا ہے۔

کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس عورت کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی بادشاہ ہے۔[1]

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لڑکی کے نکاح کروانے کا زیادہ حق ماں اور اس کے دیگر قریبی رشتہ داروں کا ہے اس لئے کہ ولایت میں وہ قرابت جو شفقت کی طرف داعی ہو وہ اصل ہے۔ اور ماں دیگر رشتہ داروں کی بہ نسبت زیادہ شفیق ہوتی ہے۔ تو ولایت کا حق بھی اسی کو ہونا چاہئے۔

حضرت ابوالقیس ازدیؒ نے اس شخص سے روایت بیان کی ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خبر ملی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس عورت کا نکاح جائز قرار دیا جس کی ماں نے اس کی رضا مندی سے اس کا نکاح کیا تھا۔[2]

اور حَکَمْ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی آدمی نکاح کے بارے میں آتا تو آپ رضی اللہ عنہ کسی ایسی لڑکی کا معاملہ پیش ہوتا جس کا نکاح ولی کے بغیر ہوا ہو اور اس سے دخول بھی ہو چکا ہو تو آپؓ اس نکاح کو برقرار رکھتے۔

بچے، مجنون اور غیر مسلم کو کسی مسلمان لڑکی کا ولی نہیں بنایا جا سکتا۔ بچہ اور مجنون تو اس لئے کہ ان میں عقل اور تجربہ کی کمی ہے اور غیر مسلم کو اس لئے ولی نہیں بنایا جا سکتا کہ ولی کا قول مولیٰ علیہ پر نافذ ہوتا ہے اور غیر مسلم کے قول کو مسلمان پر نافذ نہیں کر سکتے۔ جیسے شہادت کے باب مین اس کے قول کو نافذ نہیں مانا جاتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا'': اور ہرگز نہ دے گا اللہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ'' [النساء: ۱۴۱] اور مجنون لڑکی کا بیٹا ولی بن سکتا ہے اور ولایت نکاح میں اپنے نانا پر مقدم ہوگا اس لئے کہ ولایت نکاح میں عصبات میں سے مقدم کو ولی بنایا جاتا ہے اور بیٹا مقدم ہے (لہٰذا بیٹے کو ولی بنانا اولیٰ ہوگا)۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ باپ مقدم ہوگا کیونکہ وہ زیادہ شفیق ہوتا ہے۔

اگر کسی لڑکی کی شادی دو ولیوں نے کرا دی تو جو پہلا ہے اس کے قول کو ترجیح ہوگی اور اگر دونوں نے اکٹھے کرائی ہو تو دونوں عقد باطل ہو جائیں گے کیونکہ نہ تو دونوں کو جمع کر سکتے ہیں اور نہ

---

[1] [عارضۃ الاحوذی: ۵/۱۳] [2] [کنزل العمال: ۱۶/۵۳۲]

ہی کسی کو اولیٰ کہہ سکتے ہیں۔

حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جس عورت کا نکاح دو ولی کر دیں تو ان میں سے پہلے ولی کیلئے ثابت کر دیں گے اور دوسرے ولی کے قول کو ترک کر دیا جائے گا''۔[1] یعنی عقد ثانی فسخ سمجھا جائے گا۔ اور اگر صورت حال یہ ہو کہ ولی اقرب ایسا غائب ہو جائے کہ اسکا علم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے اور مقابل گروہ اس کے موجود ہونے کا انتظار بھی نہ کرے تو اس کے بعد کا ولی اقرب اس کا نکاح کرا سکتا ہے قاضی کی طرف ولایت منتقل نہیں ہو گی۔

اس لئے کہ حدیث کی رو سے قاضی اس وقت ولی بن سکتا ہے جب کوئی قریبی ولی موجود نہ ہو اگر ولی باپ یا دادا ہو تو اپنے چھوٹے بیٹے کا نکاح مہر مثلی سے زیادہ کے ساتھ یا اپنی چھوٹی بیٹی کا مہر مثلی سے کم کے ساتھ اور غیر کفو میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح غیر کفو میں نکاح جائز نہیں اسی طرح بیٹے یا بیٹی کا نکاح مہر مثلی سے زیادہ یا کم کے ساتھ بھی نہیں کر سکتے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ نکاح پوری عمر کا معاہدہ ہے جو کئی مقاصد، اغراض اور غیر ظاہر مصلحتوں کو شامل ہے اور والد کی شفقت اپنی اولاد کے ساتھ بھرپور ہوتی ہے اور وہ جو بھی کرے گا وہ کسی نہ کسی مصلحت کے تحت کرے گا۔ مالی منفعت ہو یا کفالت کا معاملہ وہ اپنی اولاد کی خیر خواہی ہی میں کرے گا جبکہ باپ دادا کے علاوہ دوسرے عصبات میں اتنی شفقت نہیں ہوتی۔ اگر عورت ولی کے بغیر نکاح کرے اور اس کے سرپرستوں کو مہر کی مقدار پر اعتراض ہو تو اس کے شوہر کو کہہ سکتے ہیں کہ یا تو مہرِ مثلی پورا دو یا تفریق کرو، کیوں کہ عورت عقل اور رائے کی کمی کی وجہ سے جلدی دھوکے میں آتی ہے اور مستقبل کے مقاصد کو مدِ نظر نہیں رکھتی۔ اور حال کی خواہش کی رو میں بہہ جاتی ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک عورتوں کے نکاح کرانے سے نکاح منعقد ہو جائے گا چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کے شام جا کر لاپتہ ہونے کی وجہ سے ان کی بیٹی کا نکاح کرایا تھا۔

کیا باکرہ بالغہ کو نکاح کیلئے مجبور کیا جا سکتا ہے؟

نکاح کے معاملے میں باکرہ پر زبردستی نہیں کی جائے گی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''استأمروا النسآء فی أبضاعِھن''[2] ''عورتوں سے ان کی

[1] [عارضۃ الاحوذی: ۳۰/۵] [2] [نسائی ۸۶/۶]

ابضاع یعنی شرمگاہوں کے بارے میں مشورہ کرو! عرض کیا گیا: یا رسول اللہ ﷺ باکرہ تو شرم محسوس کرتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، "ھو اذنھا" یہی اس کی اجازت ہے۔" باکرہ کے بارے میں سکوت کو اذن مانا گیا ہے کیونکہ حیاء اس کیلئے بولنے سے مانع ہے اور یہ حکم باکرہ کے ساتھ خاص ہے۔ ولی نکاح سے پہلے باکرہ سے اجازت لے اور اس کے سامنے شوہر کا ذکر کرے اور کہے: فلاں نے تیرے ساتھ نکاح کا پیغام بھیجا ہے یا ایسی ہی کوئی اور بات کہہ دے اگر لڑکی خاموش رہے تو اسے اس کی رضا سمجھا جائے گا۔ اگر وہ ہنس پڑی تو یہ بھی اجازت ہے کیونکہ مسکراہٹ رضا کی دلیل ہے۔ الا یہ کہ ہنسنا بطور استہزاء ہو۔

اگر ولی نے باکرہ سے بغیر اجازت طلب کئے اس کی شادی کر دی تو اس نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ ائمہ ثلاثہ، امام مالک بن انسؒ، امام محمد بن ادریس الشافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ باپ کیلئے باکرہ کی شادی (بغیر اس کی رضا کے) کرنا جائز ہے، اگرچہ وہ اسے ناپسند کرتی ہو۔

اگر باکرہ بغیر آواز کے رو پڑی تو یہ رونا بھی اس کی رضا ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ رونا خوشی کی وجہ سے ہو اور اگر با آواز روئی تو عدم رضا ہے کیونکہ یہ رونا غمی کی علامت ہے۔

اگر ولی نے اسے اختیار دیتے ہوئے کہا: میں فلاں کے ساتھ، یا فلاں کے ساتھ تیرا نکاح کر رہا ہوں اور وہ خاموش رہی تو ان دو میں سے جس کے ساتھ بھی وہ شادی کر دے درست ہے اور اگر اس نے کہا کہ فلاں جماعت میں سے کسی کے ساتھ میں تمہاری شادی کر رہا ہوں، تو اگر اس جماعت کے افراد محدود ہیں تو لڑکی کی خاموشی اس کی رضا ہے ورنہ نہیں۔

اگر ولی نے لڑکی سے اجازت طلب کی اور اس نے کہا: فلاں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے تو یہ اجازت نہیں ہے اور اگر اس نے معاملات طے ہونے کے بعد یہ بات کہی تو یہ اجازت ہے۔ اگر ولی کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اجازت طلب کرے تو لڑکی کا بولنا ضروری ہے کیونکہ ضرورت کے وقت سکوت کو رضا سمجھا جاتا ہے، اور وہ ضرورت ولی کا اجازت طلب کرنا ہے یا لڑکی کا بولنے سے عاجز ہونا ہے۔ لہٰذا عدم ضرورت کو اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ غیر ولی عقد کا مالک ہی نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ لڑکی اس کے کلام کی طرف توجہ ہی نہ کر رہی ہو۔ اگر باکرہ کا خاوند مباشرت سے پہلے مر گیا یا اس نے باکرہ بیوی کو قبل از دخول طلاق دے دی تو حیاء، اور بکارت کے باقی ہونے کی وجہ سے اس کی شادی باکرہ لڑکیوں کی طرح کی جائے گی۔

شادی شدہ سے اجازت نکاح

ثیبہ کی اجازت قول کے ساتھ ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا تنکح الثیب حتی تستأمر**[1] ''ثیبہ کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے'' اور اس کی اجازت قول کے ساتھ ہوگی۔ اگر ثیبہ کے والد نے اس سے اجازت لئے بغیر اس کا نکاح کر دیا اور لڑکی نے اس سے انکار کر دیا تو تمام اہل علم کے نزدیک یہ نکاح منسوخ ہوگا۔

اگر لڑکی کی بکارت کودنے، زخم ہونے، زیادہ عمر تک کنواری رہنے یا حیض کی وجہ سے زائل ہوگئی تو وہ باکرہ ہے کیونکہ وہ باکرہ لڑکیوں کے حکم میں ہے۔ اور جس لڑکی کی بکارت زنا کی وجہ سے زائل ہو جائے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ باکرہ لڑکیوں کے حکم میں ہے اور صاحبین فرماتے ہیں کہ اس کی شادی ثیبہ لڑکیوں کی طرح کی جائے گی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کے بولنے کی شرط لگا دی جائے اور پھر اگر وہ نہیں بولے گی تو اس سے نکاح کی مصلحت فوت ہو جائے گی اور اگر وہ بولتی ہے تو اس کے بولنے سے لوگوں کے سامنے اس کا زانیہ ہونا مشہور ہو جائے گا۔ الغرض وہ بے چاری تو دونوں صورتوں میں ماری جائیگی۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس سے دفع ضرر کی وجہ سے بولنے کی شرط نہ لگائی جائے۔ لیکن اگر وہ حد زنا میں محدود ہو کر زانیہ مشہور ہو چکی ہے یا اسے زنا کی عادت ہے اور وہ بار بار اس کی ارتکاب کرتی ہے تو بالاجماع اس کا بولنا ضروری ہے کیونکہ اس کی حیاء زائل ہو چکی ہے اور بولنے کی وجہ سے اس کی بدنامی نہیں ہوتی۔

باکرہ سمجھ کر شادی کی لیکن تھی ثیبہ

اگر مرد نے لڑکی کو باکرہ سمجھ کر شادی کی لیکن وہ ثیبہ تھی تو مرد پر مکمل مہر واجب ہوگا کیوں کہ نکاح میں بکارت ضروری قرار نہیں دی جاتی۔

چند ضروری مسائل

خاوند نے بیوی سے کہا تجھے نکاح کی خبر پہنچی تو تو خاموش رہی تھی۔ عورت نے کہا: نہیں بلکہ میں نے تو اسے رد کر دیا تھا، اس معاملے میں عورت کا قول معتبر ہوگا کیونکہ وہ انکار کرنے والی ہے اور اپنی بضع کی مالک ہے۔ اس صورت میں بینہ مرد کے ذمہ ہوں گے کیونکہ وہ مدعی نکاح ہے

[1] [عارضۃ الاحوذی ۲۳/۵]

اور عورت پر یمین نہیں ہوگی۔ یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے اور صاحبین رحمہما اللہ کا مسلک اس کے برعکس ہے۔

اگر لڑکی نے اپنی شادی خود کر لی اور اس کے ولی نے اس کی رضا سے دوسری جگہ کر دی۔ ان دونوں میں سے لڑکی جس کے بارہ میں کہے کہ پہلے اس سے شادی ہو چکی ہے تو اس سے شادی ہو جائیگی۔ کیونکہ اپنے بارے میں اس کا اقرار درست ہے۔ اور اس کے باپ کا اقرار اس کی ذات پر درست نہیں۔ اور اگر لڑکی نے کہا مجھے یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں نکاحوں میں کون سا پہلے ہوا ہے، تو ان دونوں میں سے کوئی نکاح بھی ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں سے اکٹھے نکاح بھی نہیں ہوسکتا اور کسی کی اولیت بھی ثابت نہیں ہے۔ اگر ولی نے لڑکی کا نکاح کیا اور جب اسے اس کی خبر ملی تو اس نے رد کر دیا۔ پھر ولی نے لڑکی سے کہا ایک جماعت تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے، لڑکی نے کہا آپ جس سے چاہیں نکاح کر دیں میں راضی ہوں۔ ولی نے اسی پہلے شخص سے اس کی شادی کر دی تو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ لڑکی کے یہ کہنے کہ ''جس سے چاہیں شادی کر دیں میں راضی ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے علاوہ جس سے چاہیں شادی کر دیں۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی اور سے کہا: میں فلاں عورت کے ساتھ رہنے کو ناپسند کرتا ہوں لہٰذا میں نے اسے طلاق دے دی ہے تم کسی عورت سے میرا نکاح کرا دو۔ اگر اس آدمی نے اس کی شادی اس پہلے والی عورت سے کرادی تو یہ جائز نہیں ہے۔

کمسن کا نکاح کرنا

ولی کیلئے چھوٹے لڑکے، لڑکی اور مجنونہ کا نکاح کرنا جائز ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لاینکح النسآء إلا من الأکفآء ولا یزوجھن إلا الأولیآء.**[1] ''لڑکیوں کا نکاح کفو میں کیا جائے اور ان کا نکاح اولیاء کریں۔'' بالغات سابقہ احادیث کی وجہ سے خارج ہوگئیں صرف چھوٹی لڑکیاں باقی رہ گئیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سات سال کی عمر میں نکاح فرمایا اور نو سال کی عمر میں رخصتی کی۔

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت ام کلثوم کی چھوٹی عمر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شادی کی۔

حضرت ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ان کی

---

[1] [مجمع الزوائد ۲/۲۸۵]

بیٹی سے نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ چھوٹی ہے۔ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر انکار کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا، میں اس کو آپ کی طرف بھیجتا ہوں اگر آپ کو پسند آئی تو وہ آپ کی بیوی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی پنڈلی سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو حضرت ام کلثوم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: چھوڑ دیجئے، اگر آپ امیر المومنین نہ ہوتے تو میں آپ کی آنکھیں نکال دیتی۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کے پیش نظر ان کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا کہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **كل سبب و نسب منقطع يوم القيامة إلا سببي و نسبي.**[2] ''قیامت کے دن میرے سبب اور نسب کے سوا ہر سبب اور نسب ختم ہو جائے گا۔'' لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کا سبب اور نسب مل جائے۔

شارع علیہ السلام نے صغیرہ (کمسن بچی) پر ولایت کو ثابت رکھا ہے۔ کیونکہ یہ ولایت کئی مصالح کو متضمن ہے۔ اور یہ مصلحتیں ان دو مرد وعورت کے درمیان پائی جاتی ہیں جو آپس میں برابر ہوں اور چونکہ کفو ہر وقت نہیں ملتا لہٰذا حصول مصلحت کیلئے صغار پر اثباتِ ولایت کی ضرورت پڑی۔

پھر اگر نکاح کرنے والا (ولی) باپ یا دادا ہے تو متزوج کو بعد از بلوغ اختیار نہیں کیونکہ باپ اور دادا کی شفقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ان کا عقد لازم ہوگا اور اس میں اختیار نہیں ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بالغ ہونے کے بعد اختیار نہیں دیا تھا۔ اور اگر ولیٔ نکاح باپ، دادا کے علاوہ کوئی اور ہے تو پھر ان دونوں کو بعد از بلوغ اختیار ہے خواہ نکاح باقی رکھیں یا فسخ کر دیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ولی اگر باپ دادا کے علاوہ کوئی اور ہو تب بھی متزوج کیلئے اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ولی بھی ولایت میں باپ دادا کی طرح ہے۔ اگر منکوحہ بعد از دخول بالغ ہو تو نکاح کو برقرار رکھنے یا رد کرنے کیلئے اس کا بولنا اور تصریح ضروری ہے۔ اب اس کا حکم وہی ہے جو عقد نکاح میں ثیبہ کا ہوتا ہے، یہی حکم لڑکے کا ہے۔

عدم قبول اور عدم رضا کے وقت، فسخ نکاح کیلئے، قاضی کا فیصلہ ضروری ہے کیونکہ عقد تام ہو چکا ہے اور اس کے احکام ثابت ہو چکے ہیں۔ اب یہ عقد دونوں کی رضامندی یا عدالت کے فیصلے

---

[1] [کنز العمال ۱۶/۵۱۰] [2] [کنز العمال ۱۶/۵۲۱]

سے ختم ہوگا۔اگرلڑکی نے خیار بلوغ میں فسخ نکاح کو اختیار کیا اور قاضی نے ان دونوں کے درمیان تفریق کردی تو یہ فرقت بغیر طلاق کے ہوگی۔لہٰذا عورت کو مہر نہیں ملے گا۔اسی طرح اگرلڑکے نے دخول سے پہلے خودکو(فسخ نکاح کیلئے)اختیار کرلیا تو اس کے ذمے کوئی مہر نہیں ہوگا۔

اگران میں سے کوئی ایک،خواہ بالغ ہو چکا ہو یا نہ،تفریق سے پہلے مرگیا تو دوسرا اس کا وارث ہوگا کیونکہ عقد صحیح ہے اور اس کے ذریعے ملک ثابت ہو چکی ہے۔

جن سے نکاح حرام ہے

قرآن وحدیث سے محرماتِ نکاح کی نو اقسام ثابت ہیں۔

(ا) محرماتِ قرابت،اور یہ سات ہیں۔

(الف) ماں،دادی،نانی......آگے تک۔

(ب) بیٹیاں،پوتیاں،نواسیاں......آگے تک۔

(ج) بہنیں،خواہ علاتی ہوں یا اخیافی۔

(د) پھوپھیاں

(ہ) خالائیں۔

(و) بھتیجیاں......آگے تک۔

(ز) بھانجیاں......آگے تک۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"حرمت عليكم أمهتكم و بنا تكم وأخواتكم، و عمٰتكم و خلاتكم و بنات الأخ وبنات الأخت."[نساء:۲۳]

''حرام ہوئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بیٹیاں بھائی کی اور بہن کی۔''

ان خواتین سے نکاح،وطی،دواعی وطی،بوس وکنار،شہوت سے چھونا اور شہوت کے ساتھ باتیں کرنا قرآن مجید کی نص سے ہمیشہ کیلئے حرام ہے۔ان کے علاوہ باقی رشتہ دار عورتیں حلال ہیں۔ارشادالٰہی ہے:

وأحل لكم ماورآء ذلكم.[نساء:۲۴]

''اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا۔''

(۲) دامادی کے رشتے کی وجہ سے حرام ہونے والی عورتیں یہ چار ہیں:

(الف) بیوی کی ماں یعنی ساس اور وہ نفس عقد کی وجہ سے مرد پر حرام ہو جائیگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَاُمَّھَاتُ نِسَآئِکُمْ" [نسآء:۲۳] "اور مائیں تمہاری بیویوں کی" بشرطیکہ عقد صحیح ہو۔

(ب) ربیبہ۔ اگرچہ وہ خاوند کی پرورش میں نہ ہو۔ لیکن یہ تب حرام ہوگی جب وہ اپنی بیوی یعنی اس کی ماں کے ساتھ دخول کرے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ" [نساء:۲۳] "اور وہ لڑکیاں جو پل رہی ہوں تمہارے گھروں میں، جو اولاد ہوں تمہاری ان بیویوں کی جن سے تم مباشرت کر چکے ہو۔"

(ج) بیوی کی نواسیاں اور پوتیاں کیوں کہ ربیبہ کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے۔

(د) بیٹے کی بیوی (یعنی بہو) پوتے کی بیوی، نواسے کی بیوی آگے تک۔ خواہ اس کے بیٹے، پوتے اور نواسے نے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ" [نساء:۲۳] "اور بیویاں تمہارے ان بیٹوں کی جو تمہارے صلب سے ہوں"

اور منہ بولے بیٹے کی بیوی اس میں شامل نہیں ہوگی۔ باپ کی بیوی اور دادا اور نانا کی بیوی آگے تک بیٹے پر حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَلَا تَنْکِحُوْا مَانَکَحَ اٰبَآؤُکُمْ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَاقَدْسَلَفَ" "اور نہ نکاح کرو تم ان سے کہ نکاح کر چکے ہوں تمہارے باپ ان عورتوں سے۔ مگر جو کچھ پہلے ہو چکا (سو ہو چکا)"۔ [النساء:۲۳]

اگر کسی نے اپنی سگی بیٹی کو بھول کر یا جان بوجھ کر شہوت سے چھو لیا تو اس کی ماں یعنی اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائیگی۔

(۳) رضاعت کی وجہ سے حرام ہونے والی عورتیں

وہ رضاعت حرمت کا سبب ہے جو مدت رضاعت کے اندر ہو، رضاعت کی مدت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تیس ماہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَالْوَالِدَاتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ"

"اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو سال پورے"۔

اور پھر ارشاد فرمایا:

''فَاِنْ اَرَادَا فِصَالاً عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا''
[البقرۃ:۲۳۳]

''پھر اگر ارادہ کرلیں وہ دونوں دودھ چھڑانے کا باہمی رضامندی اور مشورے سے تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر۔''

لہٰذا ثابت ہوا کہ دوسال کے بعد بھی مدت رضاعت ہے کیونکہ دوسال کے بعد اچانک بچے کا دودھ چھوڑنا ممکن نہیں بلکہ اتنی مدت کی زیادتی ضروری ہے جس میں بچے کو دودھ چھوڑنے کی عادت ہوجائے۔ اس مدت میں اس کی غذا کبھی دودھ ہو اور کبھی کوئی دوسری شئی ہو۔ یہاں تک کہ وہ دودھ کو بھول جائے اور اقل مدت جس میں عادت تبدیل ہوتی ہے وہ چھ ماہ ہے مدت حمل پر اعتبار کرتے ہوئے۔ پس ایسے بچے کو جس کی عمر اڑھائی سال یا اس سے کم ہو دودھ پلانے سے حرمت رضاعت ثابت ہوجائیگی۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوسال کے بعد رضاعت نہیں ہے۔ یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَاَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ[البقرہ:۲۳۳]

''دوسال پورے اس شخص کیلئے جو چاہے کہ پوری ہو دودھ پلانے کی مدت''

جمہور علمائے صحابہ اور تابعین کے نزدیک مدت رضاعت دو سال ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلاَدَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ[البقرہ:۲۳۳]

''اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دوسال پورے۔''

پس دوسال یا اس سے کم عمر بچے کو دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہوجائیگی۔ باقی رہا حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ کو بڑی عمر میں حضرت سہلہ رضی اللہ عنہا کا دودھ پلانا، یہ ان حضرات کے ساتھ خاص ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ حضرت ابو حذیفہ کے غلام ان کے ساتھ اور ان کے گھر میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی عمرۃ بنت یعار یا سلمی بنت یعار انصاریہ تھیں۔ حضرت سہلہ بنت سہیل بن عمرو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا: سالم مردوں کی عقل اور سوجھ بوجھ کو پہنچ گیا ہے اور وہ ہمارے پاس آتا جاتا ہے اور میں اس بارے میں حضرت ابو حذیفہ کے دل میں کھٹکا محسوس کرتی ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نے فرمایا "اَرْضِعِیْهِ تَحْرُمِی عَلَیْهِ" "اس کو دودھ پلا دے تو اس پر حرام ہو جائے گی۔" پس میں نے اسے دودھ پلا دیا، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا میں نے اسے دودھ پلایا ہے۔ اس سے ابو حذیفہ کے ذہن میں جو کھٹکا تھا وہ ختم ہو گیا۔[۱] اور دوسری روایت میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا اَرْضِعِیْهِ "تو اسے دودھ پلا دے" انہوں نے عرض کیا: میں اسے کیسے دودھ پلاؤں وہ تو بڑی عمر کا آدمی ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا دیئے اور فرمایا قَدْ عَلِمْتُ اَنَّهٗ رَجُلٌ کَبِیْرٌ "میں بھی جانتا ہوں کہ وہ بڑی عمر کا ہے۔"[۲]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواج نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ کوئی شخص اس رضاعت کی وجہ سے ان کے پاس آئے۔ اور ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ہمارے خیال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ رخصت صرف سالم کو دی تھی، کوئی شخص ہمارے پاس اس رضاعت کی وجہ سے نہ آئے اور نہ ہمیں دیکھے۔[۳]

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی کی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور وفات پا گیا۔ اس کے پستانوں میں دودھ بہت زیادہ تھا اس نے اپنے خاوند سے کہا: اسے چوس کر کلی کر دے۔ خاوند نے اسی طرح کیا لیکن کچھ دودھ اس کے حلق میں داخل ہو گیا۔ وہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور آپ سے اس بارے میں پوچھا۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تجھ پر تیری بیوی حرام ہو گئی۔ پھر وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس بارے میں سوال کیا اور حضرت ابو موسیٰ کا قول بھی انہیں بتایا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو تو علاج کر رہا تھا دودھ چھوڑنے کے بعد رضاعت نہیں۔ رضاعت محرم وہ ہے جس کے ذریعے گوشت اور ہڈیاں پرورش پائیں تو اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے وہ آدمی حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور انہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بتلایا تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھ سے اس وقت تک سوال نہ کرو جب تک یہ بڑے عالم تم میں موجود ہیں۔[۴]

قلت رضاعت کا حکم

رضاعت کی قلت یا کثرت حرمت میں برابر ہے۔ یہ قول حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن، حضرت

۱ [نسائی:۶/۱۰۵] ۲ [مسلم مع نووی:۳۱]

۳ [مسلم مع نووی ۱۰/۳۱] ۴ [الآثار:۱۳۴]

عطاء، حضرت طاؤس، حضرت مکحول، حضرت حکم، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب امام لیث بن مسعد، امام مالک، امام اوزاعی اور امام ثوری رحمھم اللہ کا ہے۔ اطلاق آیت کی وجہ سے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَاُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِیْ اَرْضَعْنَكُمْ" [نساء:۲۳]

''اور تمہاری مائیں جنہوں نے دودھ پلایا''

امام شافعی اور امام احمد کی ایک روایت کے مطابق پانچ گھونٹ رضاعت سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ امام احمد کی ایک روایت اور امام داؤد کے قول کے مطابق تین گھونٹ سے رضاعت ثابت ہوتی ہے جمہور کا مذہب اقویٰ ہے کیونکہ عدد کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ لہٰذا کم سے کم جس پر رضاعت کا اطلاق ہوتا ہے اس کی طرف رجوع ضروری ہے۔[1]

وہ تمام عورتیں جو قرابت اور دامادی کے رشتے کی وجہ سے حرام ہوتی ہیں رضاعت سے بھی حرام ہو جاتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَاُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِیْ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ"

''اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری رضائی بہنیں بھی''

نبی پاک ﷺ کا فرمان ہے۔ "يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَايَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ" رضاعت کی وجہ سے وہ عورتیں حرام ہوتی ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتی ہیں۔ نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "اَلرَّضَاعُ يُحَرِّمُ مَاتُحَرِّمُ الْوِلَادَةُ" 'رضاعت ان عورتوں کو حرام کرتی ہے جن کو ولادت حرام کرتی ہے۔'' اس بات پر اجماع امت ہے اس میں کسی امام کا اختلاف نہیں ہے۔ جب ماں حرام ہو جائے گی تو اس طرح اس ماں کا خاوند بھی حرام ہو جائے گا کیونکہ وہ اس کا والد ہے۔ نیز دودھ بھی ان دونوں کا ہے اور حرمت رضاعی والد کی اولاد کی طرف بھی متعدی ہو جائیگی۔ پس صاحب لبن کے بھائی اس کے رضاعی چچا ہوں گے اور دودھ پلانے والی کے بھائی اس کے رضاعی ماموں ہوں گے۔ اس کی رضاعی پھوپھیاں، خالائیں، بہنیں اور بھانجیاں نسب کی طرح اس پر حرام ہونگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اِنَّهَا اِبْنَةُ اَخِی مِنَ الرَّضَاعَةِ"[2] وہ میرے رضائی بھائی کی بیٹی ہے۔

[1] [الآثار ۱۳۴]   [2] [بخاری ۲۰:۹۶]

حضرت ایاس بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسی لڑکی سے مت شادی کر جس کو تیرے باپ کی بیوی نے دودھ پلایا ہو اور نہ اس سے جس کو تیری بہو اور بھابھی نے دودھ پلایا ہو۔[1]

اکیلی عورت کی گواہی رضاعت میں معتبر نہیں

رضاعت میں صرف اکیلی عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، رضاعت دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے ثابت ہوگی۔ یہ مذہب امام ابوحنیفہ کا ہے اور یہی قول حضرت عمر، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور جمہور بھی اسی طرف گئے ہیں کہ رضاعت میں مرضعہ کی شہادت کافی نہیں ہے کیوں کہ یہ اس کی اپنے فعل پر شہادت ہے۔

عینی میں مذکور ہے کہ بنی عبس کے ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایک مرد نے ایک عورت سے شادی کی۔ ایک دوسری عورت آئی اور اس نے کہا میں نے ان میاں بیوی دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا میاں کا بیوی سے دور رہنا بہتر ہے لیکن ایک عورت کی وجہ سے بیوی میاں پر حرام نہیں ہوگی۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رضاعت میں ایک عورت کی گواہی کو معتبر قرار نہیں دیتے تھے۔[2]

(۴) محرمات بالجمع یعنی مرد کیلئے چار عورتوں سے زیادہ کا جمع کرنا حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ" [نساء:۳] "دو تین اور چار" یہ چار عورتوں کیلئے نص ہے پس ان پر زیادتی جائز نہیں ہے۔ حضرت غیلان رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اِخْتَرْ مِنْھُنَّ اَرْبَعًا وَفَارِق سَائِرَھُنَّ"[3] "ان میں سے چار اختیار کرلو اور باقی سب کو چھوڑ دو"۔

تاہم باندیوں کو ملکاً اور وطئاً جمع کرنا حلال ہے اگرچہ وہ زیادہ ہوں۔ آدمی کیلئے دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے اور دو بہنوں کو اگر باندیاں ہوں تو از روئے وطی جمع کرنا حرام ہے نہ کہ از روئے ملک یمین۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَاقَدْ سَلَفَ" [نساء:۲۳]

"اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو مگر جو ہو چکا (سو ہو چکا)"

اگر کسی شخص نے دو بہنوں سے ایک ہی عقد میں شادی کی تو ان دونوں میں سے کسی ایک

---

[1] [کنز العمال ۱۶:۵۱۸]
[2] [اعلاء السنن ۱۱/۱۴۰]
[3] [اعلاء السنن ۱۱/۳۶]

کے نکاح کے جواز اولیت نہ ہونے کی وجہ سے دونوں کا نکاح فاسد ہو جائے گا۔ اگر دو بہنوں سے ایک آدمی نے دو عقدوں میں شادی کی اور اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ ان میں پہلے کس کے ساتھ شادی کی تو اس کے اور ان دونوں کے درمیان جدائی کروا دی جائے گی کیونکہ ان میں سے ایک کا نکاح یقینی طور پر باطل ہے اور عدم اولیت کی وجہ سے یہ یقین نہیں کہ کس کے ساتھ نکاح باطل ہے۔

اور اگر پہلے ایک سے نکاح کیا پھر دوسری سے کیا تو دوسری سے کیا ہوا نکاح فاسد ہے لہٰذا اس سے علیحدہ ہو جائے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک اس کی عدت نہ گزر جائے اس وقت تک اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدمی اس وقت تک پانچویں عورت سے شادی نہ کرے جب تک چوتھی کی عدت نہ گزر جائے، خواہ وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ۔ اور اس طرح دونوں بہنوں کا حکم ہے۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص کے بارے میں یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ اگر چار بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے دے تو اس وقت تک اور عورت سے شادی نہ کرے جب تک کہ مطلقہ کی عدت نہ گزر جائے۔[1]

(ج) انسان کیلئے حرام ہے کہ وہ پھوپھی اور بھتیجی کو جمع کرے یا خالہ اور بھانجی کو جمع کرے۔ اور ان میں سے دوسری کا نکاح منسوخ ہوگا۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار عورتوں کو آپس میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے اور وہ یہ ہیں پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "لَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا وَلَا عَلٰى خَالَتِهَا"[2] "عورت اپنی پھوپھی اور خالہ پر نکاح نہ کرے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ؐ نے اس بات سے منع فرمایا کہ عورت اپنی پھوپھی پر نکاح کرے یا پھوپھی اپنی بھتیجی پر نکاح کرے اور عورت اپنی خالہ پر نکاح کرے یا خالہ اپنی بھانجی پر نکاح کرے، نہ چھوٹی بڑی پر نکاح کرے اور نہ بڑی چھوٹی پر نکاح کرے۔[3]

(د) عورت اور اس کی بیٹی کو جمع کرنا حرام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "فلاتعرض علی بناتکن ولا اخوتکن."[4] "تم میرے اوپر اپنی بیٹیاں اور بہنیں پیش نہ کرو۔"

---

[1] [اعلاء السنن: ۳۶/۱۱]　　[2] [نسائی: ۹۸/۶]

[3] [عارضۃ الاحوذی ۵۶/۵]　　[4] [نسائی ۹۵/۶]

مرد عورت اور اس کے پہلے خاوند کی بیٹی کو جمع کرسکتا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان کوئی قرابت نہیں ہے۔

(۵) محرمات بالتقدیم

مرد کیلئے آزاد عورت پر باندی سے نکاح کرنا حرام ہے اور نہ ان دونوں کو ایک عقد میں جمع کرسکتا ہے۔ مرد جب اپنی آزاد بیوی کو طلاق دیدے تو جب تک وہ عدت میں ہے اس وقت تک مرد کیلئے باندی سے نکاح کرنا حرام ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آزاد عورت پر باندی کے ساتھ نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے[۱] اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ باندی آزاد عورت پر نکاح نہ کرے جبکہ آزاد باندی پر نکاح کرسکتی ہے۔[۲]

آزاد عورت کا آزاد پر نکاح کرنا جائز ہے اور آزاد اور باندی کا باندی پر نکاح کرنا جائز ہے۔ اور آدمی کیلئے آزاد عورت پر قدرت ہونے کے باوجود باندی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ" [نساء:۲۴]

"اور حلال ہیں تمہارے لئے وہ (عورتیں) جو علاوہ ہیں ان کے"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"فَانْکِحُوا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَاءِ" [نساء:۳]

"پس تم نکاح کرو ان عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں۔

محرمات بحق الغیر

(۶) (الف) دوسرے مرد کی بیوی اور اس کی معتدہ کے ساتھ آدمی کا نکاح حرام ہے کیونکہ یہ مفضی الی اشتباہ الانساب ہے۔ اسی وجہ سے کسی بھی دین میں ایک عورت کا دو مردوں کے نکاح میں جمع ہونا مشروع نہیں ہے۔

(ب) آدمی پر کسی دوسرے کی حاملہ بیوی سے نکاح کرنا حرام ہے تاکہ اس کا پانی کسی غیر کے کھیتی کو سیراب نہ کرے۔ اگر وہ حاملہ عورت بے دین ہے یا اپنے آقا کی ام ولد ہے اور اس کے ساتھ شادی کی تو یہ نکاح فاسد ہوگا۔

---

۱ [بیہقی: ۱۷۵/۷] ۲ [بیہقی: ۱۷۵/۷]

طرفین کے نزدیک زانیہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اگر کوئی شخص کسی زانیہ حاملہ سے شادی کرے تو یہ نکاح جائز ہے لیکن وضع حمل تک اس سے وطی نہ کرے۔ کیونکہ وہ اس ارشاد باری تعالیٰ کے تحت داخل ہے۔ "وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ." "اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا بشرطیکہ طلب کرو"

جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس عورت کے ساتھ نکاح فاسد ہے۔

(۷) محرمات بالملک

(الف) مرد کیلئے اپنی باندی سے نکاح حرام ہے۔

(ب) عورت کیلئے اپنے غلام سے نکاح حرام ہے اور غلام کے بعض حصے کا مالک ہونا اس کے کل کا مالک ہونا ہے۔ اور ملک یمین ملک نکاح سے اقویٰ ہے کیونکہ ملک نکاح زوجین میں سے ہر ایک پر دوسرے کیلئے حقوق لازم کرتی ہے جبکہ غلامی اس کے منافی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس نے اپنے غلام سے شادی کر لی تھی۔ اس عورت نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ نہیں فرمایا؟

"اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" [نساء:۳]

"یا وہ (باندی) جو تمہاری ملک میں ہو۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں کو مارا اور ان کے درمیان تفریق کر دی اور یہ بات تمام شہروں والوں کو لکھ کر بھیج دی۔[1]

نیز حضرت حاکم سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی عورت کے بارے میں جس نے اپنے غلام سے شادی کر لی تھی لکھا کہ ان دونوں کے درمیان جدائی کر دی جائے اور اس عورت پر حد قائم کی جائے۔[2]

(۸) محرمات بالکفر

بت پرست اور مجوسی عورتوں سے نکاح حرام ہے اور ان سے ملک یمین کی وجہ سے وطی بھی حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ" [البقرہ:۲۲۱]

"اور نکاح نہ کرو تم مشرک عورتوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں"

---

[1] [کنز العمال:۵۴۳/۱۶] [2] [کنز العمال:۵۴۳/۱۶]

جبکہ کتابیات سے نکاح کرنا آیت مائدہ سے خلاف قیاس ثابت ہے، اس کے غیر کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

(۹) مطلقہ بثلاث

مطلقہ ثلاثہ اپنے طلاق دینے والے خاوند پر بالاجماع حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" [البقرہ: ۲۳۰]

"پھر اگر طلاق دیدی مرد نے بیوی کو تو وہ حلال نہیں ہوگی اس کے لئے اس کے بعد، جب تک کہ وہ نکاح نہ کرے کسی اور خاوند سے اس کے سوا۔"

مرتد اور مرتدہ کے نکاح کے جائز نہ ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ اور ارتداد کہتے ہیں ایمان لانے کے بعد کلمہ کفر بول کر یا کسی باطل اعتقاد کے ساتھ یا نبی کریم ﷺ جو دین لائے ہیں اس کی ضروریات میں سے کسی کا انکار کر کے دین اسلام سے نکلنا۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب وہ نبی کریم ﷺ کی طرف جھوٹ کی نسبت کرے گا یا آپ کے دین کو ہلکا سمجھے گا۔ جب کوئی شخص دین کو اور (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کو یا نبی کریم ﷺ کو یا عرش و کرسی یا ملائکہ کو گالی دیتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے۔ خواہ اس نے کفر کا اعتقاد نہ رکھا ہو۔

جب زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جاتا ہے تو ان دونوں کے درمیان بغیر طلاق کے فرقت ہو جاتی ہے۔ پھر اگر زوجہ بعد الدخول مرتد ہوئی ہے تو اس کے لئے مہر ہوگا اور اگر وہ دخول سے پہلے مرتد ہوگئی تو اس کیلئے نہ مہر ہوگا اور نہ نفقہ۔ اور اگر خاوند دخول سے پہلے مرتد ہوا تو اس کی بیوی کو نصف مہر ملے گا اور اگر دخول کے بعد مرتد ہوا تو عورت کو پورا مہر ملے گا اور اگر وہ دونوں اکٹھے مرتد ہوئے پھر اکٹھے مسلمان ہوگئے تو وہ اپنے نکاح پر قائم ہیں کیونکہ بنی حنیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتد ہو گئے تھے پھر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے نکاحوں کو برقرار رکھا اور تجدید نکاح کا حکم نہیں دیا۔ اور یہ بات صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوئی اور ان میں سے کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں فرمائی جو اجماع کی دلیل ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک مرتد ہونے کے بعد اسلام لایا تو نکاح فاسد ہو جائے گا۔ اگر زوجہ صغیرہ مرتد ہوگئی تو اس کا مہر ساقط ہو جائے گا کیونکہ جب اس کے مرتد ہونے کا حکم لگایا جائے گا تو اس کا نکاح کیلئے محل ہونا باطل ہو جائے گا اور وہ ایسے ہو جائے گی گویا کہ کبیرہ ہے۔

زنا سے حرمت مصاہرت کا وجوب

زنا سے حرمت مصاہرت واجب ہو جاتی ہے۔ حضرت طاؤس سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کسی عورت سے زنا کرتا ہے۔ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ اس کی ماں اور بیٹی سے نکاح نہ کرے۔[1]

امام محمدؒ حضرت مجاہدؒ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؒ نے ایسے آدمی کے بارے میں جو کسی عورت سے زنا کرے فرمایا" جب اس نے اس کی فرج کی طرف دیکھا تو اس کے لئے اس کی ماں اور بیٹی حلال نہیں۔[2]

امام نخعی فرماتے ہیں: جب حلال نکاح حلال نکاح کو حرام کر دیتا ہے تو حرام زنا تو زیادہ حرام کرنے والا ہے۔[3]

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے جو چیز حلال میں حرام ہے تو وہ حرام میں زیادہ حرام ہے۔ اگر مرد نے کسی عورت سے زنا کیا تو جس عورت نے اس مزنیہ کو دودھ پلایا ہے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

حضرت عروہ بن زبیر، حضرت سعید بن مسیب، حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کسی عورت سے حرام طریقہ سے تعلق قائم کرتا ہے کہ کیا اس کیلئے اس کی مرضعہ سے نکاح کرنا حلال ہے؟ تو ان تمام حضرات نے فرمایا حرام ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب آدمی نے اپنی ساس کو چوما یا شہوت کے ساتھ چھوا تو اس پر اپنی بیوی حرام ہو جائیگی۔ جس آدمی نے کسی عورت کے ساتھ زنا یا وطی بالشبہہ کی تو اس مرد پر اس عورت کی اصول وفروع حرام ہو جائیں گی اور وہ عورت مرد کے اصول وفروع پر حرام ہو جائیگی۔ اور یہی شہوت کے ساتھ چھونے کا حکم ہے اور شہوت کی تعریف یہ ہے کہ مرد کا آلہ اسے دیکھنے یا چھونے سے منتشر ہو جائے اور اگر پہلے سے منتشر ہو تو انتشار میں شدت آ جائے۔ اگر مرد نے عورت کو چھوا اور مرد کے ہاتھ پر کپڑا تھا اب اگر وہ کپڑا مرد کے ہاتھ تک عورت کی حرارت کے پہنچنے کو روکتا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی اور اگر عورت کی حرارت محسوس ہوتی ہے تو حرمت ثابت ہو جائے گی۔

اگر خاوند کے بیٹے نے عورت کو چوم لیا یا اس کے ساتھ وطی کر لی تو وہ مزنیہ اس کے باپ

---

[1] [اعلاء السنن: ۱۱/۱۳۶]　[2] ایضاً　[3] [اعلاء السنن: ۱۱/۱۳۶]

پر حرام ہو جائے گی کیونکہ وہ اس کے بیٹے کی بیوی ہو گئی ہے۔ اور اگر یہ دخول سے پہلے ہوا ہے اور عورت اس پر راضی ہے تو اس کے لئے مہر نہیں ہوگا اور اگر عورت پر زبردستی کی گئی ہے تو مہر ساقط نہیں ہوگا۔

دو عورتوں سے ایک ہی عقد میں نکاح کرنا

جس آدمی نے عقد واحد میں دو ایسی عورتوں کو جمع کیا جن میں سے ایک اس کے لئے حلال نہیں ہے تو دوسری کے ساتھ اس کا نکاح صحیح ہو جائیگا کیونکہ دوسرے نکاح کا کوئی مانع نہیں۔ لہٰذا صرف اسی کے ساتھ نکاح باطل ہوگا جس کے ساتھ اس کا نکاح حلال نہیں۔

نکاح متعہ اور نکاح مؤقت کا حکم

نکاح متعہ باطل اور حرام ہے اس کی حرمت کتاب وسنت میں وارد ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ"

"مگر اپنی جوروؤں سے یا اپنے ہاتھ کے مال سے"

اور متمتع بہا نہ تو بیوی ہے اور نہ ہی لونڈی۔ اس کا مملوکہ نہ ہونا تو ظاہر ہے اور اس کا زوجہ نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ ازواج میں بہت سارے احکام مثلاً وراثت وغیرہ پائے جاتے ہیں جو نکاح متعہ میں موجود نہیں۔ اور اس پر ہمارا اور مخالفین کا اتفاق ہے کہ اس میں نہ تو میراث ہوتی ہے اور نہ بچے کا نسب ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی طلاق ہوتی ہے۔ اور اس طریقے سے قاضی یحییٰ بن اکثم نے متعہ کا زنا ہونا ثابت کیا ہے۔ نکاح متعہ کی صورت یہ ہے کہ مرد عورت سے کہے: تو مجھے اپنے نفس سے اتنے مال کے بدلے اتنی مدت تک فائدہ اٹھانے دے، اور مال مقرر کر دے۔ اور عورت جواب میں کہے: میں نے اپنے نفس سے تجھے فائدہ اٹھانے دیا۔ اس میں لفظ تمتع (فائدہ وغیرہ) کا ذکر ضروری ہے۔

اور سنت سے اس کا باطل اور حرام ہونا ان روایات سے ثابت ہے۔ حضرت سبرة جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یاایها الناس انی قدکنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء وان اللہ قد حرم ذلک الیٰ یوم القیمة فمن کان عندہ منهن شئ فلیخل سبیله ولا تاخذوا ما أتیتموهن شیئا [1]

---

[1] مسلم مع نووی ۹/۱۸۶]

''اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں کے ساتھ متعہ کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے۔ جس کسی کے پاس ان عورتوں میں سے کوئی ہو تو وہ اسے چھوڑ دے اور جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ نہ لو۔''

حضرت سبرۃ جہنی رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت میں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب ہم مکہ میں داخل ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں متعہ کی اجازت دی، پھر ابھی ہم مکہ سے نکلے بھی نہ تھے کہ ہمیں اس سے روک دیا۔[1]

ان کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی متعہ کی حرمت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثابت ہوتی ہے۔ متعہ کے بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ اسے پہلی مرتبہ خیبر کے دن حرام قرار دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مسلم شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے خیبر والے دن منع کیا۔ پھر فتح مکہ والے سال اسے مباح قرار دیا گیا۔ حضرت سبرہ بن معبد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کی اجازت دی تو میں اور بنی سلیم کا میرا ایک ساتھی نکلے۔ یہاں تک کہ ہم نے بنی عامر کی ایک لڑکی کو پایا وہ لڑکی لمبی گردن والی اونٹنی کی طرح تھی۔ ہم نے اسے اس کے لئے پیغام دیا اور اس پر اپنی چادریں پیش کیں۔ اس نے دیکھنا شروع کیا تو مجھے میرے ساتھی سے خوبصورت پایا اور اس کی چادر کو میری چادر سے خوبصورت پایا۔ تھوڑی دیر اس نے اپنے دل میں سوچا پھر اس نے میرے دوست کی بجائے مجھے اختیار کر لیا۔ ہمارے (میرے اور میرے ساتھی) کے پاس تین لڑکیاں تھیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ان سے جدا ہونے کا حکم دے دیا۔[2]

متعہ جائز تھا پھر اسے خیبر والے سال حرام قرار دے دیا گیا۔ پھر جب فتح مکہ کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ میں داخل ہوئے تو تھوڑی مدت کیلئے حلال کیا گیا اور وہ مکہ سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ انہیں اس سے روک دیا گیا۔ متعہ صرف تین دن جائز رہا۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اوطاس والے سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین دن متعہ کی رخصت دی پھر اس سے روک دیا۔[3] میں، (علامہ ضاغرجی) کہتا ہوں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو مسلم میں ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مٹھی کھجور یا جو کے بدلہ متعہ کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے منع کر دیا، کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی بھی چیز کو اپنی طرف سے روکنے والے نہیں تھے بلکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا تو منع فرمایا۔

---

[1] مسلم نووی: ۱۸۷/۹ [2] مسلم مع نووی ۱۳۰/۴ [3] مسلم مع نووی: ۱۸۹/۹

امام ابن ماجہ سند صحیح سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین دن متعہ کی اجازت دی تھی پھر اسے حرام کر دیا تھا۔ اللہ کی قسم میں تم میں سے کسی محصن کو متعہ کرتے ہوئے نہ دیکھوں، ورنہ میں اسے پتھروں سے رجم کر دوں گا، مگر یہ کہ وہ اس بات پر میرے پاس چار گواہ لائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حرام کرنے کے بعد حلال کر دیا تھا۔[1] متعہ خیبر والے سال حلال قرار دیا تھا۔ پھر (فتح مکہ کے موقع پر) تین دن کی قلیل مدت کیلئے حلال قرار دیا گیا پھر صحابہ کرام مکہ سے نکلے بھی نہ تھے کہ حرام قرار کر دیا گیا۔ گویا حلال ہی نہیں کیا گیا تھا اور خیبر والی تحریم ہی باقی تھی۔ اور رہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی، تو وہ متفق علیہ ہے۔

واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلاف کی ایک جماعت نے متعہ کے حلال ہونے کو ثابت کیا ہے۔ اس جماعت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت اسماء بنت ابوبکر، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن حریث، حضرت ابو سعید، حضرت سلمہ اور حضرت معید بن امیہ رضی اللہ عنہم ہیں اور تابعین میں سے حضرت طاؤس، حضرت عطاء اور حضرت سعید بن جبیر رحمہم اللہ اس جماعت میں شامل ہیں۔ اور تمام فقہائے مکہ بھی اس جماعت میں شامل ہیں تاہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وفات سے پہلے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا۔

معالم السنن میں علامہ بستی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نکاح متعہ کی تحریم مسلمانوں کے درمیان اجماع کی طرح ہے خاص طور پر حجۃ الوداع میں اس کے ذکر کی وجہ سے۔ چونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں ہوا اور اب ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہ میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے مگر کسی قدر بعض مبتدعہ نے اختلاف کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کے مباح ہونے کی تفسیر میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس شخص کے لئے مباح ہے جو مال کے کم ہونے کی وجہ سے اور لڑکی نہ ملنے کی وجہ سے لمبے عرصے سے غیر شادی شدہ ہو۔ پھر آپؓ نے اس قول سے توقف اختیار فرمایا اور اس پر فتویٰ دینا بند کر دیا۔

بعض لوگ اس مسئلے میں قیاس کی طرف گئے ہیں اور متمتع کو ایسے شخص کے مشابہ قرار دیا ہے جو مضطر الی الطعام ہو۔ یہ قیاس غیر صحیح ہے۔ کیونکہ اس میں ضرورت متحقق نہیں ہے۔ یہاں یہ غلبہ شہوت ہے جس پر صبر کرنا ممکن ہے اور غلبہ شہوت روزوں اور علاج سے رک سکتا ہے۔ بس ان

---

[1] [ابن ماجہ: ۲/۱۹۳۱]

دونوں میں سے ایک دوسرے کی طرف مجبوری کے حکم میں نہیں ہوگا۔

نکاح مؤقت بھی باطل اور حرام ہے اور اس کا حرام ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ متعہ کے معنی میں ہے اور اعتبار معانی کا ہوتا ہے خواہ تھوڑی مدت کیلئے ہو یا طویل مدت کیلئے، کیونکہ وقت مقرر کرنا اس کو باطل کر دیتا ہے اگر چہ انہوں نے دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا ہو۔

حالت احرام میں نکاح کرنا

حالت احرام میں عقد نکاح جائز ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالت احرام میں سیدہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالت احرام میں نکاح کیا تھا۔[1]

حضرت یزید بن اصم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مجھ سے شادی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلالی تھے (یعنی احرام کھول چکے تھے۔)[2]

محرم کیلئے نکاح بمعنی وطی ممنوع ہے جبکہ بمعنی عقد ممنوع نہیں ہے۔ محرم کیلئے عقد نکاح کے ممنوع ہونے کا کوئی سبب نہیں اور نہ ہی یہ کراہت پر محمول ہوگا۔ کیونکہ یہ محرم کیلئے فحش گوئی کا سبب نہیں ہے لہٰذا اس کے لئے اپنا یا کسی دوسرے کا نکاح کرنا ممتنع نہ ہوگا۔

نکاح شغار

نکاح شغار جائز ہے۔ اور وہ ہے کسی آدمی کا دوسرے آدمی سے یہ کہنا کہ تو میرے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر میں تیرے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دوں گا۔ یا وہ کہے کہ تو میرے ساتھ اپنی بہن کی شادی کر دے اور میں تیرے ساتھ اپنی بہن کی شادی کر دوں گا۔ اور ان دونوں کے درمیان مہر نہ ہو۔ احناف کے نزدیک یہ نکاح مہر مثلی کے ساتھ درست ہو جاتا ہے جبکہ جمہور اہل علم مالکیہ، شوافع اور حنابلہ اس عقد کو باطل کہتے ہیں۔ اور جو قول احناف کا ہے وہی امام زہری رحمۃ اللہ علیہ، امام مکحول رحمۃ اللہ علیہ، امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام لیث رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی حنفیہ کے موافق ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح شغار سے منع کیا ہے۔[3] حنفیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جب اس میں مہر مثلی کو لازم قرار دے دیا تو یہ نکاح شغار سے نکل گیا کیونکہ نکاح شغار وہ ہوتا ہے جس میں مہر نہ ہو۔

---

[1] [ابن ماجہ: ۶۳۲/۲] [2] [ابن ماجہ: ۶۳۲/۵] [3] [مسلم: ۱۳۹/۴]

فضولی اگر عاقدین میں سے کسی کا وکیل ہو یا کسی ایک کی موجودگی میں نکاح کرے تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے، تاہم دوسرے کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔ اگر فضولی کسی مرد سے کسی عورت کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کر دے یا کسی عورت سے کسی مرد کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر کر دے تو یہ نکاح بھی موقوفاً منعقد ہو جائے گا۔ اگر فضولی زوجین (دونوں مرد وعورت) کی طرف سے ہو تو اس کا نکاح طرفین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منعقد نہیں ہوتا جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان دونوں کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

اگر فضولی نے کہا کہ گواہ ہو جاؤ میں نے فلاں مرد کا نکاح فلاں عورت سے کر دیا اور وہ دونوں نہ وہاں موجود تھے اور نہ ان کے کہنے سے یہ کہا تو طرفین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ بھی منعقد نہیں ہوگا۔

جب فضولی نے اپنا نکاح کسی غائب لڑکی سے کیا اور مجلس میں سے کسی نے بھی لڑکی کی طرف سے قبول نہیں کیا تو طرفین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نکاح منعقد ہو جائے گا مگر لڑکی کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

کیا کوئی شخص ایجاب وقبول دونوں کا وکیل ہو سکتا ہے

ایک شخص عقد کے دونوں اطراف کا ذمہ دار ہو سکتا ہے بایں طور کہ وہ ولی ہو، یا وکیل ہو، یا ولی اور وکیل ہو، یا اصل اور وکیل ہو، یا ولی اور اصل۔ دونوں طرف سے ولی ہونے کی مثال ہے جیسے دادا اپنے ایک بیٹے کے لڑکے کا دوسرے بیٹے کی لڑکی سے نکاح کر دے، یا اپنے ایک بھائی کی بیٹی کا دوسرے بھائی کے بیٹے سے نکاح کر دے۔ دونوں طرف سے وکیل ہونے کی صورت تو ظاہر ہے۔ ولی اور وکیل ہونے کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اسے وکیل بنائے کہ وہ اس کی شادی اپنی چھوٹی بیٹی سے کر دے یا عورت اسے وکیل بنائے کہ وہ اس کی شادی اپنے چھوٹے بیٹے سے کر دے۔

وکیل اور اصیل ہونے کی صورت یہ ہے کہ عورت اسے وکیل بنائے کہ وہ اپنے ساتھ اس کی شادی کر دے۔

ولی اور اصیل ہونے کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی چھوٹی بھتیجی کا نکاح اپنے بیٹے سے کر دے۔

اور عقد کی صورت یہ ہوگی کہ وہ کہے گواہ ہو جاؤ میں نے فلاں کی شادی فلاں کے ساتھ یا اپنے ساتھ کر دی۔ یا کہے میں نے فلاں کی شادی کر دی اور اس کا قول قبول کا محتاج نہیں ہوگا کیونکہ وہ دونوں اطراف کو متضمن ہے۔

بخلاف عقد بیع کے کہ اس میں ایک ہی شخص عقد کی دونوں طرفوں کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا بایں طور کہ وہ مالک بننے والا بھی ہو اور مالک بنانے والا بھی ہو کیونکہ ایک ہی حق میں مطالِب اور مطالَب نہیں ہوسکتا۔

حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے حکیم بنت قارظ سے کہا کیا تو اپنا معاملہ میرے سپرد کرتی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''ہاں'' آپ نے فرمایا میں نے تجھ سے شادی کر لی۔[1]

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا ''اَتَرضِیُ اَنْ أزوجک فلانة'' ''کیا تو اس بات پر راضی ہے کہ میں فلاں عورت سے تیری شادی کر دوں؟

اس نے کہا ہاں۔ پھر آپ نے ایک عورت سے کہا۔ ''اترضین ان ازوجکِ فلانا'' ''کیا تو راضی ہے کہ میں فلاں مرد سے تیری شادی کر دوں۔'' اس نے کہا ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان میں سے ایک کی شادی دوسرے سے کر دی۔

''کفو''

کفاءت (مساوات) دین اور تقویٰ میں بالاجماع معتبر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ ''اِذا أتاکم من ترضون خلقه و دینه فزوجوه إلا تفعلوا تکن فتنة في الارض وَفسادٌ عریض''۔ ''جب تمہارے پاس ایسے لوگ آئیں جن کی عادات اور دین تمہیں اچھا لگے تو ان سے شادی کر دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تنکح المراة لاربع لما لها ولحسبها ولجمالها ولدینها فاظفر بذات الدین تربت یداک''۔[2] ''عورت کے ساتھ چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ مال کی وجہ سے، حسب کی وجہ سے، خوبصورتی کی وجہ سے اور دین کی وجہ سے۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں تو دین والی کو اختیار کر''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انتہائی تاکید کے ساتھ دین داری اختیار کرنے کا کہا جو کہ انتہائی مطلوب ہے پس کسی مسلمان عورت کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی ایسے شخص سے شادی کرے جس کا دین اسلام کے دین کے علاوہ ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مساوات صرف دین میں ضروری ہے اس کے علاوہ میں نہیں۔ مسلمان ایک دوسرے کے کفو ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر ابن

---

[1] [بخاری مع عینی: ۱۲۵/۲۰]　[2] [بخاری: ۱۲۵/۲۰]

عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے وارد ہے کہ عربی اور غلام کیلئے قریشی عورت سے نکاح جائز ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ" [الحجرات:۱۳]

''بے شک اللہ کے نزدیک سب سے مکرم وہ ہے جوسب سے زیادہ متقی ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "عليك بذات الدين." ''دین دارلڑکی کو اختیار کر۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا ارادہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے کردیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "يا بني بياضة انكحوا اباهند" ''اے بنی بیاضہ! تم ابو ہند کا نکاح کراؤ!'' انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم اپنی بیٹیوں کی شادیاں اپنے غلاموں سے کردیں تو یہ آیت نازل ہوئی:

"يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى" [الحجرات:۱۳]

''اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے'' [ابوداؤد:۲/۴۰۰]

احناف کے نزدیک کفو

احناف کے نزدیک دین، تقویٰ، نسب، پیشہ، مال اور حریت سب میں مساوات معتبر ہے۔

نسب میں کفاءت معتبر ہونے کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "ان الله اصطفىٰ بني كنانة من بني اسماعيل و اصطفىٰ من كنانة قريشًا و اصطفىٰ من قريش بني هاشم و اصطفاني من بني هاشم" ''اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل میں سے بنی کنانہ کو چن لیا اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا۔''

پیشے میں کفاءت معتبر ہونے کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "العرب للعرب اكفاء والموالى اكفاء الموالى الاحائك او حجام"[1] ''عرب عربوں کے لئے کفو ہیں اور موالی موالی کے لئے کفو ہیں۔مگر یہ کہ ان میں کوئی ترکھان یا حجام ہو۔''

مال میں کفاءت ہونے کی دلیل یہ ہے۔حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ابو عمرو بن حفص رضی اللہ عنہ نے مجھے تین طلاقیں دے دیں اور وہ موجود نہ تھے۔

---

۱ [بیہقی:۷/۱۳۴]

اسی حدیث میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں حلال ہوئی تو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا کہ مجھے معاویہ رضی اللہ عنہ اور ابوجہم رضی اللہ عنہ نے نکاح کا پیغام بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ابوجہم تو اپنے کاندھے سے لاٹھی ہی نہیں رکھتا اور معاویہ محتاج ہے اس کے پاس کوئی مال نہیں۔ تو اسامہ بن زید سے نکاح کرلے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے اسے ناپسند کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا تو اسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کرلے۔ میں نے اسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کرلیا۔ اللہ نے اس میں بھلائی پیدا کردی اور میں اس سے خوش ہوگئی۔[1] حدیث میں کفاءت معتبر ہونے کی دلیل حدیث بریرہ میں ہے کہ ان کے خاوند غلام تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بریرہ کو آزاد کرنے کے بعد اختیار دیا تو انہوں نے اپنے نفس کو اختیار کرلیا۔ اگر ان کے خاوند آزاد ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں کبھی اختیار نہ دیتے۔ کفو کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہیں اس کی مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ "یا علی ثلث لاتؤخرھا الصلوۃ اذا اتت والجنازۃ اذا خضرت والایم اذا وجدت کفوا."[2] "اے علی تین چیزوں میں دیر نہ کر! نماز کہ جب اس کا وقت آجائے، جنازہ جس وقت حاضر ہوجائے اور نوجوان لڑکی جب تو اس کا کفو پالے (تو اس کی شادی کردے)۔

غیر کفو میں نکاح کرنے والی کا حکم

جب لڑکی غیر کفو میں شادی کرلے تو ولی کو یہ حق ہے کہ وہ تفریق کا دعویٰ کردے۔ اور جب تک قاضی تفریق نہ کرادے احکام نکاح ثابت رہیں گے۔ اور جب قاضی تفریق کرائے گا تو یہ تفریق اصل نکاح کے لئے فسخ ہوگی نہ کہ طلاق کیونکہ طلاق ایسا تصرف ہے جو نکاح میں ہوتا ہے اور فسخ طلاق اس وقت ہوتا ہے جب قاضی زوج کی نیابت میں اسے کرے، جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔

اسی وجہ سے اگر تفریق دخول سے پہلے ہوئی ہے تو عورت کے لئے مہر واجب نہیں ہوگا۔ اگر وہ مدخول بہا ہے تو اس لئے مقررہ مہر ہوگا اور اس پر عدت ہوگی اور اسے عدت کا نفقہ بھی ملے گا۔ کیوں کہ نکاح صحیح میں اس کے ساتھ دخول ہوا ہے۔ جس عورت نے غیر کفو میں شادی کی اور اس کے ولی نے مہر قبول کرلیا، یا اس نے اسے سامان دے دیا، یا ولی نے اس سے اس کے نفقہ کا مطالبہ کردیا تو وہ نکاح پر راضی ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں نکاح کو پکا کرتی ہیں جیسا کہ ولی نے لڑکی کی شادی کی اور اس نے خاوند کو خود پر اختیار دیا۔

جس لڑکی نے غیر کفو میں شادی کی اور اس کا ولی خاموش رہا تو یہ اس کی رضا نہیں ہوگی

---

[1] [مسلم: ۱۹۵/۴]
[2] [بیہقی: ۱۳۳/۷]

اگرچہ مدت لمبی ہو جائے جب تک وہ بچہ نہ جنے۔ کیوں کہ حق متاکد کو سکوت باطل نہیں کرتا ہوسکتا ہے کہ وہ کسی مصلحت کیلئے تاخیر کر رہا ہو۔

جس لڑکی نے غیر کفو میں شادی کی اور اس کے اولیاء میں سے ایک راضی ہو گیا تو اس کے برابر یا اس سے کم درجہ کے ولی کو اب اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ طرفین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے اقرب ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ باقیوں کو اعتراض کا حق حاصل ہے کیوں کہ ولایت ایسا حق ہے جو اولیاء کی جماعت کے لئے ثابت ہے جب ان میں سے کوئی ایک راضی ہو گیا تو اس نے اپنا حق ساقط کر دیا اور باقیوں کا حق باقی رہا۔ طرفین رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے اگر حق تقسیم کرنے کے قابل ہو تو جو راضی ہو فقط اس کا حق ساقط ہو گا جبکہ باقیوں کا حق باقی ہے۔ لیکن یہ حق ایسا ہے جو تقسیم نہیں ہوسکتا۔ یہ حق دفع عار ہے ان دونوں میں سے ہر ایک منفرد کی طرح ہو گا۔ اور اس کا اپنے حق میں اسقاط صحیح ہو گا اور تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے ضرورتاً اس کے غیر کا حق بھی ساقط ہو جائے گا جیسے قصاص میں معاف کرنا۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ لڑکی کا غیر کفو میں شادی کرنا جائز نہیں۔ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی احوط ہے۔ کیونکہ ہر ولی قاضی کے پاس شکایت کرنے کو اچھا نہیں سمجھتا اور نہ ہر قاضی عدل کرتا ہے۔ احوط اس دروازے کو بند کرنا ہے اور یہی صحیح ہے اور مفتی بہ ہے۔

اگر لڑکی نے اپنی شادی کی اور اپنا مہر، مہر مثلی سے کم کر دیا تو اولیاء کے لئے اختیار ہے کہ وہ تفریق کرا دیں الا یہ کہ مہر، مہر مثلی کے برابر ادا کیا جائے۔

مہر

امام حصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ:

"وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ" [النساء:۲۴]

"اور حلال میں تم کو سب عورتیں ان کے سوا بشرطیکہ طلب کرو ان کو اپنے مال کے بدلے۔"

یہ ثابت ہوتا ہے کہ بضعہ کا بدل یا تو مال ہے یا ایسی چیز ہے جو مال کے قائم مقام بن سکے۔ ایسی گھٹیا چیز جو مال کے قائم مقام نہیں بن سکتی وہ مہر بھی نہیں بن سکتی۔

عورتوں پر ملک نکاح کا حصول مال کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ "اَنْ

تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ" میں "با" عوض کیلئے ہے۔

اور عوض اصلی مہر ہے۔ اور عورت کے لئے حق مطالبہ فرض ہے۔ نیز عورت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے نفس کو مرد سے اس وقت تک روکے رکھے جب تک وہ اسے مہر ادا نہ کر دے۔

بضع ایسا عضو ہے جس کا مباح ہونا صرف مال کے ساتھ جائز ہے اور یہ چوری میں ہاتھ کاٹنے کے مشابہ ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دینار اور دس درہم میں ہی ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے[1] اور بعض اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ اور یہی امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور اہل کوفہ کا قول ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب ہاتھ بالاجماع محترم ہے اور اس کا کاٹنا جائز نہیں۔ اور ہاتھ ایسا عضو ہے کہ دس درہم (چرانے) کے بدلے مباح ہوتا ہے۔ اسی طرح بضع دس درہم کے بدلے مباح ہوگی۔

صاحب علاء السنن نے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ "لامهر اقل من عشرة[2] "دس درہم سے کم مہر نہیں ہے۔" آگے لمبی حدیث ہے جس کو علامہ ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے ۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس سند کے ساتھ کم از کم حسن درجہ کی ہے۔ امام نے بھی اس کو حسن قرار دیا ہے جیسا کہ حلبی کی شرح بخاری میں مذکور ہے۔ اگر مہر دس درہم سے کم مقرر کیا گیا تو شرعاً دس درہم واجب ہوں گے۔ اور اگر زوجہ دس درہم سے کم مہر پر نکاح کیلئے راضی ہوگئی تو بھی دس درہم ہی واجب ہونگے۔ کیونکہ اسے شریعت کے مقرر کردہ مہر میں کمی کا اختیار نہیں ہے اگر خاوند دس درہم سے زیادہ مقرر کرے تو اسے اختیار ہے۔

مہر کب واجب ہوتا ہے؟

اگر کسی آدمی نے مہر مقرر کیا ہو تو بیوی کے ساتھ صحبت کرنے یا فوت ہو جانے کی صورت میں اس مہر کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے۔

صحبت کی صورت میں اس لئے کہ یہ مہر صحبت کا بدل ہے۔ اور موت کی صورت میں نکاح کا اختتام ہو جاتا ہے لہٰذا اس کا بدل واجب ہے۔

اگر کسی شخص نے مہر مقرر نہ کیا ہو یا مہر کے نہ ہونے کی شرط لگائی ہو تو صحبت یا موت کی صورت میں مہر مثلی واجب ہوگا۔

---

[1] [عارضۃ الاحوذی:۶/۲۲۶] [2] [اعلاء السنن:۱۱/۸۰]

صحبت سے قبل طلاق دینا

اگر کسی شخص نے صحبت سے قبل اپنی بیوی کو طلاق دی اور اس کا مہر بھی مقرر تھا تو نصف مہر واجب ہوگا۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔

”وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ“ [البقرۃ:۲۳۷]

”اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تھے تم ان کے لئے پس آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے۔“

متعہ (ضروری سامان) کب واجب ہوتا ہے

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو صحبت سے قبل طلاق دے اور مہر بھی مقرر نہ ہو تو پھر مہر ساقط ہو جائے گا لیکن متعہ یعنی کچھ ضروری سامان دینا واجب ہوگا۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔

”لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ“ [البقرہ:۲۳۶]

”کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کیلئے کچھ مہر۔ اور ان کو کچھ خرچ دو، مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق۔“

مقدار متعہ

متعہ مہر مثلی کی نصف مقدار سے زائد نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ نکاح جس میں مہر مقرر ہو اس نکاح سے قوی ہوتا ہے جس میں مہر مقرر نہ ہو۔ لہٰذا جب قوی میں نصف مقدار سے زائد واجب نہیں ہوتا تو ضعیف میں کیسے واجب ہوگا؟ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ہر مطلقہ کیلئے متعہ ہے۔ لیکن وہ مطلقہ جس کیلئے مہر ہے اور صحبت بھی نہیں ہے تو مہر مقرر سے نصف ہوگا۔

کیا عقد نکاح میں مہر مقرر کرنا شرط ہے؟

نکاح بغیر مہر کے نہیں ہوتا ہے اگر مہر کا تذکرہ نہ ہو یا اسکی نفی کی جائے تو بہر حال مہر لازم ہو جاتا ہے۔

مہر کی کچھ رقم دینے سے قبل ہی صحبت کرنا جائز ہے جبکہ وہ عورت راضی ہو اور اس کے ولی بھی راضی ہوں اگر چہ مہر معجّل ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت خیثمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے نکاح کیا وہ شخص تنگدست تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے نرمی کرو یعنی مہر طلب نہ کرو۔ چنانچہ وہ شخص اپنی بیوی کے پاس گیا صحبت کی اور کوئی چیز ادا نہ کی پھر جب تنگدستی ختم ہوگئی تو مہر ادا کیا۔

لیکن مرد کیلئے مستحب یہ ہے کہ صحبت سے قبل عورت کو کوئی چیز ضرور دے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی فاطمہ کو کوئی چیز دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تمہاری حطمی زرہ کہاں گئی؟۔

تھوڑے مہر کا استحباب

تھوڑا مہر مقرر کرنا مستحب ہے چنانچہ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "إن من أعظم النساء بركة ايسر هن صداقاً". "بے شک برکت کے اعتبار سے عظیم عورتیں وہ ہیں جن کا مہر آسان ہو" ایک دوسری روایت میں ہے۔ "أيسرهن مؤنة".

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من يمن المرأة أن يتيسّر خطبتها و أن يتيسر صداقها و أن يتسير رحمها" "کون شخص عورت پر احسان کرتا ہے کہ پیغام نکاح آسان بھیجے، مہر آسان ہو اور رحم بھی آسان ہو۔"

مہرِ مثلی

مہرِ مثلی میں ان عورتوں کے مہر کا اعتبار ہوگا جو کہ اس کے والد کے خاندان سے ہوں گی، مثلاً اس کی بہنیں، پھوپھیاں، چچا کی بیٹیاں وغیرہ ماں اور خالہ کا اعتبار نہ ہوگا البتہ اگر یہ بھی باپ کے خاندان سے ہوں تو پھر ان کا بھی اعتبار ہوگا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے مہر کے بارے میں ان کی عورتوں کے مہر کو دیکھ کر مہرِ مثل مقرر فرمایا تھا جب ان کا شوہر فوت ہوا تھا۔

اپنی عورتیں باپ کے خاندن سے ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ کسی چیز کی قیمت اس کی جنس سے معلوم ہوتی ہے اور اس عورت کی جنس اس کے باپ کی قوم ہے۔ اور اگر یہ عورتیں نہ ہوں تو مہر مثلی

کیلئے اجنبی عورتوں کا انتخاب کریں گے تاکہ مہر میں وسعت مل جائے۔
مہر مثلی میں عورت کی عمر، خوبصورتی، بکارت، شہر، مال کا اعتبار بھی کیا جائے گا اس لئے کہ ان چیزوں کے مختلف ہونے سے مہر بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ اور اگر کچھ بھی موجود نہ ہو تو جو مہر کی مقدار مل جائے ٹھیک ہے۔

کیا مہر مثلی سے زائد ہو سکتا ہے؟

جب کسی عورت کا مہر مقرر نہ ہوا ہو پھر دونوں میاں بیوی مہر مثلی سے زائد رقم پر راضی ہو جائیں تو شوہر کے صحبت کرنے یا فوت ہو جانے کی صورت میں مہر مثلی سے زائد رقم مہر میں شامل ہوگی اور اگر اس نے صحبت سے قبل ہی طلاق دی ہے تو صرف متعہ واجب ہوگا۔ اس لئے کہ فرض وہی ہوتا ہے جو عقد میں طے ہو جب عقد میں کوئی چیز طے نہیں ہوئی ہے تو پھر طرفین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مہر مثلی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جو رقم میاں بیوی میں طے ہے اس کا نصف ہوگا۔

مہر کا قبضہ

اگر خاتون اس مہر کو اپنی ذاتی ملکیت میں رکھتے ہوئے استعمال کرے تو اس کو پورا حق حاصل ہے یہ بھی باقی حقوق کی طرح ہے۔

خلوت صحیحہ کیا ہے؟

ایسا موقع ومقام جس میں صحبت کرنے سے طبعاً وشرعاً کوئی چیز مانع نہ ہو۔ اگر مرد عنین، خصی یا مجبوب ہو تو یہ مانع طبعی ہے جس سے مرد وطی نہیں کر سکتا۔ یا کوئی مرض مرد یا عورت کو لاحق ہو جس سے صحبت نہ ہو سکتی ہو یا پھر مرض کے بڑھنے کا اندیشہ ہو۔
اگر حالت حیض، حالت احرام، صومِ رمضان یا فرض نماز ہو تو یہ مانع شرعی ہے۔ حیض سے طبعی نفرت ہوتی ہے۔ احرام میں صدقہ واجب ہے روزہ میں صحبت کرنے سے قضاء وکفارہ لازم ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب مانع شرعی وطبعی ہوگا تو خلوت صحیحہ نہ ہوگی۔

کسی مکان میں خلوت ہو سکتی ہے؟

ایسا مکان یا کمرہ جس میں کسی کا عمل ودخل نہ ہو اور کوئی ان کے افعال پر مطلع نہ ہو سکے اس مکان میں خلوت صحیحہ ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کو مسجد، راستے یا چھت پر خلوت میسر ہوئی تو ایسی خلوت کو خلوت صحیحہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔

خلوت صیحہ کا حکم

خلوت صیحہ کا وہی حکم ہے جو کہ صحبت اور موت کا ہے۔ اگر کسی شخص نے خلوت صیحہ کے بعد طلاق دی تو کامل مہر واجب ہوگا۔

زرار بن اوفی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ خلفاء راشدین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر کسی شخص نے دروازہ بند کرلیا پردہ لٹکالیا تو مہر اور عدت لازم ہوجاتی ہے۔[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن ثوبان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے عورت کی اوڑھنی اتار کر اس کا چہرہ دیکھ لیا تو مہر واجب ہوجائے اگرچہ صحبت کی ہو یا نہ کی ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منکوحہ عورت کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: اگر کسی شخص نے پردے لٹکا لئے تو مہر واجب ہوجائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان عورتوں کا کیا قصور ہے جبکہ صحبت سے تم عاجز ہوتے ہو حالانکہ انہوں نے تو اپنا نفس تمہارے سپرد کردیا ہے۔[2]

کیا تعلیم قرآن مہر بن سکتی ہے؟

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، اللیث رحمۃ اللہ علیہ اور المزنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تعلیم قرآن مہر نہیں بن سکتی ہے۔ البتہ اگر کسی نے تعلیم قرآن کو مہر بنایا تو نکاح صحیح ہوجائے گا گویا کہ مہر مقرر ہی نہیں ہوا ہے۔

اگر اس نکاح کے بعد صحبت کی تو مہر مثلی واجب ہوجائے گا اور اگر صحبت سے قبل طلاق دی تو متعہ واجب ہوگا۔

مذکورہ مسئلے کے متعلق ایک حدیث کی تشریح

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول "اذهب فقد انكحتكها بما معك من القرآن" کہ جاؤ میں نے تمہارا نکاح اس قرآن کے بدلے کیا جو تمہیں آتا ہے۔ یہ فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔

اس لئے کہ اللہ نے ملک بضعہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بغیر مہر کے حلال کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"خالصة لک من دون المؤمنين." [... ب:۵۰]

---

[1] [بیہقی: ۷/۲۵۵] [2] [بیہقی: ۷/۲۵٦]

''یہ خاص ہے تیرے لئے سوائے سب مسلمانوں کے۔''

لہٰذا یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خاص تھا اور اگر آپ اپنی خاص چیز میں سے کسی کو اجازت دیں تو یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خاص ہوگا۔

شرط کا حکم

اگر کسی شخص نے عورت سے نکاح کیا اور مہر بھی مقرر کیا لیکن یہ شرط لگائی کہ اس کو سفر پر نہ لے جائے گا اگر سفر پر لے گیا تو دگنا مہر ہوگا۔

پس اگر سفر پر نہ لے گیا تو کامل مہر واجب ہوگا اور اگر لے گیا تو مہر مثلی واجب ہوگا۔ اور وہ مہرِ مثلی دوگنا مہر سے زیادہ نہ ہو اور کامل مہر سے کم نہ ہو۔

شوہر کو کہا جائے گا کہ تقوی اختیار کرے اور شرائط کی پابندی کرے اور بے جا حکم نہ لگائے اگر وہ سفر پر جانے پر مجبور کرے تو یہ زیادہ حقدار ہے۔

یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

حضرت عطاء بن أبی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر نکاح میں یہ شرط لگائی گئی کہ اس نکاح کے علاوہ نکاح نہ کرے گا یا اس کو نہیں نکالے گا تو یہ شرط نکاح سے باطل ہو جائے گی۔

ابن السباق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک شخص نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ وہ اپنے گھر سے نہ نکلے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرط کو ختم کر دیا اور فرمایا کہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہے گی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ اور آپ رضی اللہ عنہ یہ بھی فرمایا کہ اللہ نے ان کی شرائط سے قبل ہی شرائط نافذ کی ہیں۔

عبدالرزاق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی کو شرط دی گئی کہ بیوی گھر سے نہ نکلے گی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کو چاہیے کہ شرط پر عمل کرے۔

امام اوزاعی، اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔

لیکن امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی روایت کتاب وسنت کے زیادہ مشابہ ہے۔ [ایضاً] پہلے گروہ کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ہے ''المسلمون عند شروطهم فيما وافق الحق'' ''مسلمان اپنی شرائط پر عمل کریں جبکہ حق بات کے موافق ہوں۔''

اسی طرح ایک اور قول ہے ''المسلمون على شروطهم إلا شرطا أحل حراماً

---

[1] [بیہقی: ۷/۲۴۹]

أو حرّم حلالاً"

''مسلمانوں کو اپنی شرائط پر عمل کرنا چاہئے لیکن جو شرائط حلال کو حرام یا حرام کو حلال کریں ان پر عمل نہ کیا جائے۔''[۱]

نامرد کا حکم

نامرد اس کو کہتے ہیں جو عورت سے صحبت نہ کر سکے۔ یا ثیبہ سے تو کر سکے لیکن باکرہ سے نہ کر سکے یا اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے صحبت کر سکے اور اپنی بیوی سے نہ کر سکے۔

نامردی کے اسباب

مرض کی وجہ سے۔ کمزوری، بڑھاپا یا جادو کے اثر سے نامردی ہوتی ہے۔ اگر کسی عورت کا شوہر نامرد ہو اور عورت اس پر دعویٰ دائر کرے تو قاضی شوہر کو ایک سال کی مہلت دے گا۔ اگر اس نے سال کے اندر اندر صحبت کر لی تو ٹھیک ورنہ قاضی دونوں کے درمیان تفریق کر دے گا اگر عورت جدائی کا تقاضا کرتی ہو کیونکہ صحبت اس کا حق ہے اور حق کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ سال کی مہلت اس لئے دی جاتی ہے کہ سال چار موسموں پر مشتمل ہوتا ہے ممکن ہے کہ ایک موسم میں کمزوری ہے تو دوسرے موسم میں قوت پیدا ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پورا سال کمزوری رہے۔

سال کی مہلت حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نامرد کو ایک سال کی مہلت دینے کا فیصلہ کیا۔

اور یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ مہلت جھگڑے کے دن سے شمار ہوگی۔[۲]

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نامرد کو ایک سال کی مہلت دی اور یہ بھی فرمایا کہ اگر صحبت کر لے تو ٹھیک ورنہ دونوں کے درمیان جدائی ہو جائے گی اور عورت کو کامل مہر دیا جائیگا۔[۳]

امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کتاب الآثار میں اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت ان کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس کا شوہر اس سے صحبت نہیں کر سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ایک سال کی مہلت دی۔ جب سال گزر گیا اور وہ صحبت نہ کر سکا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کو اختیار دیا تو عورت نے جدائی اختیار کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے

۱ ایضاً ۲ [اعلاء السنن: ۱۱/ ۵۴۸] ۳ [کنز العمال ۱۶/ ۵۷۰]

درمیان جدائی ڈال دی اور طلاق بائنہ کا حکم لگایا۔[۱]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نامرد کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی اگر صحبت کر لے تو ٹھیک ورنہ جدائی کر دی جائے گی۔[۲]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نامرد کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی اگر سال میں صحبت کرے تو بہتر ورنہ جدائی ڈال دی جائے گی۔

جب ولی کسی آدمی کو عورت کے بارے میں دھوکہ دے اور عیوب سے پاک ہونے کی ضمانت دے۔ لیکن معاملہ برعکس ہو تو شوہر اس عورت کو طلاق دے سکتا ہے یا معاملہ قاضی کے پاس لے جا سکتا ہے۔ وہ مرد عورت کو کامل مہر دے گا اور اس رقم کا مطالبہ ولی سے کرے گا اگر اس نے عورت سے صحبت کی ہو۔

یہ ہمارے ائمہ کا متفقہ فیصلہ ہے۔

چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو غفار کی ایک عورت سے نکاح کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ اگر کوئی بھی عورت نکاح کرے اور اس کو بیماری لاحق ہو۔ شوہر کو صحبت کرنے کے بعد بیماری کا علم ہو تو شوہر اس کو کامل مہر دے اور ولی سے مہر کی مقدار جرمانہ وصول کرے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ایسی عورت کے بارے میں جس کا ولی دھوکہ دے اور کہے کہ عورت صحیح ہے اور معاملہ برعکس ہو تو شوہر کو طلاق دینے کا اختیار ہے یا معاملہ قاضی کے سپرد کر دے اور وہ تفریق کر دے۔ قاضی کی تفریق طلاق بائنہ شمار ہو گی۔

زوجین میں عیب

اگر مرد کو جنون، جذام یا کوڑھ کا مرض ہو تو عورت کو کسی قسم کا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے یہ امراض ظاہرہ ہیں اور ان پر اطلاع عقد نکاح سے قبل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر یہ عیوب عورت میں ہوں اور ولی نے ان کو چھپایا بھی نہ ہو تو مرد کو اختیار نہیں ہے۔ اور اگر ولی نے عیوب چھپائے ہوں تو جذام، کوڑھ، جنون والی احادیث پر عمل کریں گے۔

مقطوع الذکر، نامرد اور خصی ہونا مرد کے عیب شمار ہوں گے۔ ان عیوب میں عورت کو

---

[۱] ایضاً [۲] [مجمع الزوائد: ۳۰۱/۴]

اختیار ہے نامرد کا حکم پہلے گزر چکا ہے کہ جب عورت جھگڑا کرے اور دعویٰ کرے تو قاضی اس کو ایک سال کی مہلت دے گا۔ اگر سال میں قابل جماع ہو جائے تو بہتر ورنہ عورت کے مطالبے پر تفریق ہو جائے گی اس لئے کہ یہ اس کا حق ہے۔

سال سے مراد قمری سال ہے اس میں ایام حیض، ماہ رمضان، شامل نہ ہوں گے، اسی طرح اگر مرد یا عورت نصف ماہ سے کم بیمار ہو تو یہ ایام بھی شمار نہ ہوں گے اور نصف سے زائد شمار ہوں گے۔ قاضی شوہر کو مہلت عورت کے دعویٰ کے وقت دے گا اگر عورت اپنے شوہر سے راضی ہے تو عورت کا حق ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنا حق ختم کر دیا ہے۔ اگر نامرد قاضی سے مزید ایک سال کی مہلت مانگے تو قاضی عورت کی رضامندی کے بغیر اس کو مہلت نہیں دے سکتا اگر وہ راضی ہو تو دے سکتا ہے۔ لیکن عورت کو سال گزرنے سے قبل رجوع کرنے کا اختیار ہوگا۔

مجبوب وہ ہوتا ہے جس کا آلہ تناسل بالکل کٹا ہوا ہو۔ ایسے آدمی کو قاضی فوراً بیوی سے جدا کر دے گا اس لئے کہ مہلت دینا بالکل بیکار وفضول ہے۔ خصی یہ نامرد کی طرح ہوتا ہے کہ آلہ تناسل منتشر ہوتا ہے اور یہ جماع کر سکتا ہے لیکن حمل نہیں ٹھہر سکتا۔

اگر خصی سال کی مہلت کے بعد جماع کا دعویٰ کرے اور عورت انکار کرے تو مہلت سے پہلے والا حکم ہی نافذ ہوگا۔ اگر عورتیں مشاہدہ سے خبر دیں کہ باکرہ ہے تو عورت کا قول معتبر ہے۔ اور اگر ثیبہ ہو تو مرد کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا اور عورت کا حق باطل ہو جائے گا۔

اگر شوہر نے ایک مرتبہ صحبت کی پھر وہ نامرد یا مقطوع الذکر ہو گیا تو عورت کو کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا۔

متعدد بیویوں میں شب گزاری میں عدل

اگر کسی شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہو تو شب گزاری میں عدل کرنا چاہئے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"إذا كان عند الرجل امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقه ساقط"[1]

"اگر کسی کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان انصاف نہ کرے تو قیامت کے دن ایک جانب کو جھکا ہوا آئے گا۔"

---

[1] [عارضۃ الاحوذی: ۴/۸۰]

باکرہ، ثیبہ، نئی، پرانی سب برابر ہیں۔ صحبت اور محبت میں انصاف و برابری ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ صحبت دل کی فرحت سے ہوتی ہے اور محبت خالص دل کا معاملہ ہے۔

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج میں برابری کرتے ہوئے فرماتے تھے "اللهم هذه قسمتي فيما أملك فلا تلمني فيما تملك و لا أملك." "اے اللہ یہ وہ تقسیم ہے جس کا میں مختار ہوں۔ لہٰذا جس کا تو مالک و مختار ہے اور میں نہیں ہوں اس میں میری گرفت نہ کرنا۔" یعنی بعض سے محبت کی زیادتی میں۔ مرد کو کامل اختیار حاصل ہے کہ ایک رات، دو راتیں یا جیسے چاہے باری مقرر کرلے۔

اگر ایک عورت اپنا حصہ دوسری کو ہبہ کردے تو جائز ہے لیکن اس کو رجوع کا حق بھی حاصل ہے۔ اسلئے کہ حق کو رضامندی سے چھوڑا بھی جاسکتا ہے اور واپس بھی لیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو الگ کرنے کا ارادہ کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میری باری سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دے دیں لیکن مجھے الگ نہ کریں۔ میں قیامت میں آپ کی بیوی بن کر محشر میں جانا چاہتی ہوں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔

حالت مرض میں بھی تقسیم ضروری ہے۔ سفر میں کسی کو بھی ساتھ لے جاسکتا ہے لیکن قرعہ اندازی بہتر ہے اس لئے کہ سفر کا حق ان کو نہیں ہے اور قرعہ اندازی اطمینان قلب کیلئے ہے۔

باندی کیلئے آزاد عورت کا نصف ہے کیونکہ غلامی کمی کا باعث ہوتی ہے۔

حضرت سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر آزاد اور باندی ایک شخص کے ہاں ہوں تو سنت یہ ہے کہ آزاد کو دو دن اور باندی کو ایک دن دے۔[1]

حالت رضاعت میں صحبت

عرب میں یہ بات مشہور تھی کہ حالت رضاعت میں جماع بچے کو نقصان دیتا ہے اور دودھ خراب ہوجاتا ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

حضرت اسما بنت یزید بن السکن رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے سنا "لاتقتلوا اولا كم سراً. فوالذي نفسي بيده إن الغيل ليدرك الفارس على ظهره حتى يصرعه."[2]

لیکن حضرت جدامۃ بنت وھب رضی اللہ عنہ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] [اعلاء السنن: ۱۱/ ۱۱۷]   [2] [ابن ماجہ: ۱/ ۶۴۸]

"لقد هممت أن أنهى عن الغيلة. حتى ذكرت أن الروم والفارس يصنعون ذلك فلا يضرأ ولادهم"[۱]

"میں نے ارادہ کیا کہ تم کو صحبت فی الرضاعت سے منع کروں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اہل روم اور فارس ایسا کرتے ہیں اوران کی اولاد کو نقصان نہیں ہوتا ہے۔"

اس حدیث میں حالت رضاعت میں صحبت کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

اب یہاں مختلف روایات جمع ہوگئیں۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو حالت حمل میں دودھ پلانے سے منع فرمایا۔

(۲) مردوں کو حالت رضاعت میں صحبت سے منع فرمایا تاکہ حمل قرار پاکر رضاعت کا نقصان نہ ہوجائے۔

(۳) حالت رضاعت میں صحبت کا جواز دیا۔

(۴) حالت حمل میں رضاعت کا جواز دیا۔

لہٰذا ان روایات سے معلوم ہوا کہ نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے۔

نفی والی روایات جاہلیت کے عقیدہ کا ابطال ہیں۔اور پہلی حدیث میں اثبات ہے تاکہ معلوم ہو کہ مؤثر حقیقی اللہ کی ذات ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ حالت رضاعت میں صحبت بچے کو نقصان دیتی ہے اور منی حمل کو نقصان دیتی ہے لیکن یہ کثرت پر منحصر ہے اگر قلیل عمل ہو تو پھر نقصان دہ نہیں ہے۔

عورت سے لواطت کرنا

عورت سے جماع کرنا جائز ہے۔چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"فأتوهن من حيث امركم الله" [البقرة:۲۲۲]

"تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے"

اس آیت میں "من"، "فی" کے معنی میں ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"نساؤكم حرث لكم فاتوا حرثكم انّٰى شئتم" [البقرة:۲۲۳]

---

۱ [مسلم:۴/۱۶۱]

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔''

اس آیت میں عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے اور کھیتی کی جگہ زمین ہے۔

لہٰذا عورت کی شرمگاہ زمین کی طرح ہے اور نطفہ بیج کی طرح ہے، بچہ پیداوار کی مانند ہے۔ لہٰذا جماع شرمگاہ میں ہی ہوسکتا ہے خواہ کوئی بھی شکل اختیار کرے۔

مقام پاخانہ کھیتی کی جگہ نہیں ہے لہٰذا وہ مقام صحبت بھی نہیں ہے۔ مقام پاخانہ دائمی نجاست کا مقام ہے۔ جب اللہ نے عارضی نجاست یعنی حالت حیض میں صحبت سے منع کیا ہے تو دائمی نجاست میں بدرجہ اولیٰ صحبت حرام ہوگی۔

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ان اللہ لایستحی من الحق، لاتأتو النساء فی أدبارھن''[1]

''اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے شرم نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ حکم ہے کہ عورتوں کے مقام پاخانہ میں وطی نہ کرو۔''

حضرت ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عورتوں سے لواطت کرنا حرام ہے۔[2]

حضرت جابر بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہود کا قول تھا کہ اگر کسی نے پچھلی جانب سے شرمگاہ میں صحبت کی اور حمل ٹھہر گیا تو بچہ اُمول ہوگا۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔

''نساؤ کم حرث لکم فاتوا حرثکم أنی شئتم'' [البقرۃ:۲۲۳]

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔''

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو اپنی عورت سے لواطت کرے وہ ملعون ہے۔[3] یہ حدیث مرسل ہے۔

مشت زنی کا حکم

مشت زنی بالکل جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بیوی کے بغیر استمتاع ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ○'' [المؤمنون:۵،۶]

''اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر، یا اپنے ہاتھ کے

---

[1] [مسند امام احمد:۱/۸۶]　[2] [الاٰثار:۱۱۷۵]　[3] [اعلاء السنن:۱۱/۲۷۷]

مال باندیوں پر، سوان پر نہیں کچھ الزام۔"

اس آیت سے بیوی و باندی کے ماسوا سے استمتاع اور قضاء شہوت کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔ البتہ اگر زنا یا لواطت کا خوف ہو تو جائز ہے۔

مشت زنی اخلاق حسنہ کا نمونہ نہیں ہے۔ یہ انسانی جسم کیلئے انتہائی مضر ہے۔ جو آدمی حد سے زیادہ مشت زنی کرتا ہے وہ عورت سے صحبت نہیں کرسکتا۔

اگر وہ دوا بھی لے تو جوان آدمی کی طرح صحبت پر قادر نہ ہوگا بلکہ نامرد کی طرح ہوگا۔

فاحفظ منیک أن یصب فانه : ماء الحیاة یراق فی الأرحام

"اپنی منی کی حفاظت کرو کیونکہ یہ زندگی کا پانی ہے جو کہ رحم میں ڈالا جاتا ہے۔"

مشت زنی کے بارے میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہے۔ لیکن عموم آیت اشارہ کرتا ہے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے۔ اگرچہ سلف کا اس میں عندالضرورۃ اختلاف رہا ہے لیکن کراہت والا قول ہی صحیح ہے۔

عورتوں کی ہم جنس پرستی

عورتوں کا عورت سے صحبت کرنا بالاتفاق حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ" [المومنون:۶۰۵]

"اور جو اپنی شہوت کو تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر"

عورت اپنے غلام سے صحبت نہیں کرسکتی ہے اس لئے کہ وہ غلام محرم ہے۔

جب عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد یا عورت کے سامنے اپنا وجود پیش کرے گی تو یہ حفاظت فروج نہ ہوگی، بلکہ یہ عورت حد سے تجاوز کرنے والی شمار ہوگی۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ولا یباشر الرجل بالرجل ولا المرأة بالمرأة"[1]

"مرد مرد سے صحبت نہ کرے اور نہ ہی عورت کسی عورت سے صحبت کرے۔"

عورت کا اپنی شرمگاہ میں انگلی یا کسی چیز کو شہوت حاصل کرنے کیلئے داخل کرنا مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ مشت زنی۔

---

[1] [مسند احمد بشرح البناء:۱۶/۷۸]

عورت سے عدت میں نکاح کرنا

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے کسی عورت سے طلاق بائنہ کی عدت میں نکاح کرلیا اور صحبت بھی کرلی تو ان کے درمیان تفریق کردی جائے گی۔ پس اگر اس کو حمل ٹھہر گیا اور اس نے طلاق بائنہ کے دو سال کے عرصے میں بچہ پیدا کردیا یا نکاح ثانی کے بعد چھ ماہ کے اندر اندر بچہ پیدا کردیا تو یہ بچہ پہلے شوہر کا شمار ہوگا، اس لئے کہ دوسرے کا نکاح فاسد ہے۔

اگر دو سال کی مدت کے بعد بچے کی ولادت ہو یا دوسرے نکاح کے نصف سال بعد ولادت ہوئی تو بچہ دوسرے شوہر کا شمار ہوگا۔

اگر طلاق بائن کی مدت کے دو سال بعد بچہ پیدا ہوا تو پہلے شوہر کا نہ ہوگا۔ اگر نکاح ثانی کے بعد چھ ماہ سے کم عرصہ میں پیدا ہوا تو دوسرے شوہر کا نہ ہوگا اگر دوسرے شوہر سے جدائی ہو جائے اور دو سال کے بعد بچہ پیدا ہو تو یہ بچہ کسی بھی شوہر کا شمار نہ ہوگا۔ اس لئے کہ حمل کی اقل مدت چھ ماہ اور اکثر مدت دو سال ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایسی عورت لائی گئی جس نے چھ ماہ میں بچہ جن دیا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سنگسار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ خبر حضرت علی کو ملی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کو سنگسار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے مسئلہ دریافت فرمایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ قرآن میں مدت رضاعت دو سال کامل ہے۔ اور ایک جگہ مدت رضاعت اور مدت حمل تیس مہینے بیان ہے۔ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے اور مدت رضاعت دو سال کامل ہے۔ لہٰذا اس عورت پر حد جاری نہیں ہوسکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو چھوڑ دیا۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ عورت کا حمل دو سال سے زائد نہیں ہوسکتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر مرد عورت سے عدت میں نکاح کرے تو ان کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی اور عورت کو صحبت کے بدلے میں کامل مہر ملے گا اور وہ پہلے شوہر کی عدت مکمل کرنے کے بعد دوسرے کی عدت مکمل کرے گی۔ پھر دوسرا شوہر چاہے تو اس سے نکاح کرسکتا ہے۔[2]

---

[1] [بیہقی: ۷/۴۴۲] [2] [اعلاء السنن: ۷/۱۳۳]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی عورت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس سے نکاح بھی حرام ہے اور مہر بھی حرام ہے۔ اور مہر کو بیت المال میں جمع کیا جائیگا اور کبھی یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرلیا اور مہر دینے کے ساتھ ساتھ نکاح کرنے کی اجازت بھی دی۔

گم شدہ کی بیوی کا حکم

اگر گمشدہ شوہر واپس آجائے اور اس کی بیوی کسی اور سے نکاح کر چکی ہو تو شوہر کو اختیار ہے چاہے طلاق دے یا اپنے پاس رکھ لے۔ عورت کو کوئی اختیار نہ ہوگا اور عورت کو مہر ملے گا اور نکاح ثانی باطل ہو جائے گا۔

زوجین میں سے کسی کا قبول اسلام

عورت کا اسلام قبول کرلینا مرد سے پہلے، پہلے نکاح کو فاسد کر دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا ارشاد عام ہے۔

''لَاهُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَاهُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ.'' [الممتحنۃ:۱۰]۔

''نہ یہ عورتیں حلال ہیں ان کافروں کو اور نہ وہ کافر (حلال) ہیں ان عورتوں کو''۔

لیکن شوہر کو اسلام پیش کیا جائے گا اگر وہ اسلام قبول کرے تو نکاح باقی رہے گا۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی جبکہ وہ مسلمانوں کے ملک میں ہوں۔

اگر عورت اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے ملک میں آگئی تو ملک الگ ہونے کی وجہ سے طلاق بائنہ ہو جائے گی۔[۱]

زوجین میں سے اگر کوئی مسلمان ہو جائے تو بچے کا حکم

بچہ والدین میں سے بہتر دین والے کا اتباع کریگا۔

حضرت سلمہ انصاری رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے لیکن بیوی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا ان کا ایک چھوٹا بچہ تھا۔ اس کے فیصلہ کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف شوہر کو اور دوسری طرف بیوی کو بٹھایا پھر بچے کو اختیار دیا کہ جاؤ اور دعا فرمائی ''اللّٰھم اھدہ''. ''اے اللہ اس کو ہدایت دے'' وہ اپنے باپ کی طرف چلا گیا۔[۲]

---

۱ [شرح البخاری للعینی: ۲۷۲/۲۰] ۲ [نسائی: ۱۸۵/۶]

اس واقعہ میں اختیار دینا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت ہے اس لئے کہ بچہ ہمیشہ صحیح طرف نہیں جاسکتا ہے صحیح راہ کی راہنمائی تو اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا سے وہ بچہ صحیح راہ پر چلا۔

شادی کیلئے عورت کو دیکھنا

حضرت ابو ہریرۃ سے مروی ہے کہ نبی کریم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں انصاری کی عورت سے نکاح کرنے لگا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: "أنظرت إليها." "کیا تو نے اس کو دیکھا ہے؟" اس نے کہا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "فاذهب أنظر اليها." "جاؤ اس کو دیکھ لو۔"[1]

حضرت محمد بن سلمہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجا اور پھر اس کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا حتیٰ کہ میں نے اس کو کھجوروں کے باغ میں دیکھ لیا۔ لوگوں نے مجھ سے کہا تم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہو کر کیا کام کرتے ہو۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد سنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"اذا ألقى اللّٰه في قلب امرئٍ خطبة امرأة فلا بأس أن ينظر اليها."

"جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے دل میں کسی عورت کے بارے میں نکاح کی خواہش ڈال دے تو اس عورت کو دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"[2]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اذا خطب أحد كم المرأة، فان استطاع أن ينظر إلى مايدعوه الى نكاحها فليفعل"

"جب کوئی شخص کسی عورت کو پیغام نکاح بھیجے تو اگر اس عورت کو دیکھنے کی قدرت ہو تو اس کو دیکھ لے۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجا اور اس کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا حتیٰ کہ اسے دیکھا تو مجھے اس کے ساتھ شادی میں رغبت ہوئی اور میں نے اس سے نکاح کرلیا۔[3]

---

[1] [ابن ماجہ: ۱/۵۹۹] [2] [ابن ماجہ ۱...... ۵۹۹] [3] [معالم السنن: ۷/۱۹۶]

علامہ بستی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صرف عورت کا چہرہ اور ہتھیلی دیکھنا جائز ہے۔
اس کو گھور گھور کر دیکھنا یا اس کے ستر پر مطلع ہونا جائز نہیں ہے۔ چاہے عورت اجازت دے یا نہ دے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔
ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کے ہاں صرف منہ اور ہتھیلی کا دیکھنا جائز ہے۔

ولیمے کا استحباب

ولیمہ: شب عروسی کے بعد یا عورت کے مالک بننے کے بعد جو کھانا کھلایا جاتا ہے اسے ولیمہ کہتے ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ صرف شب عروسی کے بعد کا کھانا ولیمہ کہلاتا ہے۔ ولیمے میں شرکت کرنا حنفیہ کے ہاں ضروری ہے جبکہ وہاں منکرات نہ ہوں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جب دعوت ولیمہ میں تصاویر دیکھیں تو واپس آ گئے۔

ولیمہ سنت ہے واجب نہیں ہے۔ جو روایات اس بارے ہیں میں وہ سب استحباب پر محمول ہیں۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایسا ولیمہ جس میں صاحب ثروت حضرات مدعو ہوں اور غرباء کو نظر انداز کر دیا جائے، بدترین کھانا ہے۔ اور جو شخص دعوت ولیمہ کو ٹھکرائے اس نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی۔[1]

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دعوت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں دین کو نقصان نہ پہنچے۔ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دعوت قبول کرنا سنت ہے اور جہاں بدعت ہو وہاں سنت کو ترک کرنا جائز ہے۔ بلکہ اگر وہ منع کرنے پر قادر ہو مثلاً صاحب منصب، صاحب مرتبہ یا مقتدیٰ ہو تو اس کو منع کرنا چاہئے۔ اگر مجلس میں حاضر ہونے سے پہلے ہی خرافات کا علم ہو تو حاضر نہ ہو۔ اس لئے کہ دعوت کا قبول کرنا وہاں سنت ہے جہاں سنت کی پاسداری ہو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"إذا دعی احد کم ألی الولیمة فلیأتها"[2] "جب تم ولیمہ کی دعوت دی جائے تو دعوت قبول کرو اور ولیمہ میں شرکت کرو۔"

ولیمہ کبھی بکری کے گوشت سے ہوتا ہے اور کبھی کسی اور چیز سے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔
"أولم ولو بشاة"[3] "ولیمہ کرو اگرچہ بکری ہی کیوں نہ ہو۔"

ولیمہ صحبت کے بعد ہوتا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن عوف رضی اللہ عنہ کو نکاح

---

[1] [شرح البخاری للعینی: ۲۰/۱۲۰] [2] [شرح البخاری للعینی: ۲۰/۱۵۸] [3] [بیہقی: ۷/۱۵۵]

کے اثرات دیکھنے کے بعد ولیمے کا حکم دیا تھا۔

زنا کے بعد شادی

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے زنا کرنے کے بعد نکاح کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور عورت پر کوئی عدت بھی نہیں ہے اور مرد کیلئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ استبراء رحم تک نکاح (یا جماع) سے رکا رہے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ ایک آدمی نے عورت سے نکاح کیا۔ مرد کا ایک لڑکا اور عورت کی لڑکی تھی۔ چنانچہ اس لڑکے نے لڑکی سے زنا کا ارتکاب کرلیا اور لڑکی کو حمل ہوگیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکہ تشریف لائے تو معاملہ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے اعتراف گناہ کرلیا۔ حضرت عمر نے ان کو کوڑے لگوائے اور چاہا کہ ان کا نکاح کردیں لیکن لڑکے نے انکار کردیا۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرد اور عورت زنا کے جرم میں پیش کیے گئے جب انہوں نے اعتراف گناہ کیا تو آپ نے ان کو کوڑے لگوائے پھر دونوں کا نکاح کردیا۔[2]

دو آدمیوں کا دعویٰ نکاح ایک عورت سے

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر دو آدمی ایک عورت سے نکاح کا دعویٰ کریں اور دونوں کے پاس گواہ بھی ہوں اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کس کا نکاح پہلے ہوا ہے تو عورت سے پوچھا جائے گا۔ جس کے بارے میں وہ اقرار کرے اس کو شوہر قرار دیا جائے گا اور اگر دونوں کا انکار کردے تو کسی کے ساتھ بھی نکاح نہ ہوگا۔

عزل کا حکم

مادہ منویہ کو رحم سے باہر گرانا عزل کہلاتا ہے تاکہ عورت کو حمل نہ ہو۔ عزل نہ کرنا ہی بہتر ہے اس لئے کہ بچہ ہونا یا نہ ہونا خدا کی قدرت سے ہے عزل سے نہیں ہے۔ عزل مکروہ ہے اسی طرح مانع حمل گولیاں بھی مکروہ ہیں۔

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عزل کے بارے میں گفتگو کررہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا علیکم ألاّ تفعلوا ذاکم، فانما هو القدر[3]

''تم عزل مت کرو کیونکہ یہ تقدیر ہے''

---

[1] ایضاً [2] [شرح البخاری للعینی: ۱۵۸/۲۰] [3] [مسلم: ۱۵۸/۴]

ایک دوسری حدیث میں فرمایا۔

لا عليكم ألاتفعلوا، ما كتب الله خلق نسمة هي كائنة إلى يوم القيامة إلاستكون[1]

''عزل مت کرو کیونکہ جس نفس کو خدا نے پیدا کرنا ہے وہ ضرور پیدا ہوگا''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ''لا عليكم'' نہی کے زیادہ قریب ہے اس کا مطلب ہے عزل مت کرو۔ یا پھر حدیث کا معنی یہ ہے کہ عزل نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے اس لئے کہ جب جان کو خدا نے پیدا کرنا ہے وہ پیدا ہوگی چاہے تم عزل کرو یا نہ کرو۔ لہٰذا تمہارے عزل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

جو مرد طبیب یا طبیبہ کے سامنے اپنی عورت کی شرمگاہ کھول دیتے ہیں تا کہ شرمگاہ میں کوئی چیز رکھ دے جس سے حمل نہ ٹھہرے یہ حرام ہے۔ کیونکہ یہ کشف عورت بلاضرورت ہے۔

اگر اس کو حمل ہو اور ولادت بغیر آپریشن کے نہ ہو اور طبیب حاذق مسلم اس کو کہے کہ حمل نہ ٹھہراؤ تو یہ منع حمل کا عمل کرسکتی ہے۔

اس لئے کہ ضرورت ناجائز امور کو مباح کردیتی ہیں۔

خاوند کے راز بتانے کا حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ان من اعظم الامانة عند الله يوم القيامة الرجل يفضي الى امرأته و تفضي إليه ثم ينشر سرها[2]

''بیشک قیامت کے دن سب سے بڑی خیانت یہ ہوگی کہ انسان اپنی بیوی سے اپنی حاجت پوری کرے اور پھر اس کے رازوں کو بیان کرتا پھرے۔''

پس مرد وعورت دونوں کیلئے ایک دوسرے کا قول وفعل اور عیب بیان کرنا حرام ہے۔ نیز ان محاسن کا ذکر بھی جائز نہیں جنہیں شرعاً وعرفاً مستور ہونا چاہئے۔

خاوند کے بستر پر جانے سے انکار حرام ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: اذا باتت المرأة هاجرة فراش زوجها لعنتها الملائكة حتى تصبح[3] ''جب کوئی بیوی اپنے شوہر کے بستر کو چھوڑ کر رات گزارتی ہے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔'' کیونکہ عورت کو خاوند کی اطاعت کا مامور بنایا گیا ہے۔

[1] ایضاً [2] [مسلم ۴/۱۵۷] [3] [مسلم: ۴/۱۵۷]

عورت حیض کے سبب بھی خاوند سے دور نہیں رہ سکتی کیونکہ خاوند حالت حیض میں بھی مافوق الازار فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ حدیث مذکور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ خاوند کی ناراضگی خداتعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ جب قضائے شہوت کے بارہ میں یہ حکم ہے تو امر دین کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟ تاہم اگر عورت خاوند کے بستر پر لوٹ آئے تو اس کا گناہ ختم ہو جائے گا۔

کتاب الطلاق

علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ ''المغنی'' میں فرماتے ہیں کہ طلاق نکاح کی قید کھولنے کو کہتے ہیں اور اس کی مشروعیت کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

کتاب اللہ سے اس کی مشروعیت اس آیت سے ثابت ہوتی ہے۔

''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ.'' [البقرۃ:۲۲۹]

''طلاق دوبار ہے، پھر یا تو روک لیا جائے اچھے طریقے سے یا رخصت کر دیا جائے بھلے طریقے سے۔''

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ [الطلاق:۱]

''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب طلاق دو تم عورتوں کو تو طلاق دو تم انہیں اس طرح کہ وہ عدت شروع کر سکیں۔''

اور سنت سے اس کی مشروعیت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حالت حیض میں طلاق دینے کا حکم پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس سے کہو کہ وہ اس عورت سے رجوع کرے اور اس کو اپنے پاس روکے رکھے۔ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے پھر اسے حیض آئے اور پھر وہ پاک ہو جائے پھر چاہے تو اس کے بعد اسے اپنے پاس روکے رکھے اور چاہے تو چھونے سے پہلے اسے طلاق دے دے، یہ وہ تعداد ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا۔[1]

اور اجماع امت سے بھی اس کی مشروعیت ثابت ہے۔ اور حالات واحوال میں غور وفکر بھی اس کے جواز پر دلالت کرتا ہے کیونکہ میاں بیوی کے معاملات بگڑ جاتے ہیں اور اس وقت نکاح کو باقی رکھنا صرف اور صرف لڑائی جھگڑے کو باقی رکھنا ہوتا ہے۔ خاوند پر بیوی کا خرچہ اور

[1] [بخاری مع عینی: ۲۰/۲۲۶]

رہائش کا لازم کرنا اسے صرف نقصان پہنچانا ہے اور عورت کو بری صحبت میں روکنا ہے جو ہمیشہ کی دشمنی کا موجب ہے۔

بغیر ضرورت طلاق دینے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بغیر ضرورت طلاق دینا حرام ہے کیونکہ یہ خاوند کا خود کو اور اپنی بیوی کو نقصان پہنچانا اور مصلحت اور فائدے کو جوان دونوں کو حاصل تھا بلا ضرورت ختم کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے بھی حرام ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "لا ضرر ولا ضرار" "نہ کسی سے نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ" اور دوسرا قول یہ ہے کہ بغیر ضرورت طلاق دینا مباح ہے لیکن مکروہ ہے۔ اور وہ اپنے قول کی دلیل میں نبی کریم ﷺ کا فرمان پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰهِ الطَّلَاقُ [1] "اللہ کے ہاں حلال کاموں میں سب سے ناپسندیدہ طلاق ہے" اور یہ ناپسندیدہ اسی وقت ہوگا جب اس کو بے موقع اور بلا ضرورت کیا جائے۔ نیز نبی کریم ﷺ نے اس کا نام حلال رکھا ہے۔ نیز طلاق اس لئے بھی مکروہ ہے کہ اس سے وہ مصالح ختم ہو جاتے ہیں جن کا حصول مستحب ہے۔

اور ضرورت کے وقت طلاق مباح غیر مکروہ ہے۔ عورت جب اللہ تعالیٰ کے حقوق واجب نماز وغیرہ میں کوتاہی کرے یا پاکدامن نہ ہو یا شوہر کی مخالفت کرے یا خلع کا مطالبہ کرے تو اس وقت طلاق دینا مندوب ہے۔

حالت حیض میں اور ایسے طہر میں جس میں بیوی سے جماع کر چکا ہو طلاق دینا ممنوع ہے۔ اس حالت میں دی گئی طلاق کا نام طلاق بدعت ہے۔ نیز ہر جگہ کے علماء کا ہر زمانے میں اس کے حرام ہونے پر اجماع رہا ہے۔ طلاق کی تین اقسام ہیں۔ (۱) حسن (۲) احسن (۳) بدعی، بدعی جیسا کہ ابھی گزرا وہ طلاق ہے جو حالت حیض میں دی جائے اور یہ کہ بیوی کو ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں یا دو طلاقیں دے۔ یا اس طہر میں طلاق دے جس میں رجوع نہ کیا گیا ہو۔ تاہم غیر مدخول بہا کو حالت حیض میں طلاق دینا طلاق بدعی نہیں ہے۔

طلاق مسنون

احناف کے نزدیک طلاق سنت حسن اور احسن ہیں۔ اول (یعنی طلاق حسن) کے سنت ہونے کی دلیل امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جو وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور وہ حماد رحمۃ اللہ علیہ سے اور وہ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: طلاق سنت یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو جب وہ حیض سے پاک ہو جائے بغیر جماع کئے ایک

[1] [معالم السنن: ۲۲۱/۴]

طلاق دے دے۔ اور اسے عدت گزرنے تک رجوع کا اختیار ہوگا۔ اور جب عدت گزر جائے تو وہ نکاح کا پیغام دے سکتا ہے۔ اور اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو جب وہ اپنے دوسرے حیض سے پاک ہو جائے تو اسے طلاق دے دے۔ اور پھر جب وہ تیسرے حیض سے پاک ہو جائے تو اسے تیسری طلاق دے اور یہی حکم تین طلاقوں کو ایک طہر میں جمع کرنے کا ہے۔

دوسری یعنی طلاق احسن کی طلاق سنت ہونے کی دلیل وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔

طلاق سنت وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے موافق ہے۔ وہ ایسے طہر میں طلاق دینا ہے جس میں جماع نہ کیا ہو۔ پھر عورت کو اس کی عدت گزرنے تک چھوڑ دے۔ اس کی عدت گزرنے تک چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عدت ہونے سے پہلے اسے اور طلاق نہ دے۔ اور اگر شوہر نے حاملہ بیوی کو طلاق دی تو یہ بھی طلاق سنت ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ دونوں طلاقوں کے درمیان ایک مہینے کا وقفہ رکھا جائے گا یہاں تک کہ تینوں طلاقیں پوری ہو جائیں۔

اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حاملہ عورت پر ایک ہی طلاق واقع ہوگی اور خاوند اس کو وضع حمل تک چھوڑے رکھے، پھر اس کے اوپر ساری طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

حائضہ کو طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے

اگر حائضہ عورت کو طلاق دی جائے تو اس طلاق کو طلاق شمار کیا جائے گا۔ اس پر تابعین اور ائمہ فنون کا اجماع ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حالت حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یُرَاجِعُهَا وہ اس سے رجوع کر لے۔ میں نے کہا کہ وہ طلاق شمار ہوگی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا چھوڑو۔[1] اور بعض نے اس کے علاوہ اور الفاظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ کیا تو عاجز ہو گیا تھا یا بے وقوف ہو گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول "ضمہ" چھوڑو! اس بات کا احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے یہ بات ڈانٹنے کے لئے کہی ہو یعنی اس طلاق کے وقوع میں کوئی شک نہیں اور یہ یقینی طور پر واقع ہوگئی ہے۔ حالت حیض میں بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور اگر حالت حیض میں طلاق نہ ہوتی ہو تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراجعت کے حکم کا کوئی معنی نہیں رہتا۔

مسلم کی روایت میں حضرت انس بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت

1. [بخاری مع عینی: ۲۰/۲۲۷]

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس عورت کے متعلق جسے انہوں نے طلاق دی تھی پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے اس کو حالت حیض میں طلاق دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "مره فليرا جعها فليطلقها لطهرها". "اس سے کہو کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرلے اور جب وہ پاک ہو جائے تو اسے پاکی کی حالت میں طلاق دے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں نے اس سے رجوع کرلیا اور پھر اسے حالت طہر میں طلاق دی۔ حضرت انس بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: میں نے کہا حالت حیض میں جو طلاق آپ نے دی تھی اسے بھی شمار کیا؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اسے کس وجہ سے شمار نہ کرتا؟ کیا میں بے وقوف تھا![1]

اور نافع رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ ان سے عبیداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس ایک طلاق کا کیا بنا؟ انہوں نے کہا کہ اسے ایک طلاق ہی شمار کیا جائے گا۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ روایت کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے تو اس حیض کو عدت میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس پر طلاق یقیناً واقع ہو جائے گی لیکن اس حیض کو عدات میں شمار نہیں کیا جائے گا۔

اکٹھی تین طلاق دینے کا حکم

جس آدمی نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے حق میں بائنہ ہو جائے گی لیکن ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ کیونکہ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایسے آدمی کے متعلق سوال کیا جاتا تھا جو اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دیتا، تو آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ تم ایک یا دو طلاقیں نہیں دے سکتے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرلیں یہاں تک کہ اسے دوسرا حیض آئے اور پھر وہ پاک ہو جائے اور پھر اس کو چھونے سے پہلے اسے طلاق دے دے مگر تو نے اسے تین طلاقیں دے دی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو تجھے عورت کو طلاق دینے کے بارے میں اختیار دیا تھا اس کی نافرمانی کی۔ لیکن وہ تجھ سے بائنہ ہوگئی ہے۔[2]

اور یہی مذہب جمہور علمائے تابعین اور ان اخلاف کا ہے۔ ان میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ، امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ، امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ، احناف، مالکی، شوافع، حنابلہ اور دوسرے بہت سے حضرات شامل ہیں۔

فقہاء حضرات فرماتے ہیں کہ اس کی مخالفت شاذ ہے اور اہل سنت کے خلاف ہے۔

مخالفین نے اس روایت سے دلیل پکڑی ہے جو طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

[1] [مسلم:۱۸۲/۴] [2] [مسلم:۱۸۰/۴]

روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے دو سالوں میں تین طلاقیں اور ایک طلاق تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ ایسے معاملے میں جلدی کرنے لگے ہیں جس میں انہیں دیر کرنی چاہئے، کیوں نہ ہم اس کو ایسے نافذ کر دیں؟ چنانچہ وہ ان پر نافذ کر دی گئی۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کا جواب دیا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کے ذریعے ان لوگوں کو مخاطب کیا کہ ان باتوں کو جانتے تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پیش آمدہ باتوں سے باخبر تھے اور اس سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور یہ ماقبل کے حکم کے منسوخ ہونے پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب پینے والے کے بارے میں کہا کہ شراب کی حد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چالیس کوڑے تھی۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بار بار شراب پینے اور اس کی سزا کو ہلکا سمجھتے دیکھا تو فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ ہم اس کو جھوٹ بولنے والے کی حد تک پہنچا دیں کیونکہ جب وہ شراب پیئے گا تو غیر معقول باتیں کرے گا اور جب غیر معقول باتیں کرے گا تو جھوٹ بولے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے سامنے ارشاد فرمائی۔ اور طلاق کے معاملے کی طرح کسی نے اس بات کی مخالفت نہیں کی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کا یہ معنی ہو کہ تین طلاقیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ایک شمار کی جاتی تھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو معلوم تھا کہ یہ بات پہلے تھی پھر منسوخ ہو گئی تھی کیونکہ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کردہ حدیث کے خلاف عمل کریں۔[1]

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب کہا گیا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مسلم شریف کی روایت میں حضرت ابوالصہباد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے (دور کے) ابتدائی تین سالوں میں تین طلاقوں کو ایک سمجھا جاتا تھا؟ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہاں! پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آپ اس حدیث کو کیسے رد کر دیتے ہیں؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ان روایات کی وجہ سے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے اس کے خلاف مروی ہیں۔[2]

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی احادیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہیں جو ان

---

[1] [بیہقی: ۳۳۸/۷]　[2] [اعلاء السنن: ۱۷۳/۱۱]

کی مذکورہ روایات کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔انہی روایات میں سے امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ کی مالک ابن حارث رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔اللہ تعالیٰ نے اسے پریشانی میں مبتلا کر دیا اور اس نے شیطان کی اطاعت کی۔وہ کوئی حل نہ نکال سکا۔میں نے عرض کیا اس آدمی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو اس کی بیوی کو (بعد از مذکورہ طلاق) اس کیلئے حلال سمجھتا ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو اللہ کو دھوکا دیتا ہے اللہ اسے دھوکا دیتا ہے۔[1]

بعض لوگ اس حدیث کا جواب دیتے ہیں کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما غیر مدخول بہا کے بارے میں ہیں۔حالانکہ غیر مدخول بہا کو جب تین طلاقیں دی جائیں تو بالاتفاق واقع ہو جاتی ہیں لہٰذا اس حدیث کو مدخول بہا پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھ سے اپنی طلاق کا واقعہ بیان کریں۔انہوں نے کہا کہ مجھے میرے شوہر نے تین طلاقیں دیں جب وہ یمن کی طرف جا رہے تھے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تین طلاقوں کو نافذ فرما دیا۔[2]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں۔میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أما اتقى الله جدک. أمَا ثلاثة فله و أمّا تسع مِأة وسبع و تسعون فعدو قامله كم ان و ظلم . إن شاء الله عذبه و إن شاء غفرله.[3] ''کیا تیرا دادا اللہ سے نہیں ڈرتا؟ تین طلاقوں کا تو اسے اختیار ہے مگر نو سو ستانوے (۹۹۷) طلاقیں ظلم اور زیادتی ہے۔اگر اللہ چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے تو اسے معاف کر دے۔''

حدیث عویمر عجلانی میں ہے کہ حضرت عویمر نے کہا: اگر بیوی کو اپنے پاس روک رکھتا تو اس سے جھوٹ بولتا لہٰذا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے پہلے ہی انہیں تین طلاقیں دے دیں۔[4]

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں حضرت زید ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے جایا گیا جس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دی تھیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کیا تو نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے؟ اس نے کہا میں تو

---

۱ [بخاری مع عینی:۲۳۳/۳] ۲ [ابن ماجہ:۶۵۲/۱]

۳ [مجمع الزوائد ۳۳۸/۴] ۴ [بخاری مع عینی:۲۳۵/۲۰]

مذاق کر رہا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درہ بلند کیا اور فرمایا: ان میں سے تین تیرے لئے کافی ہیں۔ علامہ ابن القیم اس کی سند کے بارے میں خاموش رہے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے۔

''تجھے تین طلاقیں ہیں'' اور ''تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے'' میں فرق

اگر کوئی شخص اپنی غیر مدخول بہا بیوی سے أنتِ طالق، أنتِ طالق، أنت طالق. کلام متصل کے ساتھ کہے تو ایک طلاق واقع ہوگی کیونکہ وہ پہلی طلاق کے ساتھ ہی بائنہ ہوگئی اور دوسری اور تیسری طلاق لغو جائیگی۔

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے أنت طالق ثلاث مرات. کہا تو اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ کلام متصل ہو، دوسرا یہ کہ کلام منفصل ہو۔ کلام متصل محتمل ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ أنتِ طالقٍ ثلاثاً کے حکم میں ہو، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ اس کے حکم میں نہیں ہے۔ بلکہ أنتِ طالق ثلاثا تین طلاقوں کے حکم میں ہے اور أنتِ طالق. أنتِ طالق. أنتِ طالق. کلام متصل کے حکم میں ہے یوں ایک طلاق واقع ہوگی۔

حضرت محمد بن ایاس بن بکر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو جماع سے پہلے تین طلاقیں دیں پھر اسے اسکے ساتھ نکاح کرنے کا خیال آیا وہ سوال لیکر آیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اس بارے میں سوال کیا۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا کہ ہمارے خیال میں تم اس وقت تک اس سے نکاح نہ کرو، جب تک کہ وہ تمہارے علاوہ کسی دوسرے خاوند سے شادی نہ کرلے۔ اس آدمی نے کہا میں نے تو اسے صرف ایک طلاق دی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جو تمہارے اختیار میں تھا تم کر چکے۔ اور یہی روایت حضرت سعید ابن جبیرؒ، حضرت مالک بن حارثؒ، حضرت محمد بن ایاس بن بکرؒ اور حضرت معاویہ بن ابی عیاش انصاریؒ، تمام حضرات، حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے تین طلاقوں کو معتبر مانا اور اسے جاری کیا ہے۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا کہ جس نے اپنی بیوی کو قبل از دخول تین طلاقیں دے دیں ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کے اختیار میں گرہ تھی اس نے ساری کی ساری کھول دی۔ اگر یہ الگ الگ طلاق دیتا تو کچھ نہ ہوتا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علیحدہ علیحدہ طلاق دینے کا مطب یہ ہے کہ وہ أنتِ طالق. أنتِ طالق. أنت طالق کہتا۔ اس طرح وہ عورت پہلی طلاق کے ساتھ بائنہ ہوجاتی

اور دوسری اور تیسری طلاق لغو ہو جاتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حماد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ جب کسی آدمی نے اپنی غیر مدخول بہا بیوی کو أنتِ طالق، أنتِ طالق، أنتِ طالق کہا تو وہ پہلی طلاق سے بائنہ ہو جائے گی اور دوسری دو طلاقیں ایسی عورت پر واقع ہوں گی جو اس کے نکاح میں نہیں۔ اور جب اس نے ایک ہی جملے میں اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو وہ اس پر حرام ہو جائے گی حتیٰ کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔

بچے، مجنوں اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق کا حکم

بچے کی اور مجنوں کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اگر بچہ بعد از بلوغ طلاق دے اور مجنوں افاقے کے بعد طلاق دے تو ان کی طلاق واقع ہو جائے گی۔ مدہوش شخص بھی مجنون کی طرح ہے اور سوتے ہوئے شخص کی (نیند میں) دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رفع القلم عن ثلاثة عن النائم حتى يستيقظ. و عن الصبى حتى يحتلم و عن المجنون حتى يعقل.[1] آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تین آدمیوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے سونے والے سے جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے، بچے سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے اور مجنوں سے جب تک کہ اسے افاقہ نہ ہو جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مدہوش کی طلاق کے سوا ہر طلاق جائز ہے۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نیند کی حالت میں طلاق دے، یا غلام آزاد کر دے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ اس کی طلاق اور عتق واقع نہیں ہوتا۔

مجبور کی طلاق کا حکم

مُکرَہ کا مطلب ہے کہ کسی شخص کو اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ طلاق دے دے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ کہ مُکرَہ کا مطلب ہے کہ انسان غصے کی حالت میں طلاق دے۔ یہ غلط ہے وہ کہتے ہیں کہ جو آدمی حالت غصہ میں طلاق دیتا ہے۔ اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے اور وہ مجنوں ہو جاتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی طلاق ایسی حالت میں ہوتی ہے کہ اس کی عقل موجود نہیں ہوتی۔

---

[1] [بیہقی:۳۵۹]

اگر اس بات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر تو ہر مجرم جرم کے بعد یہ کہہ دیا کرے کہ مجھ سے غصے کے سبب یہ غلطی ہو گئی۔ لہٰذا مجھ سے یہ حدود ختم کی جائیں لیکن جامع میں ہے کہ اغلاق واکراہ انتہائی شدید غصے کو کہتے ہیں۔ اور انتہائی غصے والا شخص جو سفید و سیاہ میں فرق نہ کر سکے اور جب اس سے طلاق کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ اس کا شدت سے انکار کرے۔ اس کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ پہلا مذہب یہ ہے کہ جب مکرہ کو مجبور کر دیا جائے اور اس پر سختی کی جائے تو اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ یہ مذہب حضرت علی ابن ابی طالبؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت عطاءؒ، حسن بن ابی حسنؒ اور حضرت ابن عباسؓ، حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت ضحاکؒ کا ہے۔ اور یہی مذہب امام مالک بن انسؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا ہے اور ان حضرات کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: لا طلاق و لاعتاق فی الاغلاق۔[1] ''حالت اغلاق میں عتاق میں طلاق واقع نہیں ہوتی'' اور ان کی دوسری دلیل حضرت حسنؒ کی حضرت علیؓ سے منقول روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا، مکرہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔[2]

دوسرا مذہب یہ ہے کہ مکرہ کی طلاق معتبر ہے اور واقع ہو جاتی ہے۔ یہ مذہب امام شعبیؒ، ابراہیم نخعیؒ، حضرت ابو قلابہؒ، حضرت ابن مسیبؒ، حضرت امام زہریؒ، حضرت قتادہؒ اور حضرت سعید ابن جبیرؒ کا ہے اور اسی مذہب کو امام ابو حنیفہؒ اور آپؒ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے۔ ان حضرات کی دلیل فرج بن خصانہ کی حضرت عمرو بن شراحیل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کردہ روایت ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ ایک عورت نے اپنے خاوند کو زبردستی طلاق دینے پر مجبور کیا اور اس نے اس کو طلاق دے دی۔ یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کی طلاق کو نافذ کر دیا۔[3] اسی طرح کی روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔ مکرہ کا مطلب ہے کہ قید کر دیا جائے، یا ڈرایا دھمکایا جائے، یا قتل کی دھمکی دی جائے یا بہت زیادہ مارا پیٹا جائے۔

غصے میں طلاق کا حکم

غصے میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے جبکہ حنابلہ سے ایک روایت یہ ہے کہ حالت غضب کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

---

[1] [معالم السنن: ۲۴۲/۴]　[2] [بیہقی: ۳۵۷/۷]　[3] [بخاری مع عینی: ۲۵۰/۳۰]

نشئی کی طلاق کا حکم

علماء حضرات کی اس بارے میں دو آراء ہیں۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ یہ مذہب حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت جابر بن زیدؓ، حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات کا ہے اور بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ نشئی کی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ یہ امام حسن بصریؒ، حضرت سعید بن میسبؓ، امام ابراہیم نخعیؒ، حضرت میمونؒ، حضرت حمیدؒ، حضرت سلیمان بن یسارؒ، حضرت اوزاعیؒ اور امام ثوریؒ کا مذہب ہے اور یہی قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالکؒ کا ہے اور اس میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ایک قول میں انہوں نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور دوسرے میں تردید فرمائی ہے۔

بھول کر یا سبقت لسانی سے طلاق کا حکم

بھول چوک سے، غلطی سے یا سبقت لسانی کی وجہ سے طلاق دی جائے تو احناف کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ طلاق بالخطاء واقع نہیں ہوتی۔ جبکہ حنفیہ کے نزدیک واقع ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ثلاث جد ھن جد وھزلھن جد، النکاح و الطلاق والرجعة. ''تین چیزیں مذاق اور سنجیدگی دونوں صورتوں میں واقع ہو جاتی ہیں۔ نکاح، طلاق اور رجوع۔''[1] اسی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اہل علم اور دیگر اسلاف کا عمل ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ، میری امت سے خطاء، نسیان اور مجبوری کو اٹھا لیا گیا ہے، سے مراد یہ ہے کہ ان کا گناہ اٹھا لیا گیا ہے نہ کہ ان کا حکم۔

غیر مسلم کی طلاق کا حکم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام داؤد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ غیر مسلم کی طلاق واقع نہیں ہوتی جبکہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ غیر مسلم کی طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ اس کا نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

دل ہی دل میں طلاق کا حکم

جس آدمی نے طلاق کی نیت کی اور دل میں اس کا پکا ارادہ کر لیا لیکن لفظ طلاق کا تکلم نہیں

---

[1] [عارضۃ الاحوذی ۱۵۶/۵]

کیا تو اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إن الله تجاوز لأمّتي عمّا حدثت به انفسها مالم تعمل به او تكلم به. ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات کو معاف کر دیا ہے۔جب تک کہ ان پر عمل نہ کرلیں یا ان کا تکلم نہ کرلیں۔''[1]

طلاق بالکنایۃ کا حکم

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر خاوند اپنی بیوی سے إلحقي بأهلك، یا لا سبيل لي عليك وغیرہ الفاظ کہے تو اگر وہ طلاق کی نیت کرے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔اور اگر اس نے طلاق کی نیت نہیں کی تو واقع نہیں ہوگی۔لیکن صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک اس کی نیت کے مطابق ایک یا تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔اگر اس نے دو طلاقوں کی نیت کی تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوگی۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کی نیت طلاق دینا ہے تو اس کی نیت کے مطابق ایک، دو، یا تین واقع ہوں گی اور اگر اس کا ارادہ نہیں ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔

الفاظ کنایات سے احناف کے نزدیک صرف نیت ہی سے طلاق واقع ہوتی ہے۔ان میں ایک اور تین کی نیت درست ہے جبکہ دو کی نیت کرنے کی صورت میں ایک واقع ہوگی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ابنۃ الجون کی جب رخصتی ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے قریب گئے تو وہ بولی میں آپ سے اللہ کی پناہ چاہتی ہوں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لقد عذت بعظيم، إلحقي بأهلك. ''تم نے عظیم ہستی کی پناہ مانگی ہے، تم اپنے گھر چلی جاؤ!''[2]

کوئی شخص ایسا جملہ بولے جو طلاق پر دلالت کرتا ہو، لیکن وہ اس سے طلاق (جدائی) کی نیت کرے تو اس بارے میں فیما بینہ و بین اللہ اس کا قول معتبر ہے۔مگر جب کسی نے صراحۃً لفظ طلاق بولا اور کہا کہ میرا ارادہ تو کچھ اور تھا تو قضاء اس کی تصدیق نہیں کی جائیگی۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو کسی کاغذ، تختی، دیوار یا زمین وغیرہ پر طلاق لکھ کر دی تو اس کی نیت سے طلاق واقع ہو جائے گی۔مگر یہ اس صورت میں ہے کہ جب وہ اسے مخاطب نہ کرے۔مثلاً وہ یہ لکھے کہ میری بیوی مطلقہ ہے۔لیکن اگر وہ خطاب کے طور پر خط کی طرز پر لکھے کہ اے فلانی! تجھے طلاق۔یا جب تجھے میرا خط پہنچے تو تجھے طلاق تو اس طرح بغیر نیت کے بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔پھر اگر اس نے مطلقاً لکھا تو اس کی بیوی کو فوراً طلاق ہو جائے گی۔گویا اس نے بیوی سے کہا ہے تجھے طلاق! اور اگر اس نے معلقاً لکھا مثلاً وہ لکھے کہ جب میرا خط تیرے پاس پہنچے

[1] [ابن ماجہ: ۱/۶۵۸] [2] [بخاری مع عینی: ۲۰/۲۲۹]

تو تجھے طلاق تو خط اسے پہنچنے تک طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس نے وقوع طلاق کو خط پہنچنے کے ساتھ معلق کیا ہے۔ لہٰذا خط ملنے سے پہلے طلاق نہیں ہوگی اور اگر خط اس کے باپ کے پاس پہنچ گیا اور اس نے بیٹی کو دیے بغیر پھاڑ دیا تو اگر وہ بیٹی کے معاملات میں متصرف ہے تو وہ مطلقہ ہو جائیگی ورنہ نہیں۔ اگر چہ وہ خط کے متعلق بیٹی کو بتا بھی دے۔ لیکن جب تک اسے خط نہ دے دے۔

''تو مجھ پر حرام ہے'' کا حکم

حضرت عبدالعزیز بن ابی سلمہؒ کے نزدیک یہ کہنے سے ایک طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں نے تین کی نیت کی تھی تو تین، اور اگر اس نے ایک کی نیت کی تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوگی۔ اور اگر اس نے قسم کی نیت کی تو یہ قسم ہوگی اور وہ اس کا کفارہ ادا کرے گا۔ اگر وہ قسم اور طلاق وغیرہ کی نیت نہ کرے تو یہ جھوٹ ہوگا۔ یہی مذہب احناف کا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اس نے دو طلاقوں کی نیت کی تو ایک ہوگی اور اگر طلاق کی نیت نہ کی تو پھر قسم ہوگی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر اس نے طلاق کی نیت کی تو طلاق ہوگی اور اگر اس نے طلاق کی نیت نہ کی تو یہ قسم ہوگی اور وہ اس کا کفارہ ادا کرے گا۔ نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح منقول ہے۔[1]

جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''تو مجھ پر حرام ہے'' طلاق نہیں ہے جب تک طلاق کی نیت نہ کی جائے، اور اگر وہ نیت کرے تو جتنی طلاقوں کی نیت کریگا اتنی واقع ہوں گی۔ اگر تحریم بلا طلاق کا ارادہ کرے تو اس پر کفارۂ یمین ہوگا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر کفارۂ ظہار لازم ہوگا۔ یہی قول حضرت ابو قلابہ اور حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان الفاظ ''أنتِ عليّ حرام'' کے ساتھ تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اس سے اس کی نیت کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔[2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو حرام ٹھہرایا تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور فرمایا کہ تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہترین نمونہ ہیں۔[3]

اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا ''مجھے تجھ میں کوئی حاجت نہیں'' تو اس میں اس کی نیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر طلاق کی نیت کی تو وہ واقع ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

---

[1] [بخاری مع عینی: ۲۰/۲۴۰]　[2] [بخاری مع عینی: ۲۰/۲۴۱]　[3] [بخاری مع عینی ۲۰: ۲۴۱]

الفاظ طلاق

صریح لفظ ''طلاق'' نیت کا محتاج نہیں۔ کیونکہ شارع نے اس کو طلاق کیلئے (ہی) وضع کیا ہے۔ اور چونکہ یہ لفظ طلاق کیلئے حقیقت ہے اور حقیقت کیلئے نیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم:

اگر کسی نے ''أنت طالق، أنت مطلقة یا طلقتک'' کے الفاظ کہے تو ان میں سے کسی ایک لفظ کے استعمال سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ اس میں دو اور تین کی نیت درست نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے ان الفاظ کے ساتھ طلاق بائنہ کا ارادہ کیا تو طلاق بائنہ نہیں بلکہ طلاق رجعی واقع ہوگی۔ کیونکہ جس مقصد کیلئے شارع نے اس کو وضع کیا ہے اس کے مخالف نیت کا اعتبار نہیں ہے۔

دوسری قسم:

اگر اس نے أنت الطلاق، أنت طالق الطلاق یا أنت طالق طلاقاً کے الفاظ کہے تو ان میں سے کسی ایک لفظ کے تلفظ سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ اور اس میں تین کی نیت تو درست ہوتی ہے مگر دو کی نہیں۔ کیونکہ اس نے مصدر ''الطلاق'' اور ''طلاقاً'' کو ذکر کیا ہے اور مصدر عموم کا احتمال بھی رکھتا ہے اور ادنیٰ کا بھی۔ مطلق استعمال کے وقت اسے ایک پر محمول کیا جائے گا کیونکہ وہ یقینی ہے اور اگر تین کی نیت ہو تو تین واقع ہو جائیں گی۔ کیونکہ اس کا بھی احتمال ہے۔

اگر اس نے ''أنت طالق طلاقاً'' کہہ کر دو طلاقوں کی نیت کی یعنی ایک طالق سے اور ایک طلاقاً سے، تو دونوں واقع ہو جائیں گی۔ کیونکہ دونوں لفظوں میں سے ہر ایک سے وقوع کا احتمال ہے۔ اور یہ ایسے ہوگا گویا اس نے ''أنت طالق''، أنت طلاقاً'' کہا ہے۔ اسی طرح ''أنت طالق الطلاق'' کا بھی یہی حکم ہوگا۔

اگر اس نے کہا فلاں کام سے تجھے تین طلاقیں ہیں تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اور اگر وہ کہے کہ اس نے طلاق کی نیت نہیں کی تھی تو عدالت اس کی تصدیق نہیں کرے گی۔ اگر آدمی نے کہا تیری گردن کو طلاق، یا تیرے چہرے کو طلاق، یا تیرے سر کو طلاق، یا تیری روح کو طلاق، یا تیرے جسم کو طلاق، تو ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جائیگی، کیونکہ گردن، چہرہ، روح اور جسم ایسے اعضاء ہیں جنہیں بول کر سارا جسم مراد لیا جاتا ہے۔ نصف طلاق، مکمل طلاق ہوتی ہے۔ اسی طرح

تہائی طلاق (بھی) مکمل طلاق ہے۔ اگر کسی آدمی نے اپنی چار بیویوں سے کہا کہ تمہارے درمیان ایک طلاق ہے تو چاروں پر ایک ایک طلاق واقع ہو جائیگی۔

اگر خاوند نے بیوی سے کہا، تجھے ایک سے لیکر تین تک طلاق ہے۔ تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو طلاقیں جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ اور اگر اس نے کہا تجھے ایک سے دو تک طلاق ہے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک اور صاحبینؒ کے نزدیک دو طلاقیں واقع ہوں گی۔

اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا: تجھے یہاں سے دمشق تک یا یہاں سے مدینہ تک طلاق، تو اسے فوراً اور جس شہر میں وہ ہے اس شہر میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے کہا تجھے کل طلاق ہے، تو طلوع فجر کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے اس سے دن کے آخر تک کی نیت کی تو دیانتاً اس کی تصدیق کی جائے گی۔

اگر اس نے کہا تجھے آج اور کل طلاق ہے یا کل اور آج طلاق ہے تو ان دونوں لفظوں میں سے جو پہلے ذکر کیا جائے گا وہ معتبر ہوگا۔ اور اگر اس نے کہا تجھے طلاق ہے قبل اس کے کہ میں تجھ سے شادی کروں تو ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اور اگر کسی نے کہا کہ تجھے اتنی طلاقیں ہیں اور اپنی تین انگلیوں سے اشارہ کیا تو اسے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اور ایک سے اشارہ کیا تو ایک اور دو سے اشارہ کیا تو دو واقع ہوں گی۔ اور اگر أنت طالق کہا اور اشارہ نہیں کیا تو ایک طلاق واقع ہوگی۔ کیونکہ عدد ذکر نہ کرنے کی صورت میں أنت طالق سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور اگر کہا تجھے اتنی اتنی طلاقیں ہیں تو تین واقع ہو جائیں گی۔ کیونکہ اتنی اتنی (کذا، کذا) کا اطلاق عرفاً گیارہ پر ہوتا ہے۔

اگر کس شخص نے أنت طالق و طالق کہا تو ایک طلاق واقع ہوگی کیونکہ اس نے نہ تو اپنے کلام کو معلق کیا ہے اور نہ ہی آخر میں کوئی ایسی چیز ذکر کی ہے جو اول کو تبدیل کرتی، اس طرح اس کا ہر لفظ الگ سے طلاق ہوگا۔ پس اس کے أنت طالق کہنے سے اس پر طلاق بائنہ واقع ہو جائیگی اور اس کے ساتھ جب دوسرا أنت طالق ملے گا تو پہلے سے بائنہ ہونے کی وجہ سے دوسری نہیں واقع ہوگی۔

اور اگر اس نے أنتِ طالق طالق یا أنت طالق و احدة و واحدة کہا تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اور اگر کسی نے کہا تجھے ایک سے پہلے ایک طلاق۔ یا ایک طلاق کے بعد ایک طلاق ہے

تو ان الفاظ سے ایک طلاق واقع ہوگی۔ کیونکہ قبلیت و بعدیت میں اصل یہ ہے کہ دو طلاقوں کے درمیان ظرف کو ہائے کنایہ کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جائے تو اس وقت ظرف آخر میں مذکور کلمہ کی صفت ہوتا ہے اور اگر اس کو ہائے کنایہ کے بغیر ذکر کیا جائے تو اس وقت ظرف اول میں مذکور کلمہ کی صفت ہوگا۔ چنانچہ اس کا کہنا کہ تجھے ایسی طلاق جس سے پہلے ایک طلاق ہے۔ اس صورت میں قبلیت اول کلمے کی صفت ہے اور طلاق کا ماضی میں واقع ہونا گویا حال میں واقع ہونا ہے۔ کیونکہ شریعت میں خبر کو انشاء سمجھا جاتا ہے۔ پس ایک طلاق واقع ہو جائیگی اور وہ اس سے بائنہ ہو جائے گی اور مابعد والی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اور اس کا یہ کہنا کہ تجھے ایسی طلاق جس کے بعد ایک طلاق ہے تو اس صورت میں بعدیت دوسرے، واحدۃ کی صفت بنے گی اور عورت پہلے ہی بائنہ ہو چکی ہے لہٰذا ایک ہی طلاق ہوگی۔

اور اگر اس نے کہا تجھے ایک طلاق ہے اور اس سے پہلے ایک طلاق ہے۔ یا یوں کہا کہ تجھے ایک طلاق اور اس کے بعد ایک طلاق، تو دو طلاقیں واقع ہوں گی کیونکہ قبلیت دوسری طلاق کی صفت ہے اور وہ اس کے ایقاع کا ماضی میں تقاضا کرتی ہے اور پہلی طلاق کے حال میں ایقاع کا تقاضا کرتی ہے۔ پس وہ دونوں متصل ہو جائیں گی۔

اور دوسرے مسئلہ میں بعدیت پہلی طلاق کی صفت ہے جو کہ ایک طلاق کے حال میں واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے اور دوسری کے اس سے پہلے وقوع کا۔ چنانچہ دونوں مل جائیں گی۔

اور اگر آدمی نے کہا تجھے ایک طلاق کے ساتھ ایک طلاق ہے، یا ایک طلاق ہے اور اس کے ساتھ ایک طلاق ہے تو دونوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی کیونکہ لفظ ''ساتھ'' مقارنت کیلئے ہے۔

اگر کسی شخص نے بیوی سے کہا کہ تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے ایک طلاق ہے اور ایک طلاق ہے، وہ داخل ہوگئی تو ایک طلاق واقع ہو جائے گی اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ دو طلاقیں واقع ہوں گی۔

اگر اس نے کہا تجھے ایک طلاق ہے اور ایک طلاق ہے اگر تو گھر میں داخل ہوئی۔ پھر وہ داخل ہوگئی تو بالاجماع دونوں طلاقیں واقع ہوں گی۔

ان دونوں مسئلوں میں فرق یہ ہے کہ شرط جب کلام مقصودی (صدر کلام) سے مؤخر ہو تو اس پر پورا کلام موقوف ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری صورت، جس میں شرط مؤخر ہے، میں ساری طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اور جب شرط مقدم ہو اور اس کو بدلنے والی کوئی چیز نہ ہو تو پھر جمیع کلام اس پر موقوف نہیں ہوتا۔ اور جمیع کلام میں ترتیب اور قران ہر دو کا احتمال ہوتا ہے۔ احتمال ترتیب کی

تقدیر پر صرف ایک طلاق واقع ہوگی جیسا کہ اس کی وضاحت ہو چکی اور شک کی وجہ سے اس سے زائد واقع نہیں ہوں گی۔

شوہر نے اپنی غیر مدخول بہا بیوی سے کہا تجھے طلاق ہے، طلاق ہے اگر تو گھر میں داخل ہوئی! تو وہ پہلی طلاق کے ساتھ بائنہ ہو جائے گی اور دوسری طلاق سے اس کا تعلق نہیں ہوگا۔

اور اگر شوہر نے اپنی مدخول بہا بیوی سے کہا، تجھے طلاق ہے طلاق ہے اگر تو گھر میں داخل ہوئی، تو ایک طلاق فی الحال واقع ہو جائے گی اور دوسری گھر میں داخل ہونے کے ساتھ معلق ہوگی۔

طلاق کی صفت ذکر کرنا

اگر طلاق کو کسی ایسے وصف کے ساتھ موصوف کیا جائے جس کے ساتھ اس کو موصوف نہیں کیا جاتا اور نہ طلاق اس کا احتمال رکھتی ہے، تو وصف باطل ہو جائیگا اور طلاق واقع ہو جائے گی۔

اگر خاوند نے بیوی سے کہا: تجھے طلاق ہے اور مجھے تین دن تک اختیار ہے۔ تو طلاق واقع ہو جائے گی اور شرط باطل ہو جائے گی۔

اگر اس نے کہا: تجھے طلاق ہے، افضل طلاق، یا اکمل طلاق، یا احسن طلاق تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ اور اگر اس نے کہا تجھے طلاق بائن ہے یا سب سے بری طلاق ہے۔ یا سب سے بڑی طلاق ہے، یا بھرے گھر کے برابر طلاق ہے تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوگی اور اگر اس نے تین کی نیت کی تو تین واقع ہونگی۔

طلاق کے متعلق بیوی کو اختیار دینا

اگر خاوند نے بیوی سے کہا تو اپنے آپ کو اختیار کر لے، اور اس سے اس نے طلاق کی نیت کی، تو عورت کو اس بات کا اختیار ہے کہ اسے جس مجلس میں علم ہوا اسی مجلس میں خود کو طلاق دے لے۔ اور اگر وہ اس مجلس میں موجود ہو تو سن کر خود کو طلاق دے سکتی ہے۔ اور اگر وہ وہاں موجود نہیں تو جب اسے خیار کی خبر ملے تو خو کو طلاق دے سکتی ہے۔ کیونکہ مخیّرہ کو خیار مجلس حاصل ہے اور اس بات پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ اس کے خاوند نے اسے اختیار کے فعل کا مالک بنایا ہے اور اختیار مجلس ختم ہونے کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اعراض کی دلیل ہے۔ اور مجلس کے حقیقتاً بدل جانے سے بھی خیار ختم ہو جاتا ہے۔ اگر مخیّرہ صلوٰۃ فرض یا صلوٰۃ وتر میں ہو اور اس کو اختیار دیا جائے مگر وہ نماز پوری کر لے تو اس کا خیار باطل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر وہ نفل نماز میں تھی اور اس نے دو رکعتیں پوری کر لیں تو بھی اس کا خیار باطل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کیلئے نماز دو

رکعتیں پوری کرنے سے پہلے قطع کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر اس نے دو رکعت سے زیادہ ادا کیں یا کسی دوسری نماز میں داخل ہو گئی یا اسنے چار رکعت پوری کیں تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ اور اگر اسے کھڑے ہونے کی حالت میں خیار دیا گیا اور وہ بیٹھ گئی تو خیار باطل نہیں ہوگا کیونکہ یہ غور وفکر کی دلیل ہے اور اسی طرح اگر وہ بیٹھی ہوئی تھی اور ٹیک لگالی، یا ٹیک لگائے ہوئے تھی اور بیٹھ گئی تو بھی خیار باطل نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ اعراض نہیں ہے۔ جب اس نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا تو اسے ایک طلاق بائنہ ہو جائے گی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اختیار دیا پس ہم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کر لیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے اوپر اس کو کچھ شمار نہ کیا۔[1]

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، اور تابعین میں سے حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سلیمان بن یسارؒ، حضرت ربیعہؒ اور امام زہریؒ تمام حضرات فرماتے ہیں کہ جب بیوی نے اپنے شوہر کو اختیار کر لیا تو اس پر کچھ بھی نہیں اور یہی ائمہ اربعہ کا مفتیٰ بہ قول ہے۔

اور اگر بیوی نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا تو ترمذی اور ابو داؤد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اسے ایک طلاق بائنہ ہوگی۔[2]

خیار میں لفظ نفس کا ذکر ضروری ہے

''لفظ نفس'' کا ذکر کرنا یا جو لفظ اس پر دلالت کرے اس کا ذکر کرنا خاوند یا بیوی کے کلام میں ضروری ہے۔ اگر خاوند نے بیوی سے کہا تو اختیار کر اور بیوی نے کہا میں نے اختیار کر لیا تو کچھ بھی واقع نہ ہوگا۔ اور درست یہ ہے کہ خاوند بیوی سے کہے تو اپنے نفس کو اختیار کر اور بیوی نے کہا میں نے اختیار کر لیا۔ یا خاوند کہے اختیار کر اور بیوی کہے میں نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا۔

خیار کس صورت میں طلاق رجعی بنے گا

اگر شوہر نے بیوی سے کہا: تو اپنے نفس کو طلاق کے ساتھ اختیار کر، یا کہا: تیرا معاملہ طلاق کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے اور بیوی نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا تو یہ ایک طلاق رجعی ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، دونوں حضرات ''اختیاری'' کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگر بیوی اپنے خاوند کو اختیار کر لیتی ہے تو ایک طلاق واقع ہوگی اور خاوند کی ملک باقی رہے گی۔[3]

[1] [شرح البخاری العینی ۲/۲۲۷] [2] [معالم السنن ۵/۲۲۷] [3] [الآثار ۱۳۹]

اگر بیوی نے کہا میں نے خود کو طلاق دے لی یا کہا میں نے خود کو طلاق کے ساتھ اختیار کرلیا تو یہ طلاق رجعی ہوگی۔

خیار کب لغو ہوگا؟

خاوند نے بیوی کو اختیار دیا اور بیوی نے کہا: میں اپنے نفس کو اختیار کرتی ہوں، نہیں بلکہ اپنے شوہر کو اختیار کرتی ہوں! تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کا یہ کہنا کہ "نہیں بلکہ اپنے شوہر کو اختیار کرتی ہوں" پہلے کلام سے اعراض کی دلیل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اختیار دیا، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کرلیا تو آپ نے اس کو ہمارے اوپر طلاق شمار نہیں فرمایا۔[1]

اگر خاوند نے بیوی کو اختیار دیا اور اس نے کہا میں نے اپنے نفس کو اختیار کرلیا یا اپنے خاوند کو اختیار کرلیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ لفظ "یا" شک کیلئے استعمال ہوتا ہے اور طلاق شک کے ساتھ واقع نہیں ہوتی۔

خیار میں کب طلاق واقع ہوگی؟

اگر خاوند نے بیوی کو اختیار دیا اور بیوی نے کہا میں نے اپنے نفس کو اور اپنے خاوند کو اختیار کرلیا تو اسے طلاق ہوجائے گی اور عطف درست نہیں ہوگا۔

امرک بیدک (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں) کی تفریعات

اگر شوہر نے بیوی سے کہا: تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے اور اس سے تین طلاقوں کی نیت کی تو یہ صحیح ہوگی اور تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔

اور اگر بیوی نے الامر بالید کے جواب میں کہا میں نے اپنے نفس کو ایک طلاق کے ساتھ اختیار کیا اور مرد تین کی نیت کرچکا ہے تو تین ہی واقع ہوں گی۔ اگر خاوند نے بیوی سے کہا: تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے اور بیوی نے اپنے نفس کو اختیار کرلیا تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ اور اگر خاوند نے بیوی سے کہا: تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے اور بیوی نے اس کے جواب میں کہا تو مجھ پر حرام ہے یا میں تجھ پر حرام ہوں تو یہ بھی جواب ہوگا اور اس کو طلاق ہوجائے گی۔

کسی نے بیوی سے کہا: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، تو اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی خود کو طلاق دے دی تو واقع ہوجائیگی اور اگر اس نے دو قدم چلنے کے

[1] [الآثار: ۱۳۰]

بعد خود کو طلاق دی تو واقع نہ ہوگی۔

بیوی کو طلاق کا اختیار دینا

اگر شوہر نے بیوی سے کہا کہ خود کو طلاق دے لے تو عورت کو اختیار ہے کہ وہ خود کو اسی مجلس میں طلاق دے لے اور مرد کو یہ حق نہیں کہ وہ اس طلاق سے رجوع کرے۔ اسی طرح اگر مرد کہے: تجھے طلاق ہے اگر تو چاہے، یا پسند کرے یا ارادہ کرے، یا تو راضی ہو! تو یہ خیار فی المجلس کی طرح ہے۔

اور اگر عورت نے خود کو تین طلاقیں دے لیں اور خاوند نے بھی اس کا ارادہ کرلیا تو تینوں واقع ہو جائیں گی اور دو کی نیت صحیح نہیں ہوگی۔ الا یہ کہ بیوی باندی ہو۔

اور اگر خاوند نے بیوی سے کہا تو خود کو طلاق دے لے اور عورت نے کہا میں تجھ سے طلاق والی ہوں۔ یا میں مطلقہ ہوں تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

اور اگر اس نے بیوی سے کہا تو خود کو طلاق دے لے جب تو چاہے، یا جب بھی تو چاہے! تو عورت کو اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے خود کو طلاق دے سکتی ہے اور یہ مجلس کے ساتھ مقید نہیں ہوگا اور اگر وہ اس اختیار کو واپس کر دے تو یہ واپس نہیں ہوگا۔

اور اگر خاوند نے کسی دوسرے آدمی سے کہا کہ اگر تو چاہے تو میری بیوی کو طلاق دے دے تو یہ توکیل مجلس تک محدود ہوگی۔ اور اگر اس نے کہا تو میری بیوی کو جب چاہے طلاق دے دے تو یہ مجلس پر مقید نہیں ہوگا۔

اگر خاوند نے بیوی سے کہا: تجھے طلاق ہے اگر تو پسند کرے۔ بیوی نے کہا مجھے پسند ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ چاہنا اور پسند کرنا محبت یا ارادہ اور ایجاب ہے لہٰذا شرط پائی گئی۔

اگر خاوند نے بیوی سے کہا تجھے طلاق ہے اگر تو چاہے۔ بیوی نے کہا مجھے پسند ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ محبت میں ارادہ اور چاہنا نہیں ہوتا لہٰذا شرائط نہ پائی گئی۔

اگر خاوند نے بیوی سے کہا تو خود کو طلاق دے لے جب بھی تو چاہے تو عورت کو یہ اختیار ہے کہ وہ خود کو جب چاہے تین طلاقیں دے لے اگر خاوند نے اس کو تین طلاقیں دے دیں اور پھر وہ کسی دوسرے آدمی سے شادی کرنے کے بعد پہلے خاوند کے نکاح میں آ گئی تو اس کو طلاق کا خیار نہیں ہوگا اور نہ اس کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ وہ طلاقوں کو جمع کرے کیونکہ کلما عمومِ انفراد کو واجب کرتا ہے نہ کہ عموم اجتماع کو۔

اور اگر شوہر نے بیوی سے کہا تو خود کو تین طلاقیں دے لے اور بیوی نے خود کو ایک طلاق دے لی تو ایک واقع ہو جائے گی کیونکہ اس کو جس چیز کا مالک بنایا گیا تھا اس نے اس میں سے بعض کو واقع کر لیا۔

اگر کسی نے بیوی سے کہا تو خود کو ایک طلاق دے لے اور بیوی نے خود کو تین طلاقیں دے لیں تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کچھ بھی نہیں واقع ہوگا کیونکہ لفظ واحدۃ لفظ ثلاث کا غیر ہے، اور اس کے معنی کا بھی غیر ہے، اور وہ عورت اس امر کی مرتکب ہوئی ہے جس کا اسے مالک نہیں بنایا گیا تھا تو اس کا یہ کلام نیا کلام ہوگا اور طلاق واقع نہیں ہوگی۔ جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک ایک طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ وہ ایک طلاق کی مالک تھی اگر اس نے ایک سے زائد طلاقیں دیں تو یہ زیادتی لغو ہو جائے گی۔

اگر شوہر نے بیوی سے کہا: تجھے طلاق ہے جیسی تو چاہے تو اگر بیوی نے ''شئتُ'' نہ کہا تو اس پر ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔

اگر اس نے بیوی سے کہا: تجھے طلاق ہے جیسی تو چاہے تو اگر بیوی نے جواب میں ''شئتُ'' کہہ دیا تو اسے ایک طلاق بائنہ ہو جائے گی۔ اور اگر خاوند اس میں تین کی نیت کر چکا ہے تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

اور اگر مرد سے پوچھا گیا: تیری بیوی ہے؟ اس نے کہا: نہیں! اور اس سے طلاق کی نیت کی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

اگر بیوی نے خاوند سے کہا تو میرا خاوند نہیں ہے اور شوہر نے کہا تو سچ کہتی ہے اور اس سے طلاق کی نیت کی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اگر شوہر نے بیوی سے کہا تو میری بیوی نہیں ہے یا یہ کہا کہ میں تیرا شوہر نہیں ہوں اور اس سے طلاق کی نیت کی تو طلاق ہو جائے گی کیونکہ اس کی تقدیر یوں ہوگی کہ تو میری بیوی نہیں ہے کیونکہ میں نے تجھے طلاق دے دی ہے۔

ایسی چیز پر طلاق کو مقید کرنا جس کے بارے میں عورت ہی بتا سکے

جب شرط کا وقوع صرف عورت ہی بتا سکے تو اس وقت اس کا قول صرف اس کے حق میں معتبر ہوگا۔ اگر آدمی نے اپنی بیوی سے کہا اگر تجھے حیض آئے تو تجھے اور تیری سوکن کو طلاق، بیوی نے کہا مجھے حیض آ گیا ہے تو صرف اسی کو طلاق ہوگی سوکن کے حق میں اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔

شوہر نے بیوی سے کہا: اگر تو مجھ سے محبت کرتی ہے تو تجھے طلاق اور تیری سوکن کو طلاق۔ بیوی نے کہا مجھے تجھ سے محبت ہے تو صرف اسی کو طلاق ہوگی۔ اگر اس نے بیوی سے کہا، اگر تو نے بچے کو جنم دیا تو تجھے ایک طلاق اور اگر بچی جنی تو دو طلاقیں۔ اس نے بچہ اور بچی دونوں کو جنم دیا لیکن یہ متحقق نہیں کہ پہلے کس کو جنا تو اس کو ایک طلاق ہوگی لیکن قول احوط میں اسے دو طلاقیں ہو جائیں گی۔

طلاق کو ''انشاء اللہ'' سے مقید کرنا

آدمی نے بیوی سے کہا اگر اللہ چاہے تو تجھے طلاق، یا جب بھی اللہ چاہے، یا مگر یہ کہ اللہ چاہے تجھے طلاق، تو اس پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔ بشرطیکہ کلام موصول ہو۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی سے کہا تھا: أنت طالق إن شاء الله''تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''له استثنائه.'' ''اس کے لئے استثناء ہے۔'' ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر کسی شخص نے اپنے غلام سے کہا، تو آزاد ہے ان شاء اللہ۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یعتق، لأن الله یشاء العتق ولایشاء الطلاق''[1] ''وہ آزاد ہو جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ آزادی کو چاہتے ہیں اور طلاق کو نہیں چاہتے۔''

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر خاوند اپنی بیوی سے کہے، تجھے طلاق ہے انشاء اللہ تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے بیوی سے کہا تجھے تین طلاقیں ہیں مگر ایک نہیں تو دو طلاقیں ہو جائیں گی۔ اور اگر کہا کہ تجھے تین طلاقیں ہیں مگر دو نہیں تو اس پر ایک طلاق واقع ہوگی۔ اور کل کا استثناء کل سے درست نہیں، اگر اس نے کہا تجھے تین طلاقیں ہیں مگر تین نہیں تو تینوں واقع ہو جائیں گی اور استثناء باطل ہو جائے گا۔ اگر اس نے یوں کہا، تجھے تین طلاقیں ہیں مگر ایک نہیں، ایک نہیں، ایک نہیں۔ تو تینوں واقع ہو جائیں گی اور استثناء باطل ہوگا کیونکہ اس نے کل کا استثناء کیا ہے۔

بیوی کو وراثت سے محروم کرنے کیلئے طلاق دینا

کسی آدمی نے اپنی مرض وفات میں بیوی کو طلاق دی اور پھر وفات پا گیا تو اگر عورت کی عدت پوری نہیں ہوئی تو وہ وراثت لے گی اور اگر عدت پوری ہو چکی ہے تو وارث نہیں بنے گی۔

اگر آدمی نے بیوی کے کہنے پر طلاق بائنہ دی یا اس کے مرض موت میں عورت کی طرف سے جدائی ہوگئی تو وہ وراثت نہیں پائیگی۔

[1] [بیہقی: ۳۶۱/۷]

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کے بارے میں جو مرض موت میں بیوی کو تین طلاق دے، فرمایا: اس کی بیوی اگر عدت میں ہے تو اس کی وارث ہوگی اگر عدت گزر چکی تو اب وارث نہیں ہوگی۔

شوہر نے غیر مدخول بہا بیوی کو مرض وفات میں طلاق دے دی، تو اس عورت کیلئے نصف مہر ہوگا اور اس پر عدت نہیں ہوگی اور نہ ہی اسے میراث ملے گی۔

اگر شوہر نے بیوی کے مرض موت میں اس کے کہنے پر طلاق دی اور وہ عدت میں ہی مر گئی تو خاوند اس کا وارث ہوگا۔

مرض موت وہ مرض ہے جو آدمی کو ناکارہ بنا دے اور ضروریات پوری کرنے سے عاجز کر دے، جو شخص اپنی ضروریات کیلئے چلتا پھرتا ہے تو اس کے مرض کو مرض موت نہیں کہیں گے۔

اگر آدمی اچانک مر گیا اور وہ بیوی کو تین طلاقیں دے چکا تھا تو بیوی وارث نہیں ہوگی خواہ وہ عدت میں ہو۔ اور فالج زدہ کا بھی یہی حکم ہے۔

اگر آدمی نے اپنی بیوی کی طلاق کو اپنے کسی فعل کے ساتھ معلق کیا اور حالت مرض میں اس فعل کو انجام دیا تو بیوی وارث ہوگی کیونکہ اس نے بیوی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا ہے۔

اگر اس نے اپنی بیوی کی طلاق کو کسی اجنبی کے فعل کیساتھ معلق کیا مثلاً کہا، فلاں آدمی اگر گھر میں داخل ہوا تو تجھے طلاق! اگر تعلیق اور شرط دونوں حالت مرض میں ہیں تو بیوی وارث ہوگی اور اگر تعلیق صحت میں ہو اور شرط حالت مرض میں واقع ہو تو وارث نہیں ہوگی۔

اگر کسی نے بیوی کی طلاق کو اس کے کسی ایسے فعل سے معلق کیا جس کو کئے بغیر وہ گزارہ کر سکتی ہو، اور اس نے وہ فعل کر لیا پھر وہ اپنے مرض میں مر گیا تو بیوی وارث نہیں ہوگی۔ اور اگر عورت کیلئے وہ کام کئے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، مثلاً نماز، رشتہ داروں سے بات چیت، کھانا کھانا، یا قرض ادا کرنا وغیرہ تو بیوی وارث ہوگی۔

طلاق رجعی

طلاق رجعی جماع کو حرام نہیں کرتی۔ مرد دوران عدت عورت کی رضا کے بغیر اس سے رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن طلاق رجعی کے حالت میں اسے بیوی کے ہمراہ سفر کی ممانعت ہے۔ رجعت کے ثبوت کے لئے مرد کا کہنا یا ایسی حرکت کرنا جس سے جانبین میں حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہو، کافی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رجعت صرف کلام کے ساتھ ہوتی ہے سو اگر اس نے رجوع کی نیت سے جماع کیا تو رجوع نہیں ہوگا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آدمی عدت میں رجوع کی نیت سے جماع کرتا ہے اور گواہ بنانے سے ناواقف ہے تو یہ رجوع ہے۔

طلاق رجعی یہ ہے کہ آزاد عورت کو ایک یا دو صریح طلاقیں بدون عوض دی جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَبُعُوْلَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ'' [بقرہ:۲۲۸]

''اوران کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا۔''

اس آیت میں ''بعل'' سے مراد خاوند ہے۔اور خاوند اسی وقت ہوتا ہے جبکہ زوجیت قائم ہو اور زوجیت نص سے اور اجماع سے، وطی کے حلال ہونے کا سبب ہے۔اللہ تعالیٰ نے خاوند کے رجوع کے حق کو عورت کی رضا کے بغیر باقی رکھا ہے۔رجعت میں ایجاب وقبول شرط نہیں ہے۔اس میں مہر اور عوض بھی نہیں واجب ہوتا اور خلوت سے رجوع ثابت نہیں ہوتا۔

مرد کیلئے مستحب ہے کہ عورت کو رجوع کے متعلق بتا دے تاکہ وہ عدت کی قید سے نکل جائے اور نہ بھی بتایا تب بھی جائز ہے۔لیکن آدمی جب تک رجوع پر گواہ نہ قائم کرے تب تک اس کے ساتھ سفر نہ کرے۔کیونکہ معتدہ کیلئے گھر سے نکلنا جائز نہیں اور خاوند اس سے رجوع کر لے گا تو وہ معتدہ نہیں رہے گی اور نکلنا جائز ہو جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ آیا۔مرد نے کہا میں نے بیوی کو طلاق دی اور پھر رجوع کر لیا۔عورت نے کہا میں اس کے سامنے آپ کو اصل بات بتاتی ہوں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بتاؤ، اس عورت نے کہا۔اس نے مجھے طلاق دی پھر تیسرے حیض کے اخیر تک مجھے چھوڑ دیا۔یہاں تک کہ حیض کا خون بند ہو گیا۔میں نے نہانے کیلئے پانی رکھا اور کپڑے اتارے تو اس نے دروازے پر دستک دی اور کہا میں نے رجوع کر لیا ہے۔میں نے تجھ سے رجوع کر لیا۔سو میں نے غسل چھوڑ کر کپڑے پہن لئے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا۔اے ابن ام عبد: آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے کہا: جب تک اس عورت کیلئے نماز ادا کرنا حلال نہ ہو (یا نماز فرض نہ ہو جائے) وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہارا خیال بہت اچھا ہے میری رائے میں یہی ہے[1]۔

[1] [طبرانی]

رجوع پر گواہ بنانا مستحب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک آدمی آیا جس نے بیوی کو طلاق دی اور پھر رجوع کر کے اس پر گواہ بنا لئے اور عورت کو اس بات کا علم نہیں تھا (چنانچہ اس نے کسی اور سے نکاح کر لیا) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ پہلے خاوند کی بیوی ہے خواہ دوسرا دخول کر چکا ہے یا نہیں۔[1]

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابو کنف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اسے بتا دیا پھر اس کی عدت مکمل ہونے سے پہلے اس سے رجوع کر لیا اور اسے رجوع کے متعلق نہیں بتایا۔ وہ واپس آئے تو اس کی بیوی دوسری شادی کر چکی تھی۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے واقع بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تو اس کو غیر مدخول بہا پائے تو تُو اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اور اگر دوسرے آدمی نے دخول کر لیا ہو تو تیرا اس پر کوئی حق نہیں، وہ اپنی بیوی کے پاس آیا۔ اس نے قصہ سن کر یقین کر لیا۔ اس نے کہا مجھے خلوت چاہئے! چنانچہ خلوت میسر آئی تو اس نے عورت کے ساتھ رات گزاری پھر وہ امیر (وہاں کے گورنر) کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط لیکر پہنچا، تب لوگوں کو پتہ چلا کہ اصل واقعہ کیا ہے؟[2]

اگر شوہر نے بیوی سے کہا: میں نے تجھ سے رجوع کر لیا ہے، اور بیوی نے جواب دیا کہ میری عدت گزر چکی ہے تو رجوع نہیں ہوگا۔ بخلاف اس کے کہ وہ چند لمحے خاموش رہی۔ کیونکہ اس کے سکوت سے رجوع ثابت ہو جائیگا۔ اور اس کے بعد اس کی بات نا قابل قبول ہوگی اور رجوع بھی ثابت ہو جائے گا۔

اگر تیسرے حیض کا خون دس دنوں میں منقطع ہو تو رجوع منقطع ہو جائے گا اگرچہ اس نے غسل نہ کیا ہو۔ اور اگر خون دس دنوں سے کم میں ختم ہو جائے تو اس سے رجوع کا اختیار ختم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ غسل نہ کرے، یا اس پر نماز کامل وقت نہ گزر جائے، یا وہ تیمّم کر کے نماز ادا نہ کر لے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ خون دوبارہ لوٹ آئے کیونکہ اس کیلئے طاہرات کے حکم میں داخل ہونے کیلئے یہ امور ضروری ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب خاوند اپنی بیوی کو ایک طلاق دے تو وہ رجوع کا مالک ہوگا۔ پھر اس نے عدت پوری ہونے سے پہلے رجوع پر گواہ بنا لئے اور عورت نے لاعلمی کے سبب دوسری شادی کر لی اور خاوند نے اس سے صحبت کر لی تو عورت اور اس کے دوسرے شوہر کے درمیان تفریق کرا دی جائے گی اور اس کو پہلے خاوند کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن اس عورت کیلئے

---

[1] [بیہقی: ۷/۳۷۳] [2] [الآثار: ۱۲۹]

دوسرے خاوند کے ذمے مہر ہوگا کیونکہ وہ اس سے نفع اٹھا چکا ہے۔[۱]

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی۔ عورت کو دو حیض آئے۔ جب اس کو تیسرا حیض آیا اور خون رک جانے کے بعد اس نے غسل کیلئے پانی رکھا اور کپڑے اتار دیئے تو خاوند نے اس کے پاس آ کر رجوع کر لیا وہ عورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور سارا واقعہ بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا میرے خیال میں وہ اس کی بیوی ہے کیونکہ اس کے لئے ابھی نماز جائز نہیں ہوئی۔ لہٰذا وہ حائضہ کے حکم میں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے اور اس عورت کو اس کے خاوند کی طرف لوٹا دیا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا اس کا سینہ علم سے بھرا ہوا ہے۔[۲]

کسی آدمی نے اپنی حاملہ بیوی کو طلاق دی تو اس کو رجوع کا حق حاصل ہے اگرچہ وہ مجامعت نہ کرنے کی صراحت کرے۔ اور اگر اس نے حاملہ بیوی کو خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دی اور کہا کہ میں نے اس سے جماع نہیں کیا تو اس کے لئے رجوع کا حق نہیں۔

مگر دوسری صورت میں وہ وطی نہ کرنے کا اقرار کر چکا ہے اس لئے وہ رجوع کا مستحق نہیں ہوگا کیونکہ رجوع ایسی طلاق کے بعد ہوتا ہے جس سے پہلے وطی ہو چکی ہو اور خلوت صحیحہ کے ساتھ مہر واجب ہو جاتا ہے۔

اگر آدمی نے اپنی بیوی سے کہا جب تو بچہ جنے گی تو تجھے طلاق۔ پس اس نے بچہ جنا۔ پھر وہ حاملہ ہوگئی اور دوسرا بچہ دوسرے حمل سے جنا تو یہ رجوع ہے۔

مطلقہ رجعیہ کو چاہئے کہ وہ خاوند کے جس گھر میں عدت گزار رہی ہو اس میں زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کے ساتھ رہے۔ اور خاوند کا اگر رجوع کا ارادہ نہ ہو تو اس کیلئے مستحب ہے کہ عورت کے پاس بغیر اجازت نہ جائے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ برہنہ حالت میں خاوند کی اس پر نظر پڑ جائے اور رجوع ثابت ہو جائے۔ پھر وہ اس کو طلاق دے دے اور عورت کو لمبی عدت گزارنی پڑے۔

طلاق بائنہ

آدمی مطلقہ بائنہ سے جسے تین سے کم طلاقیں ہوئی ہوں دوران عدت اور بعد از عدت شادی کر سکتا ہے، کیونکہ حلت محل باقی ہے اور یہ تیسری طلاق سے ختم ہوتی ہے اور تیسری طلاق نہیں

[۱] [الآثار:۱۳۰] [۲] [الآثار:۱۳۳]

پائی گئی۔ لیکن یہ شادی بیوی کی اجازت اور گواہوں کی موجودگی میں نئے عقد اور نئے مہر کیساتھ ہوگی۔

طلاق بائنہ دینے والے کے علاوہ کسی شخص کو مطلقہ بائنہ سے دوران عدت شادی کرنا صحیح نہیں تا کہ نسب میں اشتباہ نہ پڑ سکے۔

مطلقہ ثلاث پہلے خاوند کیلئے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک کہ وہ کسی دوسرے آدمی سے نکاح صحیح نہ کرلے اور وہ اس سے جماع نہ کرلے اور پھر بائنہ نہ ہو جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ. [بقرہ:۲۳۰]

''پھر اگر اس عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد۔ جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا۔''

نکاح مطلق جب بولا جائے تو شریعت میں اس سے مراد نکاح صحیح ہوتا ہے۔ اگر مرد نے نکاح فاسد میں عورت کیساتھ دخول کیا تو وہ پہلے خاوند کیلئے حلال نہیں ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ''حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ''. ''جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا۔'' اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عورت کے ساتھ دخول ہو۔ کیونکہ نکاح شرعی وطی کا نام ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ''زوجاً'' کی وجہ سے۔ اور زوج کا نکاح وطی ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رفاعہ قرظی کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا کہ رفاعہ نے مجھے طلاق بتہ دی۔ اس کے بعد میں نے عبدالرحمٰن بن قرظی سے نکاح کیا۔ اس کے پاس تو صرف کپڑے کی جھالر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا شاید تو چاہتی ہے کہ تو رفاعہ کی طرف لوٹ جائے تو اس وقت تک اس کی طرف نہیں لوٹ سکتی جب تک کہ وہ (عبدالرحمٰن) تیرا مزہ نہ چکھ لے اور تو اس کا مزہ نہ چکھ لے۔[1]

لفظ بتہ اس بات کا محتمل ہے کہ وہ تینوں طلاقیں ایک ہی دفع ہوئی ہوں یا الگ الگ ہوئی ہوں اور اس میں دخول شرط ہے۔ اور یہ کہ محلل ایسا ہو کہ اس کی مثل لڑکے جماع کرتے ہوں خواہ وہ مراہق ہو یا بالغ۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ اتنا چھوٹا ہو کہ دخول پر قادر نہ ہو۔

اگر آدمی نے حلالہ کی شرط کے ساتھ عورت سے شادی کی تو یہ مکروہ ہے اور وہ پہلے خاوند کیلئے حلال ہو جائے گی جبکہ یہ شرط لغو ہو جائے گی۔

---

[1] [بخاری مع عینی:۲۰/۲۳۷]

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے لعن اللّٰہ المحلل و المحلل لہٗ اللہ تعالیٰ حلالہ کرنے والے اور جس کیلئے حلالہ کیا گیا ہو اس پر لعنت بھیجتے ہیں''

نبی کریم ﷺ نے چونکہ اس کا نام محلل رکھا ہے لہٰذا نکاح صحیح ہوگا اور شرط لغو ہوگی۔ اور وہ پہلے خاوند کیلئے حلال ہو جائے گی۔ تاہم یہ حدیث مذکورہ کی وجہ سے مکروہ ہے۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نکاح فاسد ہے اور نکاح کے فساد کی وجہ سے وہ پہلے خاوند کیلئے حلال نہیں ہوگی۔ اور اس میں فساد یہ ہے کہ یہ نکاح معرفت کی طرح ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشروط جواز کے پائے جانے کی وجہ سے نکاح درست ہے، لیکن وہ پہلے خاوند کیلئے حلال نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس نے اس کام کو مقدم کیا ہے جس کو شریعت نے موخر کیا۔ (تو عورت کی حلت کو روک کر اسے سزا دی جائے گی)

دوسرا خاوند تین سے کم طلاقوں کو ختم کر دیتا ہے۔ جب خاوند نے بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں اور اس نے عدت گزرنے کے بعد کسی دوسرے آدمی سے شادی کر لی اور اس نے اس کے ساتھ دخول کر لیا پھر اسے طلاق دے دی اور اس عورت کی عدت گزر گئی پھر اس نے پہلے خاوند سے شادی کی تو یہ اس کی طرف تین طلاقوں کے ساتھ لوٹے گی اور دوسرا خاوند ایک یا دو طلاقوں کو ختم کر دے گا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب خاوند نے بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں پھر اس نے کسی دوسرے آدمی سے نکاح کر لیا اور اس نے اس کے ساتھ جماع کیا پھر اسے چھوڑ دیا، اور اس عورت نے پہلے خاوند کیساتھ شادی کر لی تو وہ اس کے پاس تین طلاقوں کے ساتھ آئیگی، اور دوسرا خاوند ایک یا دو طلاقوں کو ختم کر دے گا۔ اور اگر دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ دخول نہیں کیا تو وہ پہلے خاوند کے پاس باقی ماندہ طلاقوں کے ساتھ لوٹے گی کہ اگر دوسرے خاوند نے اسے تین طلاقیں دے دیں اور اس نے کہا میری عدت گزر گئی ہے اور میں حلال ہو گئی ہوں۔ نیز یہ کہ (اس طلاق کے بعد گزری ہوئی) مدت بھی اس بات کا احتمال رکھتی ہو، اور پہلے خاوند کے خیال میں وہ سچی ہے تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔

طلاق کے متعلق اشارے کا حکم

گونگے کا ایسا اشارہ قابل قبول ہے جس کے ذریعے طلاق سمجھی جائے۔ اور گونگے کا لکھنا زبان سے بیان کرنے کی طرح ہے۔ چنانچہ اس کے اشارے سے احکام ثابت ہو جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت سوداء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا تھا کہ اللہ کہاں ہے؟ انہوں

نے آسمان کیطرف اشارہ کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إعتقها فإنها مؤمنة"[1] "اسے آزاد کردو یہ مومنہ ہے"، آپ ﷺ نے اشارے کے ذریعے اس کے اسلام کو جائز رکھا۔ جو مذہب کی بنیاد ہے۔ اور اس کے ایمان کا ایسے ہی حکم دیا جیسے اس بات کو زبان سے بولنے والے کے ایمان کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ گونگے کیلئے اشارہ تمام احکام میں معتبر ہو۔ حتیٰ کہ اس کا نکاح طلاق، بیع وشراء اور دیگر احکام جائز ہوں گے۔ بخلاف مقفل اللسان کے یعنی جس کی زبان بند ہوگئی ہو، کہ اس کا اشارہ غیر معتبر ہے کیونکہ اس کا اشارہ مراد کی خبر نہیں دیتا۔ الا یہ کہ اسے طویل عرصہ گزر جائے اور وہ گونگے کی طرح سمجھا جانے لگے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر زبان کا رکنا موت کے وقت تک باقی رہے تو اشارے کے ذریعے اس کے اقرار کو قبول کرلیا جائے گا اور اس پر گواہ بنانا جائز ہوگا۔ فقہا فرماتے ہیں کہ اکثر اسی پر فتویٰ ہے۔

احناف کے علاوہ دیگر علماء یہ فرماتے ہیں کہ ایسا اشارہ جس سے طلاق سمجھی جائے وہ گونگے اور صحیح شخص دونوں کا مقبول ہے۔ ان حضرات نے سابقہ حدیث سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ اشارہ تمام دیانات میں عام ہے۔ اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث دلیل کے طور پر پیش کی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسوؤں کی وجہ سے عذاب نہیں دیتے لیکن اس کی وجہ سے عذاب دیں گے اور آپ ﷺ نے اپنی زبان کی طرف اشارہ فرمایا۔[2]

اور محرم کیلئے شکار کے گوشت کے بارے میں آپ ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی نے اسے شکار پر تیار کیا تھا، یا شکار کی طرف اشارہ کیا تھا؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا نہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا، پھر تم کھالو![3]

---

[1] [شرح بخاری عینی: ۳۰/۲۸۷]　[2] [شرح بخاری عینی: ۳۰/۲۸۴]

[3] [شرح بخاری للعینی: ۳۰/۲۸۶]

﴿باب الایلاء﴾

ایلاء، کالغوی معنی قسم ہے اور شرعی معنی ہے کہ بیوی سے چار مہینے یا اس سے زیادہ وطی نہ کرنے کی قسم کھانا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ'' [البقرۃ:۲۲۶]

''جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے ان کیلئے مہلت ہے چار مہینوں کی۔''

پھر ان سے قسم کے پورا کرنے کا یا طلاق کا مطالبہ کیا جائے گا۔

ایلاء کی حقیقت

ایلاء کہتے ہیں اپنی بیوی سے چار ماہ یا اس سے زیادہ وطی نہ کرنے کی قسم کھانا۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: اللہ کی قسم میں چار ماہ تیرے قریب نہیں آؤں گا، یا کہے میں تیرے قریب نہیں آؤں گا۔ اور اس کو چار مہینے یا اس سے زیادہ کی نیت کے بعد چھوڑ دے تو یہ ایلاء ہے۔ اکثر اہل علم فرماتے ہیں کہ ایلاء چار ماہ سے کم میں نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اہل جاہلیت کا ایلاء ایک سال اور دو سال یا اس سے بھی زائد ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے چار ماہ کا وقت مقرر فرما دیا۔ اگر کسی کا ایلاء چار ماہ سے کم ہو تو وہ ایلاء نہیں ہوگا۔[1]

جب کسی آدمی نے یہ قسم کھائی کہ وہ ایک سال یا کم و بیش، اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔ پھر اس نے اس سے چار ماہ تک وطی نہ کی تو وہ ایلاء کیساتھ بائنہ ہو جائے گی۔

ایلاء کا حکم

اگر خاوند نے بیوی سے چار ماہ کے اندر وطی کر لی تو وہ کفارہ ادا کرے کیونکہ وہ اپنی قسم میں حانث ہو چکا ہے تاہم اس کا ایلاء باطل ہو جائے گا۔ اگر چار ماہ گزرنے تک اس نے وطی نہیں کی تو وہ عورت ایک طلاق کے ساتھ بائنہ ہو جائے گی۔ یہی قول حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت زید بن ثابت، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اسی قول کو کثیر تابعین

---

[1] [بیہقی: ۳۸۱/۷]

نے اختیار کیا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب فرمایا کرتے تھے جب چار ماہ گزر جائیں تو ایلاء طلاق ہے اور خاوند اس وقت تک اس سے رجوع کا حق رکھتا ہے جب تک کہ بیوی عدت میں ہے۔[1]

اگر اس نے چار ماہ کی قسم کھائی ہے تو مدت گزرتے ہی اس کی قسم پوری ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے ہمیشہ کی قسم کھائی ہے، مثلاً اپنی بیوی سے کہا: اللہ کی قسم میں ہمیشہ تیرے قریب نہیں آؤں گا اور چار ماہ گزر گئے تو بیوی ایک طلاق کے ساتھ بائنہ ہو جائے گی۔ اگر خاوند نے عود کیا اور دوبارہ اس سے شادی کی تو قسم کے باقی ہونے کی وجہ سے ایلاء لوٹ آئے گا۔ اور اگر اس نے قسم توڑ دی تو اس پر لازم ہے کہ کفارہ ادا کرے۔ اور اگر اس نے شادی کے بعد چار مہینے کے اندر وطی کر لی تو حانث ہو جائے گا اور اگر چار ماہ میں وطی نہ کی تو بیوی پر ایک اور طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے اس کے ساتھ پھر شادی کی تو پھر بھی معاملہ اسی طرح ہوگا۔ اور اگر اس نے اس عورت کے کسی اور مرد کے ساتھ شادی کرنے کے بعد شادی کی تو پھر ایلاء نہیں ہوگا۔

ایلاء کے صحیح ہونے کی شرط

ایلاء صرف اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ صحیح ہوتا ہے یا کسی ایسی چیز کے ساتھ جس سے یمین متحقق ہو جائے۔ اگر کسی نے حج کی قسم اٹھائی اور کہا اگر میں تیرے قریب آؤں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے حج ہے۔ یا پھر اللہ تعالیٰ کے لئے سو درہم صدقہ کرنا ہے تو شیخین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مولی ہوگا۔ بخلاف نماز اور جہاد کے، اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب اس نے آخری دو چیزوں کے ساتھ قسم اٹھائی تو مولی نہیں ہوگا۔

ذمی کے ایلاء کا حکم

ذمی کا ایلاء امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منعقد ہو جاتا ہے اور امام مالک اور صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منعقد نہیں ہوتا۔

ذمی کے اسلام لانے سے اس کا ایلاء ختم نہیں ہوتا۔

آزاد اور غلام کے ایلاء کا حکم

اگر کسی کی بیوی باندی ہو تو اس کے خاوند کیلئے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام ایلاء کی مدت دو ماہ ہے۔

---

[1] [بیہقی: ۷/ ۳۸۷]

عدت کی مدت

ایلاء شدہ عورت چار مہینوں کے بعد عدت شمار کرے گی اور طلاق بائنہ کے وقوع کے بعد مطلقہ کی عدت تین حیض ہیں۔

عاجز کیلئے ایلاء سے رجوع کا حکم

ہمارے اصحاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر مولی اپنے مرض یا بیوی کے مرض کی وجہ سے یا رتق (شرم گاہ کے آگے گوشت کے ٹکڑے آنے) کے سبب یا فاصلہ اور دوری کی وجہ سے وطی سے عاجز ہو تو اس کا رجوع یہ ہے کہ وہ کہے کہ میں نے اس سے رجوع کیا۔لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ وہ ایلاء کے وقت سے لے کر چار مہینے گزرنے تک عاجز ہوحتیٰ کہ اگر وہ ایلاء کے وقت قادر تھا۔پھر اس کے بعد وہ کسی مرض کی وجہ سے، یا بعدِ مسافت کی وجہ سے، یا رو کے جانے، یا قید، یا ڈر وغیرہ کی وجہ سے وطی سے عاجز آ گیا، یا اس نے جس وقت ایلاء کیا اس وقت وہ عاجز تھا پھر مدت ایلاء میں اس کا عجز زائل ہو گیا تو زبان کے ساتھ اس کا رجوع درست نہیں ہوگا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کی وجہ سے کہ ''فیئ'' جماع ہے۔حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''فیئ'' جماع ہے اگر اس کو مرض یا قید کا عذر ہے تو اس کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ زبان کے ساتھ رجوع کرے۔[1] اور زبان کے ساتھ رجوع کرنا یہ ہے کہ وہ کہے جب قادر ہوا تو رجوع کرلوں گا۔

ایلاء کی قسمیں

ایلاء کی دو قسمیں ہیں صریح اور کنایہ، ایلاءِ صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا مثلاً یہ کہنا کہ میں تیرے ساتھ وطی نہیں کروں گا۔یا میں تیرے قریب نہیں آؤں گا یا میں تجھ سے جماع نہیں کروں گا۔

ایلاء کنایہ نیت کا محتاج ہوتا ہے۔مثلاً بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے اوپر مردار کی طرح ہے۔اگر اس نے قسم کی نیت کی تو مولی ہوگا۔کیونکہ یہ بمنزلہ کنایہ کے ہے اور گویا اس نے کہا ہے تو میرے اوپر ایسے ہی حرام ہے جیسے مردار حرام ہے۔اور اگر اس نے اپنی بیوی سے کہا تو میرے اوپر حرام ہے۔اگر اس نے جھوٹ کا ارادہ کیا تو اس کی تصدیق کی جائے گی۔اور اگر اس نے طلاق کی نیت کی تو ایک طلاق بائنہ ہوگی، اور اگر تین کی نیت کی تو تین واقع ہو جائیں گی، اور اگر اس نے ظہار کا ارادہ کیا تو یہ ظہار ہوگا۔کیونکہ اس میں ایک طرح کی حرمت پائی جاتی ہے اور اگر اس نے

---

[1] بیہقی: ۳۸۰۱۷

اس کو خود پر حرام کرنے کا ارادہ کیا یا کسی بھی شئی کا ارادہ نہ کیا تو یہ ایلاء ہوگا۔ کیونکہ حلال چیز کو حرام ٹھہرانا قسم ہے اور یہی ایلاء کی اصل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے ہر وہ قسم جو جماع سے روکے ایلاء ہے [1]

متاخرین احناف نے لفظ تحریم کو طلاق کے معنی میں لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ لفظ تحریم سے بغیر نیت طلاق واقع ہو جائے گی۔ انہوں نے اس کے طلاق صریح میں کثرت استعمال اور عرف کی وجہ سے اسے طلاق صریح کے ساتھ ملحق کیا ہے۔

---

[1] [بیہقی: ۳۸۱/۷]

﴿باب الخلع﴾

خلع بالفتح (یعنی خَلَع) کا لغوی ہے کپڑے جوتے وغیرہ اتارنا۔ چونکہ عورت مرد کا لباس ہے لہٰذا خلع کو خلع کہا جاتا ہے۔

اگر عورت نے کچھ مال کے عوض خلع چاہا اور اور خاوند اس پر راضی ہو گیا تو طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی۔ اور عورت کے ذمہ میں مال لازم ہو جائے گا۔ اب خاوند عورت کی رضا مندی یا بغیر رضا کے خلع ختم نہیں کرسکتا۔ مگر عقد جدید اور مہر جدید کے ساتھ ایسا کرنے کی اجازت ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فيما افْتَدَتْ بِهٖ" [بقرہ:۲۲۹]

"پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جائے"

خلع میں طلاق کا حکم

جو فرقت لفظ خلع یا طلاق علی مال کے ساتھ واقع ہو وہ طلاق بائنہ ہے۔ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ خلع طلاق بائنہ ہے۔[1]

اور یہی قول حضرت حسن بصری، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت عطاء بن السائب، حضرت شریح، حضرت شعبی، حضرت مکحول، امام زہری، حضرت سفیان ثوری اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا ہے۔ یہی امام مالک، امام اوزاعی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا صحیح ترین قول ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلع کو طلاق قرار دیا ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دوسرے قول میں اس طرف گئے ہیں کہ خلع فسخ نکاح ہے طلاق نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت حبیبہ بنت سہل رضی اللہ عنہا نے حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے شادی کی اور ثابت نے حبیبہ رضی اللہ عنہا کو دو باغ مہر میں دیئے۔ ان دونوں کے درمیان

[1] شرح ابی داؤد للخطابی: ۲۵۵/۱۳

اختلاف ہوا۔ حضرت ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حبیبہ رحمۃ اللہ علیہا کو اتنا مارا کہ ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس فجر کی نماز کے وقت آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں کھڑی ہو گئیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پاس آئے تو اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے پناہ مانگنے کا مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تو کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا میں حبیبہ بنت سہل ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں تیرا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا اس نے مجھے مارا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثابت بن قیس بن شماس کو بلایا۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے درمیان ہونے والے واقعے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تو نے اسے کیا دیا تھا؟ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کھجوروں کے دو باغ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اپنا بعض مال لے لے اور بعض اس کے لئے چھوڑ دے۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ کے رسول کیا یہ درست ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں، حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے ان دونوں باغوں میں سے ایک باغ لے لیا اور اس سے جدائی اختیار کر لی۔ پھر ان کے ساتھ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے شادی کی اور انہیں لے کر شام چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔[1]

اگر زیادتی اور نفرت مرد کی طرف سے ہو تو اس کے لئے عورت سے کچھ بھی لینا مکروہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا" [النسا:۲۰]۔ "اور اگر تم بدلنا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو اور دے چکے ہو ایک کو بہت سا مال تو مت پھیر لو اس میں سے کچھ۔"

ہم نے اس کو نصِ اول پر عمل کرتے ہوئے کراہت پر محمول کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ" [البقرہ:۲۲۹]

"پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم۔"

اور اگر نفرت اور زیادتی عورت کی طرف سے ہو تو مرد کیلئے مہر سے زیادہ لینا مکروہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جمیلہ بنت سلول نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں اور کہنے لگیں اللہ کی قسم! ثابت نے مجھ پر دین یا اخلاق کے بارے میں سختی (ناراضگی) نہیں کی۔ اور میں اسلام میں کفر کو پسند کرتی میں تو ان کا غصہ برداشت نہیں کر سکتی۔

---

[1] [بیہقی: ۷/۳۱۵]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اتر دین علیه حدیقته تم اس کا باغ اسے لوٹا سکتی ہو؟ انہوں نے کہا ہاں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ثابت سے فرمایا کہ اپنا باغ اس سے لے لو اور اس سے زائد کچھ نہ لو۔[1]

اگر خاوند عورت کو دیئے گئے مہر سے زیادہ اس سے لے تو اطلاق آیت کے سبب اس کیلئے جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ

[البقرة:۲۲۹]

''پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم، تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جائے۔''

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری بہن نے اپنے شوہر سے خلع کا ارادہ کیا۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ آپ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ ﷺ سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم ان کا باغ واپس کر دو وہ تمہیں طلاق دے دیں گے۔ انہوں نے کہا ہاں میں تو زیادہ بھی دوں گی۔ آنحضرت ﷺ نے دوبارہ یہی ارشاد فرمایا۔ انہوں نے یہی جواب دیا۔ آنحضرت ﷺ نے پھر یہی فرمایا۔ انہوں نے پھر یہی جواب دیا پھر آنحضرت ﷺ نے ان کے درمیان خلع کر دیا اور انہوں نے باغ بھی واپس کر دیا اور مزید بھی دیدیا۔[2] اگر بیوی نے شوہر سے کہا جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے اس پر مجھ سے خلع کر لے اور خاوند نے اسے قبول کر لیا لیکن بیوی کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا تو عورت پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر بیوی نے شوہر سے کہا جو کچھ میرے گھر میں ہے اس پر مجھ سے خلع کر لے مرد نے اسے قبول کر لیا اور عورت کے گھر میں کچھ نہ تھا تو بھی اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا کیونکہ دونوں صورتوں میں نہ تو اس نے مال بیان کیا ہے اور نہ دھوکہ دیا ہے۔

اگر بیوی نے شوہر سے کہا جو مال میرے ہاتھ میں ہے اس پر مجھ سے خلع کر لے مرد نے اس بات کو قبول کر لیا لیکن اس کے ہاتھ میں مال نہیں تھا، اسی طرح اگر بیوی نے خاوند سے کہا میرے گھر میں جو متاع موجود ہے اس پر مجھ سے خلع کر لو۔ مرد نے اسے قبول کر لیا لیکن اس کے گھر میں کچھ نہیں تھا تو ان دونوں صورتوں میں وہ خاوند کو مہر لوٹائے گی کیونکہ اس نے خاوند کو دھوکہ دیا ہے اور مال کا طمع دلایا ہے پس اس کے ذمہ مہر واجب ہوگا۔

---

[1] [ابن ماجہ:۱/۶۶۳] [2] [بیہقی:۷/۳۱۴]

اگر مرد نے بیوی سے مہر کے بدلہ میں خلع کیا کہ جو مہر میرے ذمہ ہے اس پر خلع کرلو اور عورت کا مہر مرد کے ذمہ باقی نہیں تھا اور عورت نے اس کو قبول کرلیا تو عورت پر مرد کا مہر لوٹانا لازم ہوگا اور اگر خاوند کو اس بات کا علم ہو کہ اس پر عورت کا کوئی مہر باقی نہیں یا عورت کے گھر میں کوئی سامان نہیں تو عورت پر کچھ لازم نہیں ہوگا۔ اگر مرد نے اپنی بالغہ بیٹی کا خلع اس کے مال کے بدلہ میں کردیا تو معاملہ اس کے قبول کرنے پر موقوف ہوگا کیونکہ اس کو بیٹی پر ولایت حاصل نہیں ہے لیکن اگر وہ مال کا ضامن ہوا تو مال اس کے ذمہ لازم ہوگا۔

بیمار کا خلع

اگر بیمار بیوی نے شوہر سے خلع کیا اور عدت پوری ہونے کے بعد اپنے مرض میں فوت ہوگئی، یا دخول سے پہلے مرگئی تو بدل خلع اس کے ثلث مال میں سے خاوند کو دیا جائے اور اگر وہ عدت میں فوت ہوگئی تو اس کے خاوند کو مہر اور میراث میں سے اقل ملے گا، اگر وہ ثلث میں سے نکلے۔ اور اگر ثلث میں سے نہ نکلے تو خاوند کو میراث اور ثلث میں سے اقل ملے گا۔

﴿ظہار﴾

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُکَ فِيْ زَوْجِهَا.......... فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا" [المجادلہ: ۱/۴]

"سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور شکایت کرتی تھی اللہ کے آگے، اور سنتا تھا سوال و جواب تم دونوں کا بے شک اللہ سنتا ہے دیکھتا ہے۔ جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں تم میں سے اپنی عورتوں کو وہ نہیں ہوجاتیں ان کی مائیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا۔ اور وہ بولتے ہیں ایک ناپسند بات اور جھوٹی۔ اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔ اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورتوں کو پھر کرنا چاہیں وہی کام جس کو کہا ہے تو آزاد کرنا چاہئے ایک بردہ پہلے اس سے کہ آپس میں ہاتھ لگائیں، اس سے تم کو نصیحت ہوگی اور اللہ خبر رکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ پھر جو کوئی نہ پائے تو

روزے ہیں دو مہینے کے لگاتار پہلے اس سے کہ آپس میں چھوئیں پھر جو کوئی یہ نہ کرسکے تو کھانا دینا ہے ساٹھ محتاجوں کا۔''

ان آیات کے شان نزول میں حضرت ابوعمر بن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آیات بالا میں مذکورہ عورت کے نام ونسب میں اختلاف ہے۔ صحیح ترین قول یہی ہے کہ یہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ بن اصرم ہیں اور آپ رضی اللہ عنہا کے خاوند حضرت اوس بن الصامت بن قیس بن اصرم ہیں۔ ان آیات کی وجہ نزول یہ ہے کہ حضرت خولہ بنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک لحیم شحیم اور موٹی خاتون تھیں۔ ایک روز آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سجدہ میں تھیں کہ آپ کے کولہوں پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خاوند کی نظر پڑی۔ نماز سے فراغت کے بعد انہوں نے آپؓ کو بلایا لیکن آپؓ نے انکار کر دیا۔ آپؓ کے خاوند حضرت اوسؓ عورتوں کے بارہ میں جلد باز تھے۔[1] لہٰذا بیوی کا انکار سن کر انہوں نے کہا: انت علی کظھر امی تم مجھ پر میری والدہ کی پیٹھ کی طرح ہو۔ لیکن پھر انہیں یہ کہنے پر ندامت ہوتی۔

ایلاء اور ظہار زمانہ جاہلیت میں طلاق تھے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی سے کہنے لگے میرے خیال کے مطابق تو تم مجھ پر حرام ہو چکی ہو۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں: یارسول اللہ! میرے خاوند حضرت اوس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے اس وقت شادی کی جب میں جوان اور مالدار تھی۔ انہوں نے میرا مال ختم کر دیا، میں بھی بوڑھی ہو گئی۔ میرے اہل خانہ بھی مجھ سے جدا ہو گئے۔ انہوں نے اب مجھ سے ظہار کر لیا لیکن وہ نادم ہیں، کیا اب وہ اور میں اکٹھے رہ سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس پر حرام ہو چکی ہو۔ وہ کہنے لگیں: یارسول اللہ! انہوں نے طلاق کا نام تک نہیں لیا، وہ میرے بچوں کے باپ ہیں اور مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا: تم اس پر حرام ہو چکی ہو۔ وہ پھر کہنے لگیں: میں اپنی ناداری اور تنہائی کے بارہ میں اللہ سے فریاد کرتی ہوں۔ میں ایک عرصہ تک ان کیساتھ رہی اور میرے بطن سے ان کی بہت سی اولاد پیدا ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تم اس پر حرام ہو چکی ہو، میں تمہارے بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ بار بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کرتی رہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار فرماتے رہے تم اس پر حرام ہو چکی ہو۔ بالآخر وہ چیخ و پکار پر اتر آئیں اور کہنے لگیں، میں اپنی وفاداری اور سخت احوال کی اللہ سے فریاد کرتی ہوں، اے اللہ! اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر نازل فرما! یہ زمانہء اسلام کا پہلا ظہار تھا۔ اس موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ قد

---

[1] [معالم السنن: ۲۵۴/۳]

سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا ''سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں۔''

آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اپنے خاوند کو بلاؤ! انہوں نے اپنے خاوند کو بلایا، آپ ﷺ نے انہیں یہ آیات پڑھ کر سنائیں اور فرمایا: کیا تم غلام آزاد کر سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے، یا رسول اللہ! غلام تو بہت مہنگا ہے۔ میرے پاس تو بہت کم مال ہے۔ اس طرح تو میرا سارا مال ختم ہو جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھ سکتے ہو؟ وہ کہنے لگے: واللہ یا رسول اللہ! اگر میں دن میں تین بار نہ کھاؤں تو میری بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس طرح تو میری قوت بصارت میں بہت کمی ہو جائیگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! نہیں! الا یہ کہ آپ میری مدد فرما دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں پندرہ صاع تک تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اس طرح ان کا معاملہ حل ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے الذین یظھرون منکم من نسائھم[1]

حدیث بالا کا یہ مطلب نہیں کہ پندرہ صاع مکمل کفارہ کیلئے کافی ہو گئے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فی الوقت انہوں نے یہ صدقہ کر دیا اور باقی ان کے ذمے دین ہو گیا تھا۔ کہ جب میسر ہوا ادا کر دیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حدیث مظاہر ذکر کی ہے اس میں یہ وسق کا لفظ مذکور ہے اور وسق ساٹھ صاع کو کہتے ہیں۔ انہوں نے عرق کا بھی لفظ ذکر فرمایا ہے جو تیس صاع کو کہتے ہیں۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات ذکر کی ہے۔[2]

اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت خولہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: تمہارے خاوند غلام آزاد کر دیں۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: وہ غلام نہیں خرید سکتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ دو مہینے مسلسل روزے رکھ لیں حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ بوڑھے ہیں وہ تو روزے نہیں رکھ سکتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دیں۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ان کے پاس تو صدقہ کیلئے کچھ بھی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں کھجور کا ایک عرق انہیں دیدوں گا۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ایک عرق انہیں میں دیدوں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بہت اچھا! جاؤ! ان کی طرف سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو اور اپنے چچا زاد کے پاس واپس چلی جاؤ! عرق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔[3]

---

[1] [شرح البخاری للعینی: ۲۰/۲۸۱] [2] [معالم السنن: ۳/۲۵۰] [3] [بیہقی: ۷/۳۹۱]

ظہار کی صورت

ظہار کہتے ہیں کہ اپنی بیوی کو یا اس کے ایسے عضو کو جس سے پورا بدن مراد لیا جا سکے کسی ایسی عورت کے، جس کے ساتھ ہمیشہ نکاح حرام ہے، ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دینا جسے دیکھنا حرام ہے جیسے پیٹھ، ران، پیٹ اور شرم گاہ۔

ظہار کے الفاظ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) صریح جیسے انت علی کظھر امی یا انت عندی کظھر امی. (۲) کنایہ جیسے انت علی کامی یا انت علی مثل امی وغیرھما کنایہ میں نیت معتبر ہے۔ اگر ظہار کی نیت ہو تو ظہار ہوگا۔ اگر نیت نہ ہو تو ظہار نہیں ہوگا اور اگر طلاق کی نیت ہو تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوگی۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ ظہار ہی ہے۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر حالت غضب میں ہو تو ظہار ہے اروا اگر اس سے تحریم کی نیت ہو تو ایلاء ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ظہار ہے کیونکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے ان قربتک فانت علی کظھر امی ''اگر میں تمہارے قریب جاؤں تو تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو'' تو اگر یہ اپنی بیوی کے قریب جائے گا تو ظہار ہے اور اگر اس کے قریب نہیں جاتا تو ایلاء ہے۔[1]

اگر محرم کے ساتھ تشبیہ دیں تو ظہار ہوتا ہے

ظہار صرف اس صورت میں متحقق ہوتا ہے جب کسی ایسی عورت کیساتھ تشبیہ دی جائے جس سے نکاح کبھی بھی کسی بھی صورت جائز نہ ہو۔ اگر کسی ایسی عورت کے ساتھ ظہار کیا جس سے کسی وقت نکاح صحیح ہو تو یہ ظہار نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی غیر محرم کے ساتھ تشبیہ دی تو بھی ظہار نہیں ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ وہ امام حماد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے انت علی کظھر امرأۃ مَحرَم ''تم مجھ پر محرم عورت کی پیٹھ کی طرح ہو'' تو یہ ظہار ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے انت علی کظھر امرأۃ لیست بذات مَحْرَم ''تم مجھ پر غیر محرم کی پیٹھ کی طرح ہو'' یہ ظہار نہیں ہے۔[2] یہی امام شافعیؒ کا صحیح ترین قول اور یہی امام عطاؒ، امام حسنؒ اور امام شعبیؒ کا قول ہے۔

[1] [الآثار: ۱۵۰] [2] [الآثار: ۱۵۰]

کس کا ظہار صحیح ہے اور کس کا غلط؟

جس شخص کی طلاق صحیح ہے اس کا ظہار بھی صحیح ہے۔ خواہ آزاد ہو یا غلام، مسلم ہو خواہ ذمی، دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو اور جماع پر قادر ہو یا قادر نہ ہو۔ اسی طرح ظہار ہر بیوی سے صحیح ہے۔ چھوٹی ہو یا بڑی۔ عاقلہ ہو یا مجنونہ، تندرست ہو یا رتقاء اور محرمہ ہو یا غیر محرمہ۔

کفارۂ ظہار

کفارۂ ظہار یہ ہے کہ وطی سے پہلے ایک غلام آزاد کیا جائے۔ وہ غلام خواہ مذکر ہو یا مؤنث، چھوٹا ہو یا بڑا اور مسلمان ہو یا کافر۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں رقبۃ کو مطلقاً ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے فتحریر رقبة ''تو آزاد کرنا چاہئے ایک بردہ''[1] لہٰذا رقبۃ میں صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ سلیمہ ہو معیبہ نہ ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجنوں کا عتق صحیح نہیں ہے۔ اور غلام کفارہ ظہار میں صرف روزے رکھے کیونکہ وہ اعتاق اور اطعام دونوں سے عاجز ہے اس لئے کہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ حضرت ابراہیم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر کوئی غلام اپنی بیوی سے ظہار کرلے تو اسے دو مہینے روزے رکھنے ہونگے، اس کی جانب سے تحریر یا اطعام صحیح نہیں ہے۔[2]

کفارہ کی کئی انواع ہیں سب سے پہلے تو یہ ہے کہ غلام آزاد کرے۔ اگر اس سے عاجز آجائے تو دو مہینے مسلسل روزے رکھے کہ درمیان میں ماہ رمضان اور ایام منہیہ ایام عید وایام تشریق نہ آئیں۔ اگر ان دو ماہ کے دوران وطی کرلی خواہ دن میں یا رات میں، بھول کر یا دانستہ تو روزے دوبارہ شروع سے رکھنے ہونگے۔ اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ من قبل ان یتماسا. ''پہلے اس سے کہ آپس میں ہاتھ لگائیں''[3] امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر رات کو دانستہ یا دن میں بھول کر جماع کیا تو دوبارہ نئے سرے سے شروع نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ اس طرح تتابع پر اثر نہیں پڑتا حتیٰ کہ روزہ بھی فاسد نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نص میں شرط یہ ہے کہ روزے تلامس سے پہلے ہوں، لہٰذا یہ روزے تلامس سے معدوم متصور ہونگے پس دوبارہ از سرنو شروع کرنے ہونگے۔

اور اگر مظاہر روزے نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، گندم کا آدھا صاع یا

---

[1] [المجادلہ/۳] [2] [الآثار:۱۵۰] [3] [المجادلہ/۳]

کھجور کا ایک صاع، کیونکہ مسکین کی ضرورت اتنی مقدار سے پوری ہو سکتی ہے اس لئے صدقۃ الفطر کی مقدار کا اعتبار کیا گیا۔ یا پھر اتنی قیمت صدقہ کر دے۔ اور اگر مساکین کو صبح شام کا کھانا کھلا دے تو وہ بھی صحیح ہے۔ اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فاطعام ستین مسکینا ''تو کھانا دینا ہے ساٹھ محتاجوں کا''[1] اگر ایک مسکین کو ساٹھ دن کھانا کھلائے تو یہ بھی صحیح ہے۔ اگر ایک مسکین کو ایک ہی دن تمام دنوں کا کھانا دیدے تو ایک ہی دن کا ادا ہوگا اگر تین مسکینوں کو کھلا کر وطی کی تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تو وہ اپنا اطعام مکمل کرے جیسے وہ اگر اطعام سے پہلے وطی کر لیتا تو بھی اس پر ایک ہی اطعام واجب ہوتا اس لئے کہ یہ منصوص نہیں ہے کہ اطعام قبل المس ہو۔

کئی بار ظہار کرنے کا حکم

ظہار کا حکم یہ ہے کہ اس سے کفارہ ادا کرنے تک جماع اور اس کے دواعی حرام ہیں۔ اگر ایک مجلس میں ظہار کو مکرر کیا اور نیت تکرار کی تھی تو ایک کفارہ لازم ہوگا اور اگر تکرار کی نیت نہ ہو تو ہر ظہار کیلئے علیحدہ کفارہ ادا کرنا ہوگا خواہ ایک مجلس میں کئی بار ظہار کرے یا کئی مجالس میں جیسا کہ تکرار یمین کا حکم ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیویوں سے کہے انتن علی کظھر امی تو ہر ایک بیوی کیلئے علیحدہ کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی ہر بیوی سے ظہار کیا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی چار بیویوں سے کہے انتن علی کظھر امی تو اسے چار کفارے ادا کرنا ہونگے۔

مظاہر کیلئے اپنی بیوی کے ساتھ کیا کیا افعال جائز ہیں؟

مظاہر کیلئے جیسے کفارہ ادا کرنے سے پہلے وطی حرام ہے اسی طرح دواعی وطی بھی لمس وغیرہ حرام ہیں۔ اگر کفارہ ادا کرنے سے پہلے وطی یا تقبیل کی تو اللہ سے استغفار کرے جیسا کہ حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر مظاہر کفارہ ادا کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے وطی کر لے تو استغفار کرے اور کفارہ ادا کرنے تک دوبارہ ایسا نہ کرے۔[2] حضرت سلمہ بن صخر بیاضی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو مظاہر کفارہ ادا کرنے سے پہلے بیوی سے مل لے تو اس کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کفارۃ واحدۃ یعنی اس پر ایک ہی کفارہ ہے۔[3] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک مظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں

---

[1] [۴: مجادلۃ] [2] [الآثار: ۱۵۱] [3] [عارضۃ الاحوذی: ۱۷۵/۵]

نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور پھر کفارہ ادا کرنے سے پہلے اس کے پاس چلا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: وما حملک علی ذلک یرحمک اللہ. ''اللہ تم پر رحم کرے تم نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ کہنے لگا: چاند کی روشنی میں میری نظر بیوی کی پازیب پر پڑی (اور میں صبر نہ کرسکا) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لاتقربها حتیٰ تفعل ما أمر اللہ عز وجل، ''اس کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ کفارہ ادا نہ کردو۔''[1]

کفارۂ ظہار مظاہر کے ذمہ دین ہے

کفارہ ظہار مظاہر کے ذمہ دین ہے۔ دین کی دو قسمیں ہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حق اللہ کے بارہ میں اگر وصیت نہ کی جائے تو ساقط ہو جاتا ہے خواہ نماز ہو یا زکوٰۃ اور گناہ باقی رہتا ہے آخرت میں اس دین کا مطالبہ کیا جائے گا اور اگر وصیت کر دی جائے تو ایک تہائی ترکہ میں نافذ ہوگی۔ پس وارث کے ذمہ ہے کہ وہ ہر نماز کیلئے گندم کا آدھا صاع صدقہ کرے نیز وتر کیلئے بھی آدھا صاع صدقہ کیا جائیگا۔ اگر روزے ذمہ میں باقی ہوں تو وارث ایک روزہ کے بدلہ میں گندم کا آدھا صاع صدقہ کرے گا۔ اور اگر حج ذمہ میں باقی ہوتو وارث ایک تہائی ترکہ میں سے اس کی طرف سے حج بدل کرائے گا۔ نذور اور کفارات کا بھی یہی حکم ہے۔ تاہم دین العباد بہ ہر صورت مقدم ہے۔

ثم یعودون لما قالوا کی تفسیر

آیت بالا میں عود سے مراد وطی ہے۔ جیسے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر وطی کا عزم کرلیا تو یہ عود ہے لہٰذا کفارہ لازم ہو جائے گا۔ اگر وطی کا عزم نہ کیا تو عود نہیں ہے لہٰذا کفارہ بھی لازم نہ ہوگا۔ عورت کیلئے ضروری ہے کہ وہ خاوند کو خود سے روکے اس لئے کہ یہ حرام ہے اور بیوی بھی اپنے حق کے ایفاء کیلئے کفارہ کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور قول بھی ہے کہ عود سے امساک واصابۃ پر عزم مراد ہے۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

صاحبِ تلویح نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عود کا مطلب ہے کہ ظہار سے تحریم واجب ہو چکی جو کفارہ کے علاوہ ختم نہیں ہوسکتی۔ الا یہ کہ بیوی کی وفات تک ایک طویل مدت اس سے وطی نہ کرے۔ اس صورت میں اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے خواہ اس دوران اس نے وطی کا ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اگر مظاہر بیوی کو تین طلاقیں دیدے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے اور اگر دوسرے شخص کے ساتھ اس کے نکاح کے بعد پھر اس سے شادی کرلی تو ظہار کا حکم دوبارہ عود کرآئے

---

[1] [نسائی: ٦: ١٦٧]

گا اور کفارہ تک اس سے وطی صحیح نہ ہوگی، جیسے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ ظہار کے بعد اسے طلاق دیدے اور پھر عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کرے تو ظہار اپنی جگہ برقرار رہے گا۔[1]

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر مظاہر بیوی کے ساتھ وطی کرے پھر ان میں سے ایک وفات پا جائے تو مرد پر کفارہ نہیں ہے۔ اسی طرح جماع کے بعد بھی کفارہ نہیں ہے۔

لعان

لعان "لعن" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دور کرنا۔ لعان کو لعان اس لئے کہا جاتا ہے کہ لعان کرنے والا رحم سے دور ہوتا ہے۔ یا اس لئے کہ لعان کرنے والے ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ یا اس لئے بھی لعان کو لعان کہا جا سکتا ہے کہ اس عمل میں لعان کرنے والا پانچویں مرتبہ لعنت کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ لعان دو آزاد، عاقل، بالغ اور غیر محدود فی القذف مسلمانوں میں جاری ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم میں لفظ لعن اور لفظ غضب دونوں مذکور ہیں لیکن لعان کا لفظ اس لئے استعمال کیا کیونکہ لعن کا لفظ غضب کے لفظ پر مقدم ہے۔ یا اس لئے کہ مرد بہ نسبت عورت کے اس فعل میں قوی تر ہے کیونکہ اسی سے اس فعل کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس فعل میں چونکہ عورت کا زیادہ گناہ ہے اس لئے اس کیلئے غضب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلئے کہ اگر مرد جھوٹا ہو تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس نے تہمت لگائی ہے اور اگر عورت جھوٹی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ زانیہ ہے۔

لعان کو حفظ انساب اور زوجین سے ملامت دفع کرنے کیلئے شروع کیا گیا ہے اس کی صحت پر علمائے امت کا اجماع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لعنت وغضب کے ذکر پر امین کہا تھا۔

آیات لعان شعبان ۹ھ میں حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ یا حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے بارہ میں نازل ہوئیں۔ صحیح مسلم کی حدیث ہشام میں حضرت محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں اس بارے میں معلومات ہیں۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت شریک بن سحماء رضی اللہ عنہما پر تہمت لگائی۔ یہ اسلام میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے لعان کیا۔ لعان بیوی پر زنا کی تہمت یا بیٹے کے انکار سے واجب ہوتا ہے، بشرطیکہ میاں بیوی دونوں اہل شہادت ہوں اور بیوی اس کا مطالبہ

---

[1] [الآثار:۱۵۰]

بھی کرے اور اس کے قاذف پر حد بھی جاری ہوتی ہو۔ اگر مرد تہمت لگانے کے بعد لعان نہ کرے تو اسے قید کر دیا جائیگا جب تک کہ وہ لعان نہ کرے یا اپنے جھوٹ کا اقرار نہ کر لے۔ جب مرد لعان کر لے تو عورت پر بھی لعان واجب ہو جاتا ہے اور عورت کو بھی قید کر دیا جائے گا جب تک کہ لعان نہ کر لے یا زنا کا اقرار نہ کر لے۔ اگر شوہر اہل شہادت میں سے نہ ہو تو اس پر حد جاری ہوگی اور اگر خاوند اہل شہادت میں سے ہو لیکن بیوی ایسی نہ ہو کہ اس کے قاذف پر حد جاری ہوتی ہو تو نہ مرد پر حد جاری ہوگی اور نہ لعان ہوگا بلکہ تعزیر کی سزا دی جائیگی۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: گونگے کے قذف پر لعان نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ لعان کا تعلق صریح قذف کے ساتھ ہے۔ اسی لئے اشارۃً قذف کی وجہ سے اس کا حکم نہیں لگایا جائیگا۔ البتہ گونگے کی طلاق اشارے سے واقع ہو جاتی ہے۔ اور یہ فرق اس لئے ہے کہ صحت قذف کیلئے صراحتہً زنا کا ذکر ضروری ہے اور گونگے سے اس کا صراحتہً صدور ناممکن ہے۔ لہٰذا گونگا قاذف نہیں ہوگا اور حد شبہہ کی وجہ سے ساقط ہو جائے گی۔ یہی قذف اور طلاق میں لفظاً اور معنیً دونوں اعتبار سے فرق ہے۔ لفظ طلاق اپنے معنی کی ادائیگی میں صریح ہے جبکہ لفظ قذف سے اس وقت تک کچھ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس میں زنا کی تصریح نہ ہو۔

الغرض گونگے کی شہادت مردود ہے۔ اور چونکہ لعان بھی شہادت مع الیمین ہے لہٰذا گونگے کیلئے لعان کا حکم بھی نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ اگر گونگا اشارے سے طلاق دے تو اس کی طلاق قبول کر لی جائیگی کیونکہ طلاق کیلئے اس کے معنی ومفہوم کا اظہار ہی کافی ہے اور گونگے کا اشارہ ہی اس کے کلام کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر گونگا اپنے ہاتھ سے طلاق لکھ دے تو واقع ہو جاتی ہے، یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وشافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ انہوں نے گونگے کے اشارہ کے ساتھ وقوع طلاق، لعان اور قذف میں فرق فرمایا ہے۔

اشارۃً بیٹے کی نفی کا حکم

اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کی اشارۃً نفی کرے تو نہ اس پر حد ہے اور نہ ہی لعان، اس صورت میں بیٹا شوہر ہی کا ہوگا چاہے ان کے رنگ مختلف ہوں۔ محض رنگت مختلف ہونے کی وجہ سے بیٹے کی نفی صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: یا رسول اللہ! میرے ہاں ایک کالا بچہ پیدا ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس اونٹ ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا: اس کا رنگ کیا ہے؟ اس نے بتایا سرخ: آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس خاکی رنگ کے اونٹ بھی ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں: آپ ﷺ نے فرمایا: وہ کہاں سے آئے؟ وہ کہنے لگا: شاید ان کی نسل میں کبھی کسی اونٹ کا یہ رنگ ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہوسکتا ہے تمہارا بیٹا بھی اسی لئے کالا ہو۔[1] پھر آپ ﷺ نے اس شخص پر حد جاری نہیں فرمائی حالانکہ اس شخص نے اشارۃً اپنی بیوی پر تہمت لگائی تھی۔

لعان کی ابتداء کون کرے؟

لعان کی ابتداء شوہر کرے کیونکہ قرآن مقدس میں بھی پہلے شوہر کا لعان مذکور ہے۔ اگر عورت خاوند کے لعان سے پہلے لعان شروع کر دے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگرچہ سنت کے خلاف ہے لیکن یہ لعان منعقد ہو جائے گا، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ لعان صحیح نہیں ہے۔ عورت خاوند کے لعان کے بعد دوبارہ لعان کرے گی۔

لعان کا طریقہ یہ ہے کہ قاضی خاوند سے ابتداء کرے جو چار مرتبہ شہادت دے اور ہر بار کہے: اشهد باللّٰه انی لمن الصدقین فیمار میتک به من الزنی. میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے جو تم پر زنا کی تہمت لگائی ہے، میں اس میں سچا ہوں۔ اور پانچویں بار کہے: لعنة اللّٰه علیّ ان کنت من الکذبین فیمارمیتک به من الزنی. میں نے جو تم پر زنا کی تہمت لگائی ہے اگر میں اس میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ اور اگر بچے کی نفی کی ہو تو لعان میں کہے فیمار میتک به من نفی الولد اور اگر نفی ولد اور زنا دونوں کے بارہ میں لعان ہو تو کہے فیمار میتک به من الزنی و من نفی الولد. پھر عورت چار بار گواہی دے اور ہر بار کہے۔ اشد باللّٰه انه لمن الکذبین فیمار مانی به من الزنی. میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ اس نے جو مجھ پر زنا کی تہمت لگائی ہے وہ اس میں جھوٹا ہے۔ اور پانچویں بار کہے۔ غضب اللّٰه علی ان کان من الصدقین فیما رمانی به من الزنی. اس نے مجھ پر زنا کی جو تہمت لگائی ہے اگر وہ اس میں سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب اترے۔ اور اگر لعان نفی ولد سے متعلق ہو تو اس کا ذکر کیا جائے۔

لعان کرنے والوں میں جدائی

احناف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لعان کرنے والوں کے مابین جب تک قاضی جدائی واقع نہ کرے از خود جدائی واقع نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضرت نافع رضی اللہ عنہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت

[1] [عینی شرح بخاری: ۳۰/۲۹۴]

کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارک میں اپنی بیوی پر تہمت لگائی اور اپنے بیٹے کی نفی کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کو لعان کا حکم دیا۔ انہوں نے لعان کیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹا عورت کو دیدیا اوران دونوں میں علیحدگی کر دی۔[1]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث مبارکہ سے دلیل پکڑتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محض لعان سے جدائی نہیں ہوتی بلکہ اس کیلئے حکمِ حاکم بھی ضروری ہے۔ یہ حدیث ان حضرات کے خلاف حجت ہے جوفرماتے ہیں کہ محض لعان سے جدائی واقع ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعان کرنے والوں سے فرمایا: حسا بکما علی اللہ احد کما کاذب لاسبیل لک علیھا. اللہ تعالیٰ ہی تم سے حساب لیں گے، تم میں سے کوئی ایک تو جھوٹا ہے ہی۔ اب تمہیں اس بیوی پر کوئی اختیار نہیں ہے۔[2] راوی فرماتے ہیں: پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑکا عورت کی طرف منسوب کر دیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ پھر اس لڑکے کو والدہ کی طرف منسوب کر کے بلایا جاتا تھا۔ راوی فرماتے ہیں: پھر لعان کرنے والی خاتون کے بارے میں یہی طریقہ رائج ہوا کہ وہ بیٹے کی وراثت کی مالکہ بنتی تھی اور بیٹا اس کی وراثت کا مالک بنتا تھا۔[3]

اس بات پر اجماع امت ہے کہ لڑکے اور والدہ کی جانب سے اصحاب فروض میں توارث کا سلسلہ چلتا ہے اور جو مال اصحاب فروض سے بچ جائے وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بیت المال میں جمع کر دیا جائیگا۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک والدہ کے اکیلے ہونے کی صورت میں اس کو عصبہ ہونے کی وجہ سے تمام مال مل جائیگا۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ والدہ کے اکیلے ہونے کی صورت میں اصحاب فروض ہونے کی وجہ سے ایک تہائی مال مل جائیگا اور باقی رد کے طور پر مل جائیگا۔

اگر شوہر بیٹے کی نفی کر دے تو اس بیٹے کی نسبت لعان کرنے والی عورت کی طرف کر دی جائیگی خواہ شوہر وضع حمل سے قبل نفی کرے یا بعد الوضع۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص اوراس کی بیوی میں لعان کرایا۔ مرد نے لڑکے کی نفی کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں میں جدائی کر دی اور لڑکا عورت کی طرف منسوب کر دیا۔[4]

اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تیرا حمل مجھ سے نہیں ہے تو احناف کے نزدیک لعان نہیں ہے۔ کیونکہ قبل الولادۃ جنین پر حکم نہیں لگا کرتا اور حدیث مذکور بالا کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس

---

[1] [عینی شرح بخاری: ۱۹/۷۸]
[2] [بخاری بمعہ عینی: ۲۰/۳۰۰]
[3] [بخاری بمع عینی: ۲۰/۳۰۱]
[4] [بخاری بمع عینی: ۲۰/۲۹۶]

میں لعان قذف کے سبب تھا نہ کہ نفی ولد کے سبب۔

فقہائے کرام کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ بچے کی نفی کتنی مدت تک ہوسکتی ہے۔عین ولادت کے وقت نفی ہو یا ایک دو دن بعد تک یا چالیس دن کے اندر اندر یا وقت کی بالکل پابندی نہیں ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفاس کی اکثر مدت یعنی چالیس دن تک بچے کی نفی ہوسکتی ہے۔احناف کا قول یہ بھی ہے کہ ولادت کے ایک دو دن بعد تک نفی ہوسکتی ہے،اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بچے کی نفی ولادت کے فوراً بعد ہو ورنہ اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔

لعان مسجد میں کیا جائے

مسلمان حاکم کیلئے مناسب یہی ہے کہ جس سے بھی کسی بڑے کام پر قسم لے تو وہ قسم بڑی مسجد میں لے جیسا کہ خون کی قسم یا بڑے مال پر قسم۔اگر مدینہ منورہ میں قسم لے تو منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب قسم لے،اگر مکہ میں قسم لے تو رکن اور مقام کے درمیان قسم لے۔اگر بیت المقدس میں قسم لے تو مسجد میں چٹان کے قریب قسم لے۔اگر کسی اور شہر میں قسم لے تو جامع مسجد میں ایسی جگہ قسم لے جہاں قسم اٹھانا زیادہ عظیم ہو۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی لعان کرنے والوں سے مسجد میں قسمیں لی تھیں تا کہ وہ ان قسموں کو عظیم سمجھیں اور غلط آدمی حق کی طرف لوٹ آئے اور جھوٹی قسموں سے باز رہے۔اسی طرح لعان عصر کے بعد ہو کیونکہ اس وقت جھوٹی قسم اور زیادہ بری سمجھی جاتی ہے۔لیکن یہ تمام باتیں مستحب ہیں۔

لعان کرنے والے کا مہر

لعان کرنے والی عورت کا مہر اسے ملے گا،لعان کرنے والا بیوی سے مہر واپس نہیں لے سکتا،اگرچہ بیوی زنا کا اقرار کرلے۔اس لئے کہ اس پر اجماع ہے کہ مدخول بہا تمام مہر کی مستحق ہوتی ہے۔البتہ غیر مدخول بہا میں اختلاف ہے۔جمہور کا یہی قول ہے کہ دیگر قبل الدخول مطلقات کی طرح اسے بھی نصف مہر ملے گا۔حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا ایک آدمی نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی عجلان کے دو افراد کے درمیان تفریق کی اور فرمایا اللّٰہ یعلم ان احد کما کاذب فھل منکما تائب. ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے کون جھوٹا ہے کیا تم توبہ کرتے ہو؟'' انہوں نے

انکار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا **اللّٰہ یعلم ان احد کما کاذب فھل منکما تائب**؟ انہوں نے انکار کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا: **اللّٰہ یعلم ان احد کما کاذب فھل منکما تائب** انہوں نے انکار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں تفریق فرمادی۔ شوہر کہنے لگا، میرے مال کا کیا بنے گا؟ اسے جواب ملا: تمہیں مال واپس نہیں ملے گا۔ اگر تم سچے ہو تو تم دخول کر چکے ہو اور اگر تم جھوٹے ہو تو پھر تمہارا مہر واپس کرنے کا یہ مطالبہ بہت زیادہ برا ہے۔[1] کیونکہ اس طرح تم اس پر ظلم کر رہے ہو کہ اس کی عزت بھی داغدار کر رہے ہو اور جو مال اس نے صحیح طریقہ پر حاصل کیا تھا وہ بھی اس سے لینا چاہ رہے ہو۔

عدت

عدت ''عدّ یعُدّ'' کا مصدر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: **اذا تکاملت العدتان** جب اہل جنت واہل جہنم کی تعداد مکمل ہو جائے گی۔ طلاق یا خاوند کی موت کے بعد کے اس زمانہ کو جس میں عورت دوسرے نکاح سے رکی رہتی ہے عدت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ خود پر مقرر دنوں کو گنتی ہے اور دوبارہ نکاح کے وقت کی منتظر رہتی ہے۔

عدت کا لغوی معنی یہ ہے کہ وہ ''عدیعد'' کا مصدر ہے اور اس کا شرعی اصطلاحی معنی ہے: عورت کا اتنی مدت رکے رہنا جو زوال نکاح یا زوال شبہ نکاح کی وجہ سے عورت کے ذمہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ'' [البقرۃ:۲۲۸]

''اور طلاق والی عورت انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک''

اور ارشاد ہے:

''وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً یَّتربصن بِاَنْفُسِهِنَّ اربعة اشهر و عشرا'' [سورۃ البقرہ:۲۳۴]

''اور جو لوگ مر جاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہئے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن''

---

[1] [بخاری بمع عینی: ۲۹۹/۲۰]

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''والئی یئسن من المحیض من نساء کم ان ارتبتم فعد تہن ثلثة اشھر والئی لم یحضن واولت الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن''[الطلاق:۴]

''اور جو عورتیں ناامید ہوگئیں حیض سے تمہاری عورتوں میں اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت ہے تین مہینے اور ایسے ہی جن کو حیض نہیں آتا اور جن کے پیٹ میں بچہ ہے ان کی عدت یہ ہے کہ جن لیں پیٹ کا بچہ۔''

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فطلقوھن لعدتھن وأحصوا العدة.[طلاق:۱]

''طلاق دو ان کی عدت پر اور گنتے رہو عدت۔''

عدت کی اقسام

عدت کی تین قسمیں ہیں (۱) حیض (۲) مہینے (۳) وضع حمل۔ یہ تینوں اقسام کتاب اللہ میں مذکور ہیں۔

عدت کب واجب ہوتی ہے؟

عدت تین چیزوں سے واجب ہوتی ہے (۲) طلاق سے (۳) شوہر کی وفات سے۔ (۳) شوہر کے ترک وطی کے عزم سے کہ شوہر اپنی زبان سے کہہ دے میں نے اس سے وطی چھوڑ دی یا میں نے اس کا راستہ روک دیا۔ مدخولہ بیوی کے بارے میں محض وطی نہ کرنے کے عزم کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔

حیض والی آزاد عورت کی طلاق یا بعد الدخول فسخ نکاح کی عدت کامل تین حیض ہیں۔ جن کی ابتداء طلاق یا تفریق کے وقت سے ہوگی اور صغیرہ اور آئسہ کی عدت طلاق یا بعد الدخول فسخ میں تین مہینے ہیں۔

حیض والی عورت، صغیرہ اور آئسہ تینوں کی عدت شوہر کی وفات کے بعد چار مہینے اور دس دن ہے جو وفات ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر کسی خاتون کو اپنے خاوند کی وفات کا علم نہ ہو حتیٰ کہ عورت کے ایام گزر جائیں تو اس کی عدت مکمل ہو چکی۔

زوجین میں بغیر طلاق جدائی، جیسے بیوی اپنے شوہر کے بیٹے کے ساتھ وطی کرلے، اور فسخ کے ذریعے جدائی دونوں کا حکم وہی ہے جو طلاق کا حکم ہے۔ اس لئے کہ عدت تو یہ جانچنے کیلئے ہوتی ہے کہ اس کا رحم فارغ ہے یا نہیں ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے حیض سے۔ اسی لئے عدت ان دونوں کے درمیان تفریق ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے اور فرقت بالفسخ کی مثال جیسے کوئی لڑکی بالغ ہوئی اور اس نے خیار بلوغ کے سبب اپنا نکاح ختم کرلیا یا جیسے کسی عورت نے غیر کفو میں نکاح کیا اور ولی نے شادی پر اعتراض کر دیا۔ پس قاضی کو تفریق اور فسخ نکاح کا اختیار ہے۔ اور فسخ نکاح کی مثال جیسے کوئی شخص کسی عورت سے اس کی عدت کے دوران نکاح کرے اس صورت میں اس شخص کا نکاح فسخ کیا جائیگا اور ان دونوں میں تفریق کر دی جائے گی۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے دوران عدت نکاح کرلے اور پھر عورت کو تین حیض آجائیں تو وہ پہلے شوہر کیلئے بائنہ ہو جائیگی کیونکہ ان تین حیضوں سے اس کے پہلے شوہر کی عدت مکمل ہوتی ہے۔ عورت کے یہ حیض دوسرے شوہر کی عدت میں شمار نہیں ہونگے بلکہ اس کیلئے بعد میں مستقل عدت گزارنی پڑے گی۔ ایک شخص نے کسی عورت سے اس کی عدت کے دوران نکاح کرلیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں میں تفریق کر دی اور فرمایا: اس عورت کو مہر بھی دیا جائے گا کیونکہ وہ مرد اس عورت کی شرمگاہ کو حلال کر چکا ہے۔ اور عورت پہلے شوہر سے عدت مکمل کرے گی اور بعد میں دوسرے شوہر کی عدت مکمل کریگی۔[1]

لونڈی کی عدت اگر اسے حیض آتے ہوں تو دو حیض ہیں۔ اور وہ صغیرہ یا آئسہ ہو تو ڈیڑھ مہینہ ہے اور اگر عدت شوہر کی وفات کی وجہ سے ہو تو دو مہینے اور پانچ دن ہے۔

اور اگر کوئی عورت حاملہ ہو چاہے کوئی بھی ہو اس کی عدت وضع حمل ہے، ارشاد باری تعالیٰ کے عموم کی وجہ سے۔ ارشاد ہے **واولت الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن** ''اور جن کے پیٹ میں بچہ ہے ان کی عدت یہ ہے کہ جن لیں پیٹ کا بچہ''[2] خواہ عورت آزاد ہو یا باندی خواہ وہ عدت طلاق کی ہو یا وفات کی یا کسی اور کی۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ آثار میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر حمل گر جائے اور کچھ خلقت ظاہر ہو جائے تو عدت مکمل ہو جاتی ہے۔[3]

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک حمل گرنے کا اس وقت اعتبار کیا جائے گا جب اس کی کچھ خلقت بال، ناخن وغیرہ ظاہر ہو جائیں۔ اگر حمل گرا اور کچھ بھی خلقت ظاہر نہ ہوئی تو عدت مکمل نہ ہوگی۔

اگر کوئی شخص مرض وفات میں اپنی بیوی کو وراثت سے محروم کرنے کیلئے طلاق دیدے

---

۱ [بیہقی: ۷/۴۴۱] ۲ [الطلاق: ۴] ۳ [الآثار: ۱۴۴]

اور بیوی کی عدت کے دوران فوت ہو جائے تو اس کی عدت اب عدت وفات اور عدت طلاق میں سے احتیاطاً بعد الاجلین ہوگی۔ کہ عورت شوہر کی موت کے وقت سے چار مہینے دس دن تک رکی رہے۔ اگر اس دوران حیض نہ آئے تو بعد میں تین حیض تک عدت گزارے حتیٰ کہ اگر اس کا طہر ممتد ہو جائے تو اس کی عدت سن ایاس تک پہنچنے تک باقی رہے گی۔ البتہ اگر عورت کو طلاق رجعی دی گئی ہو تو بالاجماع اس کی عدت عدت وفات ہوگی۔

قرء کا معنیٰ

امام اصمعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''قرء'' بضم القاف ہے جبکہ امام ابوزید فرماتے ہیں بفتح القاف ہے اقرأت المرأۃ کا ترجمہ ہوتا ہے کہ عورت کے رحم میں پانی قرار پذیر ہو گیا اور قعدت المرأۃ ایام اقراء ھأ کا ترجمہ ہوتا ہے کہ عورت حیض کے دنوں میں بیٹھ گئی۔ امام ثعلب فرماتے ہیں کہ قرء وقت کو کہتے ہیں جو حیض اور طہر دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ نیز جب عورت حائضہ ہو یا طاہرہ ہو تو دونوں کیلئے اہل عرب کا محاورہ ہے۔ ''قرأت المرأۃ قرء ا.'' بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قرء اسماء مشترکہ میں سے ہے جبکہ بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ قرء حیض کیلئے حقیقۃً استعمال ہوتا ہے اور طہر کیلئے مجازاً۔

جو حضرات فرماتے ہیں کہ قرء کا معنیٰ حیض ہے ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت عبادۃ بن الصامتؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت معاذؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے صحابہ کرام اور حضرت سعید بن المسیبؒ حضرت علقمہؒ، حضرت اسودؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت عطاءؒ، حضرت طاؤسؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت عکرمہؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت قتادہؒ حضرت شعبیؒ اور حضرت مکحولؒ، جیسے تابعین اور حضرت امام نخعیؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ جیسے تبع تابعین شامل ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہؒ ان کے اصحاب کا قول ہے اور یہی صحیح ترین روایت میں امام احمدؒ کا قول ہے۔

اور جو حضرات فرماتے ہیں کہ قرء سے مراد طہر ہے ان میں حضرت عائشہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرت سالمؒ، حضرت قاسمؒ اور حضرت عروۃؒ حضرت سلیمان بن یسار، حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ، امام زہریؒ اور فقہائے سبعہ میں باقی حضرات جیسے تابعین شامل ہیں۔ یہی امام مالکؒ

،امام شافعیؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کا قول ہے۔
پہلی جماعت کہتی ہے کہ مطلقہ کیلئے اس وقت تک شادی صحیح نہیں ہے جب تک کہ وہ تیسرے حیض سے پاک نہ ہو جائے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ مطلقہ کا جب تیسرا حیض شروع ہو جائے تو اس کیلئے شادی صحیح ہے۔ جس طہر میں اسے طلاق ہوئی ہے خواہ اس میں سے صرف ایک دن بلکہ خواہ ایک ساعت ہی باقی ہو۔ اس تھوڑے سے وقت کو بھی عورت کے حق میں ایک طہر شمار کیا جائے گا۔

مطلقہ غیر مدخول بہا پر عدت نہیں ہے

طلاق قبل الدخول کی وجہ سے عدت لازم نہیں ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''فما لکم علیھن من عدة تعتدونھا'' [احزاب:۴۹]

''سوان پر تم کو حق نہیں عدت میں بٹھلانا کہ گنتی پوری کراؤ۔''

اگر آئسہ اور صغیرہ نے مہینوں کے مطابق عدت گزارنی شروع کی اور پھر مہینے کے دوران انہیں خون آ گیا تو وہ از سر نو عدت شروع کریں گی۔ آئسہ تو اس لئے دوبارہ عدت شروع کرے گی کہ حیض آنے سے معلوم ہوگیا کہ وہ آئسہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی عدت حیض ہے پس وہ ممتد الطہر کی طرح از سر نو عدت شمار کرے گی۔ اگر صغیرہ کو اس دوران خون آ جائے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی عدت میں مہینوں اور حیض دونوں کو جمع کرلیا جائے کیونکہ یہ خلاف اجماع ہے اور اب حیض آنے کی وجہ سے مہینوں کے مطابق عدت گزارنا بھی متعذر ہے، لہٰذا اب اسے اب از سر نو دوبارہ حیض کے اعتبار سے عدت گزارنی پڑے گی۔ یا اسے یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ مہینہ حیض کا خلیفہ ہے۔ جب مقصد حاصل ہونے سے پہلے اصل پر قدرت ہو جائے تو اصل پر عمل ضروری ہوتا ہے جیسا کہ اگر متیمم کو دوران نماز پانی مل جائے (تو اس کے لئے وضو ضروری ہے۔) اگر کسی عورت کو عدت میں ایک یا دو حیض آئیں اور پھر وہ آئسہ ہو جائے تو وہ از سر نو مہینوں سے عدت شروع کرے۔

عدت کی کم سے کم مدت

عدت کی کم سے کم مدت دو ماہ ہے جس میں تین حیض گزر سکتے ہیں۔ دس دن حیض، پندرہ دن طہر، پھر دس دن حیض پندرہ دن طہر اور پھر دس دن حیض۔ یہ ساٹھ دن بنتے ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔

اور اگر سنت پر عمل کرتے ہوئے طہر کے آغاز میں طلاق کا وقوع مانا جائے اور حیض کی متوسط مدت یعنی پانچ دن مراد لی جائے تو پندرہ دن طہر پانچ دن حیض، تین مرتبہ یوں بھی ساٹھ دن بنتے ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔

جبکہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عدت کی کم سے کم مدت انتالیس دن اور تین ساعات ہیں۔ اس لئے کہ وہ اقل مدت حیض یعنی تین دن کا اعتبار کرتے ہیں اور اقل طہر پندرہ دن ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر وقوع طلاق حیض سے ایک ساعت پہلے ہو تو تین دن حیض پندرہ دن طہر، پھر تین دن حیض پندرہ دن طہر اور پھر تین دن حیض یوں انتالیس دن مکمل ہو جاتے ہیں۔

ذوات الشہور کو مہینے کے آغاز اور وسط میں طلاق کا حکم

اگر آئسہ اور صغیرہ کو مہینہ کی پہلی تاریخ کو طلاق واقع ہو یا خاوند کی وفات مہینے کی پہلی تاریخ کو ہو تو بالا جماع چاند کے حساب سے مہینے شمار کئے جائیں گے۔ چاہے مہینے کے دن انتیس ہوں یا تیس اور اگر مہینے کے وسط میں طلاق ہو تو دونوں کا اعتبار ہوگا۔ طلاق میں نوے دن اور وفات میں ایک سوتیس دن مکمل کئے جائیں گے۔

معتدہ کو پیغام نکاح

معتدہ طلاق رجعی کو نہ صراحۃً پیغام نکاح درست ہے اور نہ ہی کنایۃً، کیونکہ تا حال نکاحِ اول قائم ہے۔ معتدۂ وفات کو دوران عدت پیغام نکاح مکروہ ہے تاہم اشارۃً ذکر صحیح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”ولا جناح علیکم فیما عرضتم به من خطبة النساء او اکننتم فی انفسکم علم الله انکم ستذکرونهن ولکن لا تواعدوهن سرا“ [البقرۃ:۲۳۵]

”اور کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ اشارہ میں کہو پیغام نکاح ان عورتوں کو یا پوشیدہ رکھو اپنے دل میں اللہ کو معلوم ہے کہ تم البتہ ان عورتوں کا ذکر کرو گے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر۔“

صراحۃً نکاح کا پیغام: جیسے یہ کہنا میں آپ سے نکاح کروں گا یا میں آپ سے شادی کروں گا۔ اشارۃً جیسے یہ کہنا کہ مجھے آپ کی جانب رغبت ہے۔ یا میری خواہش ہے کہ آپ سے شادی

ہو جائے یا اگر میری آپ کے ساتھ شادی ہوگئی تو میں آپ کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ رکھوں گا۔

اگر کوئی عورت دوران عدت نکاح کر لے اور دوسرا شوہر دخول کر لے تو بھی ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی لیکن ایسا کرنے سے پہلی عدت مکمل ہو گئی، لہٰذا اب وہ دوسری عدت شروع کرے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اگر عورت دوران عدت نکاح کرلے اور زوج ثانی خول کرلے تو بھی ان کے درمیان تفریق کر دی جائیگی۔ پہلی عدت مکمل ہو چکی اب دوسرے شوہر سے عدت گزارنی شروع کرے۔[1]

دوران عدت زیب وزینت اختیار کرنا

جو عورت نکاح صحیح کے بعد، وفات شوہر یا طلاق بائن کی وجہ سے عدت گزار رہی ہو، اگر وہ مسلمان اور بالغہ ہو۔ خواہ آزاد ہو یا لونڈی تو اس پر ضروری ہے کہ وہ خوشبو اور زینت کو ترک کرے۔ چونکہ اس کیلئے عدت میں نکاح حرام ہے اسی لئے اسے ایسی زینت اختیار کرنے سے بھی روکا گیا جو عورت اپنے خاوند کیلئے کرتی ہے۔ عورت پر دوران عدت اظہار افسوس اس لئے واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے نکاح کی نعمت چھین لی ہے اور اس کا وہ سہارا چھن گیا جو اس کے نان ونفقہ اور سکنی وغیرہ کا ذمہ دار تھا اور یہ طلاق بائن یا وفات شوہر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی لئے عورت اس دوران زیور نہیں پہن سکتی چونکہ اسے بھی زیب وزینت کیلئے پہنا جاتا ہے اور نہ ہی آنکھوں میں سرمہ لگا سکتی ہے۔ تاہم دوا کے طور پر سرمہ لگانے کی اجازت ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک خاتون آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگیں: یارسول اللہ! میری بیٹی کا شوہر وفات پا گیا ہے۔ اس کی آنکھیں دکھنی آتی ہوئی ہیں کیا اس میں سرمہ ڈال لے؟ آپ ﷺ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا نہیں۔[2]

حضرت ام حکیم بنت اسید رحمۃ اللہ علیہا اپنی والدہ سے روایت کرت ہیں کہ جب ان کے شوہر کی وفات ہوئی تو ان کی آنکھیں دکھنی آئیں۔ انہوں نے اثمد (سرمہ) ڈال لیا اور اپنی ایک باندی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجی کہ اثمد لگانے کے متعلق پوچھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر شدید ضرورت ہو تو لگایا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اور پھر فرمایا: جب ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو آنحضرت ﷺ میرے پاس تشریف لائے میں نے اپنی آنکھوں میں صبر لگایا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ام سلمہ! یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! صبر ہے۔ اس میں خوشبو نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے چہرہ تو حسین لگتا ہے تم رات کو لگایا کرو اور دن میں

---

[1] الآثار: ۱۴۲
[2] بیہقی: ۴۳۹/۷

دھوڑ الا کرو، تم نہ خوشبو لگاؤ اور نہ مہندی لگاؤ.....[1]

نکاح فاسد کی عدت میں ترک زینت نہیں ہے۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا یحل لامرأة تومن باللّٰہ والیوم الأخر ان تحدفوق ثلاث الا علی زوج فانھا لا تکتحل ولاتلبس ثوباً مصبوغاً. ''جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے تین دن سے زیادہ ترک زینت حلال نہیں ہے۔ الا یہ کہ خاوند کی وجہ سے چھوڑے۔ پھر وہ نہ سرمہ لگائے اور نہ رنگے ہوئے کپڑے پہنے'' اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ ''ولا تمس طیبا الا ادنی طھرھا اذاطھرت.'' ''اور وہ خوشبو بھی استعمال نہ کرے۔''[2]

معتدہ کا گھر سے نکلنا

طلاق بائنہ والی عورت اپنے گھر سے نہ دن کو نکلے اور نہ رات کو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ولا تخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن'' [الطلاق:۱]

''مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے اور وہ بھی نہ نکلیں۔''

عورت کا گھر سے نکلنا اس لئے بھی صحیح نہیں ہے کہ اس کا نفقہ شوہر کے ذمے ہے، جیسا کہ بیوی کی صورت میں تھا۔ لہٰذا اسے نکلنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر عورت اس شرط پر خلع کرے کہ اسے نفقہ نہیں دیا جائیگا تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ایسی عورت دن میں حصول معاش کیلئے نکل سکتی ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ایسی عورت بھی گھر سے نہیں نکل سکتی۔ یہی قول صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس نے خود ہی اپنا نفقہ ساقط کیا ہے۔ لہٰذا مختلعۃ علیہا کے حق میں یہ ابطال مؤثر نہ ہوگا۔ حضرت امام ابو یوسفؒ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ لاتخرجوھن کی تفسیر میں فرمایا: دوران عدت عورت کا گھر سے نکلنا فاحشہ مبینہ (واضح بے حیائی) ہے۔[3]

اور معتدہ وفات دن میں اور رات کے کچھ حصہ میں نکل سکتی ہے کیونکہ اس کا نفقہ کسی کے ذمہ نہیں ہے لہٰذا اسے حصول معاش کیلئے دن میں نکلنے کی اجازت ہے اور بعض اوقات چونکہ کام کرتے کرتے رات بھی آپڑتی ہے لہٰذا رات کے کچھ حصہ میں بھی خاتون گھر سے نکل سکتی ہے۔ ہاں اگر اس عورت کے نفقہ کا انتظام ہو تو پھر اس کیلئے گھر سے نکلنا درست نہیں ہے۔ تاہم اس کیلئے

[1] [بیہقی ۴۴۰/۷] [2] [بخاری: ۷۸/۳] [3] [الآثار: ۱۴۲]

ضروری ہے کہ رات گھر ہی میں گزارے کیونکہ رات کو باہر نکلنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ مطلقہ اپنے گھر سے بالکل نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس کی عدت پوری نہ ہو جائے۔ اور متوفی عنہا زوجہا کسی ضروری کام سے تو نکل سکتی ہے ورنہ نہیں تاہم رات گھر ہی میں گزارے۔

مطلقہ اور متوفی عنہا زوجہا اسی گھر میں ٹھہریں جس میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ من بیوتھن سے مراد وہی گھر ہیں جن میں وہ اقامت پذیر ہیں۔ اگر طلاق کے وقت وہ کسی اور گھر میں گئی ہوئی ہوں تو فوراً اپنے گھر آجائیں اور اپنے ہی گھر میں عدت گزاریں الا یہ کہ وہ گر جائے۔ یا اس گھر کا کرایہ ادا نہ کر سکتی ہو تو اس گھر سے منتقل ہو جائے۔ اگر عورت اپنا گھر چھوڑ کر نکل جائے تو جہاں چاہے منتقل ہو سکتی ہے۔ الا یہ کہ مطلقہ بطلاق بائن ہو۔ اگر مطلقہ بطلاق بائن ہو تو وہ وہیں ٹھہرے جہاں اس کا شوہر کہے۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے شوہر کو خطاب کر کے فرمایا ہے۔ "اسکنوھن" "تم ان کو رہائش دو" [الطلاق] اگر ورثا عورت کو اپنے گھر لے جائیں یا گھر کا مالک اسے گھر سے نکال دے تو عورت معذور ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابراہیمؒ سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر شہید ہوئے تو حضرت علی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو گھر لے آئے تھے جو شہادت کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دار الامارۃ میں رہائش پذیر تھیں۔[1]

اگر عورت کو طلاق بائنہ دیدی جائے یا تین طلاقیں دیدی جائیں تو میاں بیوی کا آپس میں پردہ ضروری ہے۔ مذکورہ بالا صورت میں اگر شوہر فاسق ہو تو پھر بیوی گھر چھوڑ کر کہیں اور اقامت پذیر ہو سکتی ہے لیکن پھر بھی بہتر یہی ہے کہ عورت تو اسی مکان میں رہے اور شوہر وہاں سے کہیں اور منتقل ہو جائے۔

مدت حمل

حمل کی اقل مدت چھ مہینے ہے۔ حضرت ابوحرب بن الاسود دیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کے رجم کا ارادہ کیا کیونکہ اس کے ہاں چھ مہینوں کے بعد ولادت ہو گئی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب علم ہوا تو انہوں نے فرمایا: اسے رجم نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ دریافت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ارشاد باری تعالیٰ ہے والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ "اور بچے والی عورتیں دودھ پلائیں

---

[1] [الآثار: ۱۴۳]

اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری کرے دودھ کی مدت'' [البقرۃ:۲۳۳]

نیز ارشاد ہے وحمله وفصله ثلثون شهرا ''اور حمل میں رہنا اس کا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے۔'' [احقاف:۱۵] ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ دو سال رضاعت، اور چھ ماہ مدت حمل ہے۔ لہٰذا اس عورت کو رجم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا پھر اس خاتون کے ہاں بچہ پیدا ہوا[1] اور اکثر مدت حمل دو سال ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ عورت کا حمل دو سال سے زیادہ نہیں رہ سکتا چاہے وہ چرخے کے گھومنے والے تکلے کی بہ قدر ہی ہو۔[2] اس چیز کا علم تو قیفاً ہی حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ عقل کو تو اس میں دخل ہے نہیں۔ اگر مطلقہ عدت مکمل ہونے کا اقرار کرلے اور پھر چھ مہینے کے اندر اندر اس کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے تو بچے کا نسب طلاق دینے والے سے ثابت ہو جائے گا اور بالیقین عدت کا جھوٹ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ یہی کہا جائیگا کہ عورت نے حمل کا اقرار نہیں کیا تھا اور اگر بچے کی پیدائش چھ مہینہ کے بعد ہو تو بچے کا نسب طلاق دینے والے سے ثابت نہیں ہوگا کیونکہ اب عورت کی اس بات کو جھٹلانا یقینی نہیں ہے کہ اس کی عدت مکمل ہو چکی تھی اور ہوسکتا ہے کہ یہ بچہ بعد کے حمل سے پیدا ہوا ہو۔ لہٰذا بچے کا نسب طلاق دینے والے سے ثابت نہیں ہوگا۔

مطلقہ رجعیہ کے بچے کا نسب ثابت ہو جائے گا اگر چہ دو سال کے بعد بچہ پیدا ہو۔ جب تک کہ وہ عدت ختم ہونے کا اقرار نہ کرلے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ شوہر نے عدت کے دوران وطی کرلی ہو جس سے حمل ٹھہر گیا ہو اور ہوسکتا ہے کہ یہ ممتدۃ الطہر ہو۔ اگر دو سال سے پہلے بچہ پیدا ہوا تو عورت کی عدت مکمل ہوگئی اور نسب ثابت ہوگیا لیکن اس سے مرد کا رجوع ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں ہی احتمال ہیں کہ حمل طلاق سے پہلے کا ہو یا بعد کا۔ اگر بچہ دو سال کے بعد پیدا ہوا تو مرد کا رجوع ثابت ہو جائے گا کیونکہ ظاہر ہے کہ حمل طلاق کے بعد کا ہے اور اس نے عدت کے دوران وطی کرلی تھی۔

مطلقہ بطلاق بائن اور متوفی عنہا زوجہا کا نسب دو سال سے پہلے تک ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ طلاق کے وقت حمل ہو چکا ہو لہٰذا احتیاطاً نسب ثابت ہو جائیگا۔ دو سال کے بعد اگر بچہ پیدا ہوا تو نسب ثابت نہیں ہوگا، الا یہ کہ مرد اس کا دعویٰ کرے کیونکہ ہمیں اس بات کا تو یقین ہے کہ حمل طلاق کے بعد ہوا ہے۔ اب اگر مرد خود دعویٰ کرتا ہے تو اس سے نسب ثابت ہو جائیگا اور کہا جائیگا کہ اس نے عدت کے شبہہ میں وطی کرلی تھی۔

---

[1] [بیہقی: ۴۴۳/۷]

[2] [بیہقی: ۴۴۳/۷]

معتدہ کے بچے کا نسب دو آدمیوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی یا حملِ ظاہر، یا خاوند کے اعتراف یا ورثاء کی تصدیق کے بغیر ثابت نہیں ہوتا۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت کی گواہی سے بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عدت کی وجہ سے فراش قائم ہے اور بیٹا خاوند ہی کا شمار ہوتا ہے اور فراش بھی نکاح کی طرح نسب کو ثابت کر دیتا ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب عورت نے وضع حمل کا اقرار کر لیا تو اس کی عدت ختم ہوگئی، اب جو چیز ختم ہو چکی اس کا اعتبار نہیں ہے۔ لہٰذا نسب کے اثبات کی ضرورت ہے جس کیلئے حجت کاملہ یعنی دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے۔ البتہ جب حمل ظاہر ہو اور خاوند بھی اس کا اعتراف کر لے تو نسب قبل الولادۃ ہی ثابت ہو جاتا ہے اب صرف تعیین کی ضرورت ہوگی جو اکیلی بیوی کی گواہی سے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ورثاء موت کے بعد بچہ کے ثبوت نسب کا اعتبار کر لیں تو بچہ وارث بن جائے گا کیونکہ وہ بچے کو وراثت کا شریک بنا رہے ہیں جو ان کا حق ہے۔ اب اگر وہ اہل شہادت ہیں تو بچے کا نسب ان کی گواہی سے ثابت ہو جائے گا۔ ان کے حق میں ثبوتِ نسب ان کے اعتراف سے ہوگا، جبکہ دوسروں کے حق میں، ان کے حق میں ثبوت کے تابع ہو کر۔

مطلقہ صغیرہ کے بچے کا نسب ثابت نہیں ہوسکتا خواہ وہ مطلقہ بطلاق رجعی ہو یا بطلاق بائن۔ الا یہ کہ بچے کی پیدائش نو مہینوں سے پہلے ہو اور عدت وفات میں دس مہینے دس دن سے پہلے ہو۔ یہ طرفین کا قول ہے کیونکہ اس کی عدت مکمل ہوتے ہی مہینے متعین ہو گئے۔ جب شریعت عدت کے ختم ہونے کا حکم لگا دے تو یہ عورت کے اقرار سے زیادہ قوی ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ عورت غلط اقرار کر رہی ہو اور شریعت کا غلط بات کرنا ممکن نہیں ہے۔

اگر صغیرہ دوران عدت حمل کا اعتراف کر لے تو وہ کبیرہ کے حکم میں ہے اس لئے کہ اس کے اقرار سے اس کا بلوغ ثابت ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی حاملہ بیوی سے کہے اگر تیرے ہاں بچہ پیدا ہوا تو تجھے طلاق ہے۔ اب اگر عورت ولادت کی گواہی دیتی ہے تو اس پر طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ اس نے اپنے خاوند کے خلاف حنث کا دعویٰ کیا ہے، جو بینہ کاملہ یعنی دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا۔ اکیلی عورت کی گواہی سے ولادت تو ثابت ہو جائیگی لیکن طلاق ثابت نہیں ہوگی۔ کیونکہ ولادت اور طلاق الگ الگ چیزیں ہیں۔ جبکہ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ طلاق واقع ہو جائیگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: **شهادة النساء جائزة فيمالا يطلع عليه الرجال.** ''عورتوں کی گواہی ان امور میں جائز ہے جن پر مرد حضرات مطلع نہیں ہو سکتے۔'' لہٰذا عورت کی گواہی بچے کی پیدائش کیلئے حجت ہوگی اور اس چیز کے حق میں بھی

حجت ہوگی جو ولادت سے ثابت ہو رہی ہے یعنی طلاق۔

اگر مرد حمل کا معترف ہے: پھر کہتا ہے کہ اگر تیرے ہاں بچہ پیدا ہوا تو تجھے طلاق ہے تو عورت کے یہ بتاتے ہی کہ بچہ پیدا ہو گیا ہے اس پر طلاق واقع ہو جائیگی۔ کیونکہ مرد تو پہلے ہی حمل کا معترف ہے یہ اعتراف ولادت کا اقرار ہے کیونکہ حمل کے بعد ولادت یقینی ہے۔ گویا اب یہ مرد بیوی کے امینہ ہونے کا مقر ہے لہٰذا عورت جب ردِ امانت کا قول اختیار کرے گی تو اس کا قول معتبر ہوگا۔ جبکہ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ عورت کی گواہی ضروری ہے کیونکہ اس نے ولادت کا دعویٰ کیا ہے جس کیلئے دلیل ضروری ہے۔

﴿کتاب النفقات﴾

بیوی کا نفقہ خاوند پر واجب ہے جب کہ بیوی شوہر کے گھر میں خود پر شوہر کو قدرت دیدے۔ نفقہ، کھانے، کپڑے اور رہائش کو کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اسکنوهن من حيث سكنتم من وجدكم ولاتضاروهن لتضيقوا عليهن'' [طلاق:٦]

''اور ان کو گھر دو رہنے کیواسطے جہاں تم آپ رہو، اپنے مقدور کے موافق اور ایذاء دینا نہ چاہو ان کو تا کہ تنگ پکڑو ان کو۔''

جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے کہ انہیں وہاں پر رہائش دو جہاں خود رہتے ہو اور اپنے مال میں سے ان پر خرچ کرو۔ آپ رضی اللہ عنہ کی یہ قراءت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی طرح ہے۔ نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''لينفق ذوسعة من سعته'' [طلاق:٧]

''چاہیے کہ خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے موافق''

نیز ارشاد گرامی ہے:

''وعلى المولودله رزقهن و كسوتهن بالمعروف''

''اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا موافق دستور کے'' [البقرة:٢٣٣]

نیز ارشاد ہے:

''الرجال قوامون على النساء بما فضل الله بعضهم على بعض وبما انفقوا من اموالهم'' [النسا:٣٤]

''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال سے''

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف[1] تمہارے ذمے ہے ان کا کھانا اور لباس اچھائی کے ساتھ۔

[1] [مسلم:٨٩٠]

ایک بار آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ بخیل آدمی ہیں وہ مجھے اتنا نفقہ نہیں دیتے جو میرے لئے اور میرے بچوں کیلئے کافی ہو۔ الا یہ کہ میں انہیں پتہ چلے بغیر ان کے مال سے لے لوں۔ کیا ایسا کرنے سے مجھے گناہ ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **خذی من ما له بالمعروف ما یکفیک ویکفی بنیک**[1] ''اس کے مال میں سے اتنا لے لیا کرو۔ جو تمہارے لئے اور تمہارے بچوں کیلئے کافی ہو۔'' اگر نفقہ واجب نہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ انہیں یہ حکم نہ فرماتے!

نفقہ اس لئے واجب ہے کہ بیوی خود کو خاوند کیلئے پابند رکھتی ہے۔ جس کے سبب وہ کمانے سے عاجز ہے۔

نفقہ میں مرد کی حالت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے **لینفق ذوسعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اته الله** ''چاہئے خرچ کرے وسعت والا وسعت کے موافق اور جس کو پہلے ہی ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے'' [طلاق:۷]

امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: نفقہ میں میاں بیوی دونوں کی حالت کا اعتبار کیا جائیگا۔ خواہ خاوند امیر ہو یا غریب، اسی پر فتویٰ ہے۔ اگر دونوں امیر ہوں تو عورت کو امیروں والا نفقہ دیا جائیگا۔ اگر دونوں غریب ہوں تو غریبوں والا نفقہ دیا جائیگا۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک غریب اور دوسرا امیر ہو تو غریبوں کے نفقہ سے زیادہ اور امیروں کے نفقہ سے کم دیا جائے گا۔ اگر ایک بہت زیادہ امیر اور دوسرا بہت زیادہ غریب ہو تو بھی متوسط طبقے کا نفقہ دیا جائیگا۔ اگر مرد کہے کہ میں غریب ہوں تو اس کے قول کا اعتبار کیا جائیگا اس لئے کہ وہ منکر ہے اور بینہ بیوی کے ذمہ ہونگے کیونکہ وہ مدعیہ ہے۔

اور نفقہ بغیر بخل واسراف کے درمیانے درجے کا لازم ہوتا ہے۔

حضرت عبدالملک بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک خوبصورت، لمبی اور عمدہ کپڑوں میں ملبوس عورت ابنِ زیاد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچی اور نفقہ کے بارہ میں اپنے خاوند کی شکایت کرنے لگی اور کہنے لگی کہ وہ مجھے تکالیف پہنچاتا ہے۔ ابنِ زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے شوہر کو طلب کیا، اس کا شوہر پست قد، لاغر اور بدشکل تھا۔ وہ کہنے لگا آپ میری بیوی سے پوچھیں کہ اس پر یہ چربی میرے دیئے ہوئے کھانے کی وجہ سے چڑھی ہے یا نہیں؟ اس کی بیوی کہنے لگی کیا تم روٹی کا ایک ٹکڑا دے کر مجھ پر احسان جتا رہے ہو؟ خاوند نے کہا: اس سے پوچھیں جو کپڑے اس نے پہنے ہوئے ہیں وہ اسے

---

[1] [مسلم:۱۳۳۸/۳]

میں نے دیئے ہیں یا نہیں؟ بیوی کہنے لگی: تم ایک ٹا کی دے کر مجھ پر احسان جتا رہے ہو؟ شوہر نے کہا: اس سے پوچھیں اس کے پیٹ میں موجود بچہ مجھ سے ہے یا نہیں؟ بیوی کہنے لگی: ہاں لیکن اے کاش! یہ کسی کتیا کے پیٹ میں ہوتا: خاوند نے کہا: شوہر سے تو یہی مطالبہ ہوسکتا ہے کہ وہ کھانا کھلائے کپڑے دے اور حاملہ کر دے۔ ابن زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے خاوند سے کہا: تو نے سچ کہا، اس سے یہی مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ اور اسے لے جا۔

نفقہ کی کوئی خاص مقدار مقرر کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ مختلف اوقات میں چیزوں کے بھاؤ میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نیز انسانی طبیعتوں کا اختلاف بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ نفقہ کی کوئی خاص مقدار مقرر نہ ہو۔ عورت کیلئے ہر مہینے کھانے کا انتظام ضروری ہے اور ہر چھ ماہ بعد کپڑے دینا ضروری ہیں۔ شوہر بیوی کے اوپر خود بھی خرچ کرسکتا ہے الا یہ کہ قاضی کے پاس یہ ثابت ہو جائے کہ خاوند بیوی پر خرچ نہیں کرتا۔ پھر ہر ماہ کا خرچ طے کرلیا جائے گا۔ اگر شوہر امیر ہو اور اس کے پاس خادم ہو تو بیوی کیلئے ایک خادم کا نفقہ بھی مقرر کیا جائیگا۔ البتہ اگر خاوند کے پاس خادم نہ ہو تو بیوی کیلئے خادم کا نفقہ ضروری نہیں ہے بالخصوص اگر خاوند غریب ہو، کیونکہ عورت اپنی خدمت کے امور خود انجام دے سکتی ہے۔

مرد کے ذمے یہ بھی ضروری ہے کہ عورت کو تنہا گھر میں رکھے اور شوہر کے اہل خانہ میں سے کوئی اس کے گھر میں نہ ہو سوائے شوہر کے بچوں کے جو جماع کو نہیں سمجھتے۔ ہاں اگر عورت خود ہی کہہ دے کہ میرے ساتھ اہل خانہ کو رکھ لیں تو جائز ہے۔ اگر خاوند کا بچہ کسی اور خاتون سے ہو اور وہ جماع کو سمجھتا ہو تو خاوند اس بچے کو بیوی کیساتھ گھر میں نہیں رکھ سکتا کیونکہ سکنیٰ خاوند کے ذمے ضروری ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی غیر شریک نہیں ہوسکتا کیونکہ اس غیر کی وجہ سے نہ تو عورت کا سامان محفوظ رہ سکے گا اور نہ ہی وہ اپنے خاوند کے ساتھ اپنی پسند کا وقت گزار سکے گی۔

بیوی کا اپنے اہل خانہ سے ملنا

خاوند کو اختیار ہے کہ وہ بیوی کے والدین اور اس کی اولاد کو جو سابقہ شوہر سے ہو اپنے گھر ٹھہرنے سے روک سکتا ہے۔ کیونکہ وہ گھر کا مالک ہے۔ لیکن وہ انہیں کسی بھی وقت دیکھنے اور بات کرنے سے منع نہیں کرسکتا۔ ورنہ تو یہ قطع رحمی میں شامل ہوگا۔ ویسے بھی ان کی آپس کی بات چیت میں خاوند کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ خاوند اپنی بیوی کو ہفتہ میں ایک مرتبہ والدین کی ملاقات سے نہیں روک سکتا خواہ بیوی جانا چاہے یا والدین آکر ملنا چاہیں اور دیگر

رشتہ داروں سے سال میں ایک بار ملاقات کرسکتی ہے۔ یہی قول صحیح ہے۔

بیوی خود پر شوہر کو قابو نہ دے تو اس کے نفقہ کا حکم

اگر بیوی اپنے شوہر کو خود پر قابو نہ دے اور کہے کہ جب تک آپ میرا مہر معجّل ادا نہیں کرتے اس وقت تک میں آپ کو خود پر قابو نہیں دیتی۔ اگرچہ وہ دخول کے بعد ایسا کرے تو اسے نفقہ دیا جائیگا کیونکہ وہ اپنا حق وصول کرنے کیلئے شوہر کو قریب نہیں آنے دے رہی۔ اگر اس کا نفقہ ختم کر دیا جائے تو اس کیلئے باعث ضرر ہوگا۔ اگر ضرر پہنچے تو اس ظالم شوہر کو جو اس کا حق ادا نہیں کرتا۔ ویسے بھی رکاوٹ شوہر کی طرف سے ہے لہٰذا یہی کہا جائیگا کہ گویا بیوی نے خود پر قابو دینے سے انکار ہی نہیں کیا۔

شوہر صغیر اور شوہر کبیر پر نفقہ کا حکم

اگر شوہر صغیر ہو کہ وطی پر قادر نہ ہو اور بیوی کبیرہ ہو تو شوہر کے مال میں سے بیوی کو نفقہ دیا جائیگا اس لئے کہ عورت تو خود کو سپرد کر چکی اب عجز مرد کی طرف سے ہے۔ البتہ اگر زوجہ صغیرہ ہو کر اس سے استمتاع نہ ہوسکتا ہو اور شوہر کبیر ہو تو اس کا نفقہ شوہر کے ذمہ نہیں ہے کیونکہ مانع بیوی کی طرف سے ہے اور اگر میاں بیوی دونوں صغیر ہوں تو نفقہ واجب نہیں ہے۔

نافرمان بیوی کا نفقہ

اگر عورت بلا عذر مرد کے گھر سے نکل جاتی ہے خواہ مرد کسی لمبے سفر پر گیا ہوا ہو، تو اس کا نفقہ مرد کے ذمہ نہیں ہے جب تک کہ گھر نہ لوٹ آئے۔ کیونکہ نفقہ تو اس لئے واجب ہوتا ہے کہ عورت خود کو میاں کے گھر میں محبوس رکھے گی۔ جب سبب نہ پایا گیا تو نفقہ بھی ختم ہوگیا۔ تاہم جب عورت گھر لوٹ آئے گی تو اس کا نفقہ دوبارہ واجب ہو جائے گا۔ ہاں! اگر عورت خاوند کے گھر میں رہ کر اسے خود پر قابو نہ دے تو اس کا نفقہ مرد پر واجب ہوگا کیونکہ عورت محبوس ہے اور ویسے بھی شوہر زبردستی وطی کرسکتا ہے اور اگر شوہر بیوی کے ساتھ اس کے گھر میں رہائش پذیر ہو اور عورت پھر خود پر قابو نہ دے تو وہ ناشزہ ہے (اس کا نفقہ واجب نہیں ہے) الا یہ کہ عورت کا یہ مطالبہ ہو کہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے چلو! یا مجھے کرایہ کا مکان لے دو میں اس میں رہنا چاہتی ہوں۔ اگر شوہر غصب شدہ مکان میں رہتا ہو اور بیوی اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دے تو وہ ناشزہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنے حق کیلئے انکار کیا ہے۔

مطلقہ کے نفقہ کا حکم

مطلقہ کو دوران عدت نفقہ اور سکنیٰ دیا جائیگا۔ چاہے طلاق رجعی ہو یا طلاق بائن۔ طلاق رجعی کے بعد تو اس لئے کہ نکاح قائم ہے حتیٰ کہ وطی وغیرہ بھی حلال ہے۔ اور طلاق بائن کے بعد اس لئے کہ بیوی اس کے حق کیلئے محبوس ہے کیونکہ وہ اس کے بچے کو دوسروں کے پانی کی ملاوٹ سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ اسی محبوسؔ ہونے کی وجہ سے اسے بالاجماع نفقہ وسکنیٰ دیا جائیگا۔

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مطلقہ ثلاث کے بارہ میں نقل کرتی ہیں کہ لیس لھا سکنی ولا نفقة[1] نہ اسے رہائش ملے گی اور نہ ہی نفقہ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت دے کر فرمایا: انتقلی الی بیت ابن عمک عمرو بن أم مکتوم فاعتدی عنده[2] اپنے چچازاد بھائی عمرو بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے گھر چلی جاؤ اور ان کے پاس وہاں عدت گزارلو!۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کا انکار کیا ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا: ہم کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک عورت کی حدیث کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ جس کے بارے میں ہمیں علم ہی نہیں کہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات یاد ہے یا وہ بھول کی شکار ہے۔ لہٰذا اس نے مطلقہ ثلاث کو بھی نفقہ اور سکنیٰ دیا جائیگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لاتخر جو ھن من بیو تھن ولا یخرجن الا ان یا تین بفاحشة مبینة" [الطلاق:۱]

"مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے اور وہ بھی نہ نکلیں مگر جو کریں صریح بے حیائی۔"

اگر مطلقہ حاملہ ہونے کا دعویٰ کرے تو اسے طلاق کے بعد احتیاطاً دو سال تک نفقہ دیا جائیگا۔ اگر وہ کہے کہ میرا خیال ہے کہ میں حاملہ ہوں۔ مجھے اس وقت سے اب تک حیض نہیں آیا یعنی یہ کہ وہ ممتدۃ الطہر ہے اور وہ نفقہ کا مطالبہ کرے تو اسے نفقہ دیا جائیگا۔ جب تک کہ وہ حدایاس تک نہیں پہنچتی۔ کیونکہ وہ معتدہ ہے اور جب وہ حدایاس کو پہنچ جائیگی تو وہ از سرنو اپنی عدت کی ابتداء کریگی۔ اس کی عدت تین ماہ ہوگی۔

متوفی عنہا زوجہا کا نفقہ

متوفی عنہا زوجہا کا نفقہ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ نفقہ تو واجب ہوتا ہے خاوند کے مال میں

---

[1] [مسلم:۱۱۱۸/۳]
[2] [مسلم:۱۱۱۸/۳]

اوراب وہ کسی مال کا مالک نہیں رہا۔ اس کا مال تو اس کی وفات کے بعد ورثاء کی طرف منتقل ہو چکا ہے۔ اب نہ تو میت پر نفقہ واجب ہوسکتا ہے، اور نہ ورثاء پر ہی۔ لہٰذا عورت کے حصے کے مال (میراث) میں سے اس پر خرچ کیا جائیگا۔ امام ابو یوسفؒ اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ متوفی عنہا زوجہا کے مال پس اس کے حصے میں سے خرچ کیا جائیگا۔[1]

میاں بیوی کے درمیان جدائی کی صورت

جو جدائی بھی عورت کے گناہ کے سبب اس کی طرف سے وقوع پذیر ہو جیسے مرتد ہونا یا خاوند کے بیٹے کی تقبیل، تو اس عورت کو نفقہ نہیں دیا جائیگا۔ کیونکہ اس نے گویا خود کو بغیر حق کے محبوس کیا ہوا ہے لہٰذا وہ ناشزہ کے حکم میں ہوگی۔ اور جو جدائی عورت کے گناہ کے بغیر وقوع پذیر ہو جیسے کہ اس کے بچپن میں بھائی نے اس کی شادی کردی۔ اب بلوغت کے بعد اس نے نکاح ختم کر دیا یا کفو نہ ہونے کی وجہ سے میاں بیوی میں تفریق کردی گئی تو اس عورت کو نفقہ دیا جائیگا۔

مرتدہ اور جو عورت نفقہ نہ مانگے اس کے نفقہ کا حکم

مطلقہ اگر نفقہ کا مطالبہ نہ کرے حتیٰ کہ اس کی عدت ختم ہو جائے تو منکوحہ کی طرح اس کا نفقہ بھی ساقط ہو جائے گا۔ الا یہ کہ قاضی نے اس کا نفقہ مقرر کیا ہو یا یہ کہ میاں بیوی نے آپس میں ایک نفقہ طے کیا ہوا ہو اور ایک مدت تک اس پر خرچ نہ کیا ہو تو جو نفقہ گزر چکا ہے اس کی ادائیگی کا حکم دیا جائیگا۔ اگر کسی نے بیوی کو تین طلاقیں دیں اور پھر وہ مرتدہ ہوگئی تو اس کا نفقہ ساقط ہوگیا کیونکہ اب وہ حق شرع میں محبوس ہے۔ (نہ کہ حق زوج میں)

اولاد کا نفقہ

چھوٹے بچے اگر نادار ہوں تو ان کا نفقہ باپ کے ذمہ لازم ہے۔ باپ کے ساتھ کسی اور کو اس کام میں شریک نہیں کیا جائیگا۔ خواہ باپ امیر ہو یا غریب۔ ہاں اگر باپ غریب ہو اور ماں امیر ہو تو ماں کو حکم دیا جائیگا کہ اولاد پر خرچ کرا اور یہ خرچ باپ کے ذمہ قرض ہوگا اور اگر بچے مالدار ہوں تو ان کا نفقہ ان کے مال میں سے لیا جائیگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف" [البقرة:۲۳۳]

"اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا، دستور کے مطابق۔"

---

[1] [الآثار:۱۲۹]

بیوی کا نفقہ بھی اکیلے شوہر کے ذمے ہوتا ہے جب تک کہ وہ نادار نہ ہو۔ ایسی صورت میں کسی اور پر نفقہ لازم ہوگا اور وہ خاوند پر رجوع نہیں کر سکے گا۔ صحیح مذہب کے مطابق۔ شیر خوار بچے کی رضاعت اس کے نفقہ کے قائم مقام ہے اور نفقہ چونکہ والد کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے عورت کے ذمے بچے کو دودھ پلانا نہیں ہے الا یہ کہ اس کے ذمے ہی پڑ جائے جیسے کہ اگر شوہر کسی اور دودھ پلانے والی کا انتظام نہ کر سکے یا یہ کہ بچہ ہی کسی اور کا دودھ نہ پیے تو ایسی صورت میں بیوی کے ذمے رضاعت ضروری ہے تا کہ بچہ ہلاکت سے بچ سکے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"والدات یرضعن اولادھن" [البقرہ:۲۳۳]

"اور بچے والی عورتیں دودھ پلاویں اپنے بچوں کو"

لہٰذا اگر شوہر نادار ہو، بچے کی رضاعت کا انتظام نہ کر سکتا ہو تو عورت کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر دے۔ البتہ وہ قاضی سے یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ قاضی اس کے دودھ پلانے کا معاوضہ مقرر کرے اور جب شوہر مالدار ہو جائے تو اس سے وہ معاوضہ وصول کر لے جیسا کہ اگر شوہر نادار ہو اور بیوی مالدار ہو تو بیوی کو مجبور کیا جائیگا کہ صغیر پر خرچ کرے پھر جب باپ مالدار ہو جائے تو اس سے یہ خرچ وصول کر لے۔

صغیر کا نفقہ باپ کے" ذمے لازم ہے اگر چہ اس کا مذہب باپ کے مذہب سے مختلف ہو۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مطلقا ارشاد فرمایا ہے:

"وعلی المولود له رزقھن و کسوتھن بالمعروف" [البقرہ:۲۳۳]

"اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا دستور کے مطابق"

نیز اس لئے بھی کہ بچہ باپ کا جزء ہے۔ اس پر خرچ کرنا گویا خود پر خرچ کرنا ہے۔

بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمے ہے اگر چہ اس کا دین جدا ہو۔ اس لئے کہ بیوی کو تو نفقہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ اس نے خود کو عقد نکاح کی وجہ سے محبوس کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا نفقہ واجب ہے۔

مالدار مرد وعورت پر ضروری ہے کہ وہ اپنے غریب والدین دادوں، دادیوں، نانوں اور نانیوں پر خرچ کریں اگر چہ وہ کمانے پر بھی قادر ہوں۔ اور منکر یسار کا قول معتبر ہے جبکہ بینہ دعویٰ یسار کرنے والے کے ذمے ہوگا۔

مختار یہی ہے کہ کمانے والا والدین کو نفقہ میں شامل رکھے اگر چہ ان کا مذہب الگ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے فلا تقل لھما اف "تو نہ کہہ ان کو، ہوں!" [بنی اسرائیل:۲۳] جب اس قدر تکلیف بھی والدین کو پہنچانا صحیح نہیں ہے تو ضرورت کے موقع پر ان پر خرچ نہ کرنا کیسے صحیح ہوگا؟

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے! انت ومالک لابیک ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔'' نیز آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان اطیب ما اکل الرجل من کسبه و ان ولده من کسبه. ''انسان جو سب سے زیادہ پاکیزہ مال کھاتا ہے وہ اس کی کمائی کا ہے، اور اس کا بیٹا بھی اسی کی کمائی کا حصہ ہے۔'' جب بیٹے کا مال باپ کا ہے تو بیٹے کی کمائی سے باپ مالدار ہو جائیگا اور اس کی کمائی میں سے کھا بھی سکے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ووصینا الانسان بوالدیه حسنا ''اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی سے رہنے کی۔'' [عنکبوت:۸] یہ کیسا احسان ہے کہ انسان ان کی احتیاج دور کرنے پر قدرت کے باوجود انہیں محتاج رہنے دے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کافر والدین کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں: وصاحبهما فی الدنیا معروفا. یہ معروف نہیں ہے کہ انسان انہیں کھلانے کی قدرت کے باوجود انہیں بھوکا رکھے۔

والدین کا نفقہ مرد وعورت پر برابر واجب ہے کیونکہ دونوں برابر مخاطب ہیں۔ یہی مختار ہے جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وراثت کی بہ قدر دونوں پر واجب ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وعلی الوارث مثل ذلک'' [البقرۃ:۲۳۳]

''اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے۔''

اگر اختلاف دین ہو تو صرف بیوی، والدین، دادا، دادی، نانا، نانی، بیٹوں اور پوتوں کا نفقہ لازم ہوتا ہے۔

رشتہ داروں کا نفقہ

ہر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہے جیسے کہ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ہر ذی رحم محرم پر خرچ کیا جائیگا۔ [الاثار:۱۵۹] بشرطیکہ وہ صغیر نادار ہو یا نادار عورت ہو۔ اگرچہ بالغہ ہو یا اپاہج ہو یا نادار یا اندھا ہو۔ نفقہ میراث کی بہ قدر واجب ہوتا ہے۔ لان الغرم بالغنم نفقہ قرابت قریبہ میں واجب ہے نہ کہ بعیدہ میں۔ وہ یہ ہے کہ انسان ذی رحم محرم ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''وعلی الوارث مثل ذلک'' [بقرۃ:۲۳۳]

''اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یوں ہے: وارث ذی رحم محرم پر ایسا ہے۔ اور قرابت قریبہ کے ساتھ احتیاج بھی ضروری ہے مثلاً صغر، مؤنث ہونا، اپاہج ہونا، یا نابینا ہونا وغیرہ تاکہ ان کے عجز کا تحقق ہو سکے کیونکہ جس شخص کو کسب پر قدرت ہوگی وہ اپنے کسب کی وجہ سے غنی ہے۔ بخلاف والدین کے کیونکہ اس میں قدرۃ علی الکسب نہ :: شرط نہیں ہے۔ اس لئے کہ کمانے

سے وہ مشقت میں مبتلا ہونگے اور اولاد کے ذمے ضروری ہے کہ وہ والدین کو کسی مشقت میں مبتلا نہ ہونے دیں۔

اور ذی رحم غیر محرم چچا زاد وغیرہ کا نفقہ واجب نہیں ہے اگر چہ وہ وارث بھی ہوں اس لئے کہ محرمیت کا بجہتقرابت ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی جہت رحم کے علاوہ قریبی رشتہ دار ہو جیسے چچا زاد اگر رضاعی بھائی ہو تو اس کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔ نادار بالغ لڑکی، اور نادار اپاہج بیٹے، اندھے بیٹے کا نفقہ میراث کی بہ قدر والدین کے ذمے ہے۔ والد کے ذمے دو ثلث اور والدہ کے ذمے ایک ثلث ہوگا۔ اور ظاہر الروایۃ میں ہے کہ ان کا تمام نفقہ والد کے ذمے ہوگا۔ اسی پر فتویٰ ہے۔

جو شخص کسی پیشہ کی عدم واقفیت کے سبب اچھی طرح نہیں کما سکتا یا جیسے وہ طالب علم ہے تو اس کا نفقہ مالدار ذی رحم محرم ہوگا۔ والد کی منکوحہ کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے۔ اگر بیٹا صغیر، فقیر یا اپاہج ہو تو اس کی بیوی کا نفقہ باپ کے ذمے ہے۔ باپ کے خادم کا نفقہ بھی بیٹے کے ذمے ہے اگر باپ کو خادم کی ضرورت ہو۔ اس لئے کہ باپ کی خدمت بیٹے کی ذمہ داری ہے لہٰذا خادم کا نفقہ بھی بیٹے کی ذمہ داری ہے۔

محتاج پر صرف بیوی اور اولاد صغیر کا نفقہ واجب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ومن قدر علیہ رزقہ فلینفق مما اتٰہ اللّٰہ'' [طلاق:۷]

''اور جس کو پہلے ہی تلی ملتی ہے تو وہ خرچ کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے''

نیز ارشاد ہے:

''وعلی المولود لہ رزقھن''

''اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا ان کا'' [البقرۃ:۲۳۳]

کیونکہ بیوی کا نفقہ تو اس لئے ضروری ہے کہ وہ خاوند کیلئے محبوس ہے اور یہ احتباس فقر کے باوجود بھی پایا جاتا ہے۔

مالدار ہونے سے وہ غنی مراد ہے جو صدقہ کو حرام کر دے۔ جو ضرورت اہلیہ اور اہل خانہ کی حاجت سے زائد نصاب کا مالک ہوگا اس پر اقارب کا نفقہ واجب ہے اور جس شخص کے پاس مکان اور خادم ہو لیکن وہ محتاج ہو کہ اس کیلئے صدقہ حلال ہو اس کا نفقہ رشتہ داروں کے ذمے لازم ہے۔ اگر اس کے پاس بڑا احاطہ ہو کہ اس کی ضرورت سے زائد ہو تو اسے حکم دیا جائیگا کہ اس میں سے بقدر ضرورت اپنے پاس رکھے اور زائد از ضرورت کو بیچ کر خود پر خرچ کرے۔ اور اگر اس کے پاس فلیٹ ہے جس میں کئی کمرے ہیں جو اس کی اور اس کی اولاد کی ضرورت سے زائد ہیں تو اسے

حکم دیا جائیگا کہ اس فلیٹ کو بیچ دے اور اس سے کم قیمت پر فلیٹ خرید کر اس میں گزارا کرے اور باقی رقم خود پر خرچ کرے۔

اگر بیٹا فقیر ہو لیکن تھوڑا بہت کماتا ہو اور اس کا باپ معذور ہو تو بیٹا حسب توفیق باپ کا تعاون کرے گا اور جو شخص معذوری اور اپاہج پن کی وجہ سے کما نہیں سکتا بلکہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے تو اسکا اور اس کی اولاد کا نفقہ حکومت کے ذمے ہے۔ اگر ایک شخص کا باپ تنگ دست اور چچا مالدار ہو تو چچا کو حکم دیا جائیگا کہ بھتیجے پر خرچ کر اور بعد میں اپنے بھائی سے لے لے۔ اگر ایک تنگ دست بیوی کا شوہر بھی تنگ دست ہو لیکن اس عورت کا کسی اور خاوند سے امیر بیٹا ہے یا اس کا کوئی امیر بھائی ہے تو بھی اس کا نفقہ شوہر کے ذمے ہوگا۔ بیٹے یا بھائی کو حکم دیا جائیگا کہ اس پر خرچ کرو اور جب اس کا شوہر مالدار ہو جائے تو اس سے لے لے۔ اگر بیٹا یا بھائی خرچ نہ کریں تو انہیں قید کرلیا جائیگا اس لئے کہ یہ معروف میں سے ہے۔

اگر ایک تنگ دست کا باپ اور بیٹا دونوں مالدار ہیں تو نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے انت و مالک لابیک ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔'' اور قرابۃ الولد کے نفقہ میں الاقرب فلا قرب کا اصول معتبر ہے اس میں وراثت کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مولودلہ پر نفقہ واجب فرمایا ہے جو ولاء سے مشتق ہے اور ولاء جزئیت و بعضیت کو کہتے ہیں۔ جبکہ ذی رحم محرم کے نفقہ میں وراثت کا اعتبار کیا گیا ہے۔

اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک تنگ دست کا بیٹا اور بیٹی دونوں مالدار ہیں تو اس کا نفقہ دونوں پر آدھا واجب ہوگا۔

۲۔ ایک تنگ دست کی بیٹی اور بھائی دونوں امیر ہیں۔ اس کا نفقہ اس کی بیٹی کے ذمہ ہوگا کیونکہ دونوں میں وہی اقرب ہے۔

۳۔ ایک تنگ دست کی بیٹی اور پوتا دونوں مالدار ہیں تو اس کا نفقہ بیٹی کے ذمہ ہوگا کیونکہ دونوں میں وہی اقرب ہے۔

۴۔ ایک تنگ دست کی نواسی نواسا اور بھائی مالدار ہیں تو اس کا نفقہ نواسا، نواسی کے ذمہ ہوگا کیونکہ وہی اقرب ہیں۔

۵۔ ایک تنگ دست کا حقیقی بھائی اور حقیقی بہن دونوں مالدار ہیں اس کا نفقہ وراثت کے بقدر دونوں کے ذمہ ہوگا۔

۶۔ ایک تنگ دست کی بہن اور چچا دونوں مالدار ہیں تو اس کا نفقہ آدھا آدھا دونوں کے ذمہ

ہوگا۔

۷۔ ایک تنگ دست کی ماں اور دادا دونوں مالدار ہیں تو اس کا نفقہ اثلاثا دونوں کے ذمہ ہوگا۔

۸۔ ایک تنگ دست کی والدہ، دادا اور بھائی مالدار ہیں اس کا ایک تہائی نفقہ ماں کے ذمہ اور باقی دادا کے ذمہ ہوگا جبکہ صاحبین کے نزدیک باقی نفقہ بھائی اور دادا دونوں کے ذمہ نصف نصف ہوگا۔

۹۔ ایک تنگ دست کا ماموں اور چچازاد مالدار ہیں۔ اس کا نفقہ ماموں کے ذمہ ہوگا اور اس کی وراثت چچازاد کو ملے گی۔

۱۰۔ ایک تنگ دست کا چچا اور ماموں مالدار ہیں۔ اس کا نفقہ چچا کے ذمہ ہوگا۔

۱۱۔ ایک تنگ دست کی پھوپھی اور خالہ مالدار ہیں اس کا دو ثلث نفقہ پھوپھی کے ذمہ اور ایک ثلث خالہ کے ذمہ ہوگا۔

سقوط نفقہ

اگر قاضی، اولاد والدین یا رشتہ دار کے نفقہ کا حکم دیدے اور اس حکم کو ایک مہینہ یا زیادہ گزر جائے اور انہیں نفقہ نہ دیا جائے تو اس مدت کا نفقہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ ان کا نفقہ تو ضرورت اور حاجت ہو تو واجب ہوتا ہے اور مدت گزرنے کے ساتھ ان کی ضرورت پوری ہو چکی ہے۔ الا یہ کہ قاضی نے ان اشخاص کو قرض لینے کا کہا ہو تب وہ اس کے ذمہ قرض ہوگا جو مدت گزرنے سے ساقط نہیں ہوگا۔ اسی طرح بیوی کا نفقہ اگر قاضی فیصلہ کردے تو مدت گزرنے سے ساقط نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یہ نفقہ تو بیوی کی دولتمندی کے باوجود لازم ہوتا ہے۔

پرورش

اہل عرب حضن الطائر بیضہ اس وقت کہتے ہیں جب پرندہ انڈے پر بیٹھ جائے اور اسے اپنے سینے سے لگالے۔ بچے کا مربی بھی چونکہ اسے سینے سے چمٹائے رکھتا ہے اس لئے اسے حضانت کہتے ہیں۔ بچہ چونکہ اپنے مصالح سمجھنے سے عاجز ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کیلئے ایک ولی مقرر کردیا ہے۔ مال اور معاملات کی ولایت تو مردوں کے پاس ہے کیونکہ وہی معاملات کو بہتر انداز میں حل کرسکتے ہیں اور ان کی تربیت عورتوں کے ذمے ہیں کیونکہ ان میں شفقت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ مردوں کی نسبت بہتر تربیت کرسکتی ہیں۔

حضانت کا حقدار

اگر میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو حضانت کی حقدار اس کی والدہ ہے۔اگر والدہ نہ ہو تو دادی کی بہ نسبت نانی زیادہ اولیٰ ہے۔اگر نانی نہ ہو تو دادی، اگر دادی نہ ہو تو حقیقی بہنیں، پھر ماں شریک بہنیں پھر باپ شریک بہنیں، پھر حقیقی بھانجیاں پھر ماں شریک بہن کی بیٹیاں پھر خالائیں۔پھر باپ شریک بہن کی بیٹیاں، پھر پھوپھیاں، پھر ماں کی خالہ پھر باپ کی خالہ اور اسی طرح پھر ماں کی پھوپھی اور پھر باپ کی پھوپھی۔

ان خواتین میں سے جو خاتون بھی کسی اجنبی کے ساتھ شادی کر یگی اس کا حق حضانت ختم ہو جائے گا کیونکہ اجنبی اسے گھٹیا چیز دیا کرے گا اور ہر وقت اسے گھورتا رہے گا، چونکہ ماں کے خاوند سے بھی اسے ضرر لاحق ہو سکتا ہے لہٰذا ماں کا حق بھی ضرر کی وجہ سے ساقط ہو جائے گا، اگر ماں دوسرے شوہر سے جدا ہو جائے تو اس کو دوبارہ حق حضانت حاصل ہو جائے گا۔اس لئے کہ مانع زائل ہو گیا ہے اور نفیٔ زوج میں عورت کا قول معتبر ہوگا اس لئے کہ وہ حضانت میں اپنے حق کے بطلان کا انکار کر رہی ہے۔حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بچے کی زیادہ حقدار ماں ہے جب تک بچہ ماں کا محتاج ہو۔ہاں اگر ماں دوسری شادی کر لے تو پھر بچے کی نانی، دادی اور بچے کی خالائیں اس کی حقدار ہیں۔[1]

ماں اور نانی دادی بچے کی حقدار ہیں جب تک کہ بچہ اکیلا کھا پی نہ سکے اور جب تک کہ اسے خدمت کی ضرورت رہے اور جب اسے خدمت کی ضرورت نہ رہے یعنی تقریباً سات سال کی عمر میں تو اسے اچھے اخلاق اور بہترین تربیت کیلئے باپ کے سپرد کر دیا جائیگا اور بچی بالغہ ہونے تک ماں کے پاس رہے گی کیونکہ عورتوں کے معاملات کی تربیت ماں ہی اسے دے سکتی ہے اور بلوغت کے بعد چونکہ اس کی عصمت وعزت کی حفاظت ضروری ہے لہٰذا بلوغت کے بعد بچی کا حقدار باپ ہوتا ہے۔ماں اور نانی دادی تو بالغ ہونے تک بچی کو اپنے پاس رکھیں گے جب کہ دیگر خواتین اس وقت تک بچی کو اپنے پاس رکھ سکتی ہیں جب تک کہ وہ قابل شہوت نہ ہو۔یعنی نو سال کی عمر تک۔اسی پر فتویٰ ہے۔حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بچہ جب کھانے پینے اور پہننے میں ماں کا محتاج نہ رہے تو باپ اس کا حقدار ہے۔[2]

اگر بچے کیلئے کوئی عورت نہ ہو تو اسے مرد لے لیں تاکہ اس کی زندگی محفوظ رہ سکے۔ان

---

[1] [الآثار:۱۵۹] [2] [الآثار:۱۵۸]

میں سب سے حقدار وہ ہے جو قریبی عصبہ ہے۔ اس لئے کہ اس کی ولایت باعتبار قرب ہوگی۔ اسی طرح اگر بچہ حضانت کا محتاج نہ رہے تو اسے حفاظت کیلئے قریبی عصبہ کو دیدیا جائیگا۔ اگر عصبہ نہ ہوں تو ذوی الارحام کو۔ اگر تمام ذوی الارحام برابر ہوں تو صالح ترین شخص پھر متقی ترین شخص اور پھر وہ شخص حقدار ہوگا جو عمر میں سب سے بڑا ہو۔ بچی غیر محرم چچازاد وغیرہ کو نہیں دی جائیگی کہ خدانخواستہ وہ گناہ میں نہ واقع ہو جائے اور نہ گناہگار محرم کو دی جائیگی کیونکہ اس کے بھی گناہ میں وقوع کا خطرہ ہے۔ اگر بہن کو بھائی کے پاس رکھنے میں بھی خطرہ ہو تو قاضی اسے ثقہ عورت کے پاس رکھے۔ اگر کسی بچی کا چچازاد کے علاوہ کوئی اور نہ ہو تو اگر وہ دیندار ہو تو قاضی اس کے پاس رکھ سکتا ہے ورنہ کسی دیندار خاتون کے پاس اسے رکھے۔

جب حضانت کے حقدار ایک ہی درجہ میں جمع ہو جائیں تو متقی ترین شخص زیادہ حقدار ہے پھر بڑی عمر والا۔

ذمیہ عورت اپنے مسلمان بچے کی حقدار ہے خواہ بچہ ہو یا بچی جب تک کہ بچہ ادیان کو سمجھنے کے قابل نہ ہو جائے اور اس بات کا خوف نہ ہو کہ ذمیہ بچے کو کفر پر لگادے گی۔

میاں یا بیوی کا بچے کو اپنے ہمراہ سفر پر لے جانا

باپ اپنے بیٹے کو شہر سے باہر نہیں لے جاسکتا جب تک کہ وہ حد استغناء کو نہ پہنچ جائے۔ اس لئے کہ ایسا کرنے سے ماں کا حق حضانت ختم ہوتا ہے اور نہ عورت بچے کو لے کر شہر سے باہر جاسکتی ہے اس لئے کہ اس طرح باپ کی دیکھ بھال کا حق باطل ہو جاتا ہے۔ الا یہ کہ ماں بچے کو اپنے شہر لے جائے جس شہر میں اس کے ساتھ میاں نے شادی کی تھی یا یہ کہ وہ شہر اس شہر کے قریب ترین ہو جس میں باپ اقامت پذیر ہے۔ اسی طرح اگر ماں گاؤں میں رہتی ہے تو وہ بچے کو لے کر شہر منتقل ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس نہیں کر سکتی ہے۔

علیحدہ رہنے کا حق

ثیبہ مامونہ الگ رہائش رکھ سکتی ہے۔ اگر ثیبہ مامونہ نہ ہو تو باپ اسے اپنے ساتھ رکھے باکرہ اکیلی نہیں رہ سکتی۔ ہاں اگر وہ سنِ ایاس کو پہنچ جائے اور وہ ذی رائے ہو تو اکیلی رہ سکتی ہے۔

﴿کتاب الایمان﴾

ایمان یمین کی جمع ہے۔یمین کا لغوی معنی ہے قوت۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''لاخذنامنه باليمين'' [حاقۃ:۴۵]

''اور ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ''

اور یمین جارحہ کو بھی کہتے ہیں۔یمین مطلق قسم کو کہتے ہیں جو بلا تخصیص کسی چیز کی بھی اٹھائی جائے۔ارشاد باری تعالیٰ: فراغ عليهم ضربا باليمين [صافات:۹۳] ''پھر گھسا ان پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے۔''میں تین احتمالات ہیں۔(۱) بقوتہ (۲) بیدہ الیمنی (۳) بحلفہ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے وتاللّٰه لاكيدن اصنامكم ''اور قسم اللہ کی میں علاج کروں گا تمہارے بتوں کا''یمین کا شرعی معنی ہے ایسا قوی عقد جس کے ذریعے قسم اٹھانے والا کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عزم کرے۔اس کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔قسم:

قسم کہتے ہیں جس کی قسم اٹھائی جائے اس کی تعظیم پیش نظر ہو۔اسی طرح قسم صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی اٹھائی جاسکتی ہے۔آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: من كان حالفا فلا يحلف الا باللّٰه ''جو شخص قسم اٹھائے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی کی قسم نہ اٹھائے۔''[۱] نیز آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: فمن كان حالفا فليحلف باللّٰه او ليصمت ''جو شخص قسم اٹھائے تو اللہ کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے۔''[۲]

قسم میں قوت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ قسم کے ذریعے کلام کو قوی کیا جاتا ہے۔نیز اس لئے بھی یمین کو یمین کہتے ہیں کہ لوگ قسم کے وقت یمین (آلہ جارحہ) کو پکڑتے تھے۔

۲۔شرط وجزاء:

یعنی جزاء کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا۔جیسے اگر میں تمہارے پاس کل نہ آیا تو میرا غلام آزاد ہے۔یہ نوع اصطلاح شرعی میں تو یمین بن سکتی ہے لیکن اہل لغت اسے یمین نہیں کہتے۔

[۱] [مسلم:۱۲۶۷/۳] [۲] [مسلم:۱۲۶۷/۳]

چونکہ یمین کے ذریعے انسان اپنے کلام کو مؤکد کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ اسی طرح شرط اور جزاء میں بھی انسان یہی ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنا کام ضرور کرے گا۔ اور جیسے قسم پر عمل نہ کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کی تعظیم باقی نہیں رہتی اسی طرح شرط اور جزاء پر عمل نہ کرنے سے ملک رقبہ اور ملک نکاح باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے ہم نے معنیً ان دونوں قسموں کو یمین کہا ہے۔

یمین تمام معاہدات اور خصومات میں تاکید کیلئے اٹھائی جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولکن یو اخذ کم بما عقد تم الایمان" [مائدہ:۸۹]

"اور لیکن پکڑتا ہے تم کو اس پر جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا"

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: لاتحلفوا بالطواغی ولا بابائکم "بتوں کی اور اپنے آباء کی قسمیں نہ اٹھایا کرو۔"[1]

اقسام یمین

یمین باللہ کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) یمین غموس (۲) یمین لغو (۳) یمین منعقدہ۔

یمین غموس

غموس کہتے ہیں ماضی یا حال کے کسی فعل پر دانستہ جھوٹی قسم اٹھانا۔ مثلاً کوئی کام نہ کیا تو علم کے باوجود جھوٹی قسم اٹھادی کہ کیا ہے۔ یا بالعکس۔ اسی طرح اگر کوئی شخص زمانہ حال کے بارے میں قسم اٹھائے کہ واللہ میرے ذمے فلاں کا قرض نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا قرض اس کے ذمے ہو اور اسے معلوم بھی ہو۔ اسے یمین غموس کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ درحقیقت یمین نہیں ہے کیونکہ یمین تو عقد مشروع کو کہتے ہیں جیسے کہ ہم ذکر کر چکے اور یہ یمین تو گناہ کبیرہ ہے لہٰذا یہ کیسے یمین ہوسکتی ہے۔ بس اسے مجازاً ہی یمین کہا جاتا ہے کیونکہ یہ صورۃً قسم ہی ہے۔

اسے غموس اس لئے کہتے ہیں کہ غموس کا معنی ہیں داخل ہونا چونکہ صاحب قسم جہنم میں جاتا ہے اس لئے اسے غموس کہتے ہیں۔ سوائے توبہ کے اس گناہ کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان الذین یشترون بعهد اللّٰه وایمانهم ثمنا قلیلا اولئک لا خلاق لهم فی الأخرة"

---

[1] [مسلم:۳/۱۲۶۷]

''جو لوگ مول لیتے ہیں اللہ کے قرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا مول، ان کا کچھ نہیں آخرت میں۔'' [بقرہ:۷۷]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الکبائر الاشراک باللّٰہ و عقوق الوالدین و قتل النفس والیمین الغموس.[۱] کبیرہ گناہ یہ ہیں۔ اللہ کے ساتھ شرک، والدین کی نافرمانی، ناحق قتل اور یمین غموس۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ کبیرہ گناہ کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الاشراک باللّٰہ ''اللہ کے ساتھ شرک'' اس نے پوچھا پھر کونسا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ثم عقوق الوالدین. ''پھر والدین کی نافرمانی'' اس نے پوچھا پھر کون سا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الیمین الغموس. وہ اعرابی کہنے لگے: یمین غموس کیا ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الذی یقتطع مال امرئ مسلم ھو فیھا کاذب. ''جو مسلمان سے ناجائز طریقہ پر مال وصول کرنے کا ذریعہ بنے اور صاحب یمین اس میں جھوٹا ہو۔''[۲]

اگر اس یمین پر کفارہ واجب ہوتا تو قرآن وحدیث میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ ویسے بھی کفارہ تو گناہوں کیلئے ساتر ہوتا ہے اور کفارہ تو ایک قسم کی عبادت ہے کیونکہ اسے روزوں کے بدلے میں ادا کیا جاتا ہے۔ اس گناہ کبیرہ سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفارے کا ذکر کیا تو فرمایا: بما عقد تم الایمان فکفارتہٗ اطعام عشرۃ مسکین. ''جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا سو اس کا کفارہ کھانا دینا ہے دس مسکینوں کو۔'' [مائدہ:۸۹] عقد میں حل وعقد دونوں کا اعتبار ہے۔ جبکہ یمین غموس میں ماضی میں متصور نہیں ہے لہٰذا یمین غموس میں صرف اور صرف توبہ ضروری ہوگی یعنی انسان اس بات کا عزم کرے کہ وہ آئندہ اس گناہ میں ہرگز مبتلا نہ ہوگا۔ اگر حقوق العباد سے متعلق یمین تھی تو توبہ کیلئے لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ الیمین الفاجرۃ التی یقتطع بھا الرجل مال المسلم تعقم الرحم. ''یمین فاجرہ وہ ہوتی ہے جس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال ناجائز طریقہ سے حاصل کر کے قطع رحمی کا ارتکاب کیا جائے۔''[۳]

اگر کوئی کسی کام کے بارہ میں کہے کہ اگر میں نے یہ کیا تو میں یہودی یا نصرانی ہوں تو یمین غموس ہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ اس کا کفارہ نہیں ہے تو کفارہ نہیں دیا جائیگا اور اگر اس کا خیال ہو کہ اس کا کفارہ ادا کیا جائے گا تو کفارہ ادا کرے۔ کیونکہ قسم اٹھانے والا حانث ہونے کی صورت

[۱] بخاری:۱۴۰۳ [۲] [بخاری:۱۴۵۱] [۳] [مسند احمد بشرح البناء:۱۴/۱۷۴]

میں یہودیت اور نصرانیت پر راضی ہے۔

یمین لغو

یمین لغو اس قسم کو کہتے ہیں کہ قسم اٹھانے والا اپنے گمان کے مطابق سچی قسم کھائے۔ جیسے کہ قسم کھائے کہ خدا کی قسم میں نے یہ نہیں کیا اور اسے یاد نہیں ہے۔ حالانکہ اس نے وہ کام کیا تھا۔ یا زمانہ کے متعلق قسم اٹھائے مثلاً دور سے کسی شخص کو دیکھ کر قسم کھا کر کہے وہ زید یا عمرو ہے۔ حالانکہ ایسا نہ ہو۔ یہ تمام یمین لغو ہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمیں امید ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس یمین پر مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لا یواخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم" [المائدۃ:۸۹]

"نہیں پکڑتا تم کو اللہ تمہاری بے ہودہ قسموں پر"

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ یمین لغو وہ ہوتی ہے جو لوگوں کی زبان پر عموماً جاری رہتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لا یواخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم "نہیں پکڑتا تم کو اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر" [مائدہ:۸۹] کی تفسیر میں ارشاد فرماتی ہیں کہ یہ آیت مبارکہ لوگوں کے اقوال لا واللّٰہ، بلی واللّٰہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[۱] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ھو کلام الرجل فی بیتہ کلا واللّٰہ و بلی واللّٰہ. "یہ لوگوں کے وہ اقوال ہیں جو وہ اپنے گھروں میں کہہ دیتے ہیں جیسے لا واللّٰہ اور بلی واللّٰہ."[۲] امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے جو اس بارے میں اچھا ترین قول سنا وہ یہ ہے کہ یمین لغو وہ قسم ہے کہ انسان اپنے یقین کے مطابق قسم اٹھالے کہ یہ کام یونہی ہے بعد ازاں وہ اس کے خلاف نکلے۔[۳]

الغرض لغو کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمیں امید ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس یمین پر مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے۔ لیکن یمین لغو کا تعلق صرف یمین باللہ کیساتھ ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے گمان کے مطابق ماضی کے کسی کام پر طلاق کا حلف اٹھالے اور پھر پتہ چلے کہ بات اس طرح نہیں تھی تو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر حج وغیرہ کی نذر مان لے تو حج لازم ہو جاتا ہے۔

---

[۱] [بخاری:۱۲۰۱]   [۲] [سنن ابی داود:۲۲۳/۳]   [۳] [الموطا:۳۱۶/۱]

یمین منعقدہ

یمین منعقدہ کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ قسم اٹھانے کے بعد وہ کام کرنا ضروری ہو۔ جیسے کسی فرض کام کو کرنا یا معاصی کو ترک کرنا وغیرہ۔

۲۔ جس میں قسم کو توڑ دینا واجب ہو۔ جیسے قسم اٹھائی کہ فلاں گناہ کروں گا یا فلاں فرض چھوڑ دوں گا۔ یا فلاں کو قتل کروں گا یا والدین سے گفتگو نہیں کروں گا وغیرہ۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ **من حلف علی یمین ثم رای خیرا منها فلیأت الذی هو خیر.** ''اگر کوئی شخص کسی کام کی قسم اٹھائے پھر اسے خیر کسی اور کام میں نظر آئے تو وہ خیر والا کام کرے۔''[1]

۳۔ جس میں قسم توڑ دینا اس پر عمل سے بہتر ہو۔ جیسے کسی مسلمان سے ترک تعلق وغیرہ کی قسم۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ **لا احلف علی یمین فاری غیرها خیرا منها الا اتیت الذی هو خیر و تحللتها.** ''اگر میں کسی کام کی قسم اٹھالیتا ہوں پھر اس کے ترک میں خیر نظر آئے تو میں اسے ترک کر دیتا ہوں اور قسم توڑنے کا کفارہ ادا کر دیتا ہوں۔''[2]

۴۔ جس میں قسم کو توڑنا اور نہ توڑنا برابر ہو۔ اس میں قسم کو نہ توڑنا بہتر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **واحفظوا ایمانکم** ''اور حفاظت رکھو اپنی قسموں کی۔'' [مائدہ: ۸۹] اور اگر انسان قسم توڑ دیگا تو اس پر کفارہ لازم ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**ولکن یواخذکم بما عقدتم الایمان**'' [مائدہ:۸۹]

''اور لیکن پکڑتا ہے اس پر جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا۔''

قسم توڑنے سے کفارہ ضرور لازم ہوتا ہے۔ چاہے انسان دانستہ قسم توڑے یا مجبوری سے یا بھول کر۔ کیونکہ کفارہ کیلئے حنث شرط ہے۔ جب شرط پائی گئی تو کفارہ تو لازم ہو جائیگا تاہم اکراہ اور نسیان کیصورت میں حالف گناہگار نہیں ہوتا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: **ان اللّٰه رفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرهوا علیه.** ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری امت سے خطاء ونسیان اور مجبوری کو ختم کر دیا۔'' یعنی ان کا گناہ ختم ہو گیا لیکن حکم باقی ہے۔

---

۱ [مسلم: ۱۲۷۳/۲] ۲ [مسلم: ۱۲۷۰/۲]

بچے، مجنون اور سوئے ہوئے شخص کی قسم معتبر نہیں ہے۔ جیسا کہ طلاق میں گزر چکا۔

کس کی قسم اٹھائی جائے؟

قسم ہوتی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام اور اس کی صفتِ ذاتی کی۔ اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی رحمت، اس کی ناراضگی اور اس کے غصہ کی قسم نہیں ہوتی۔ قسم میں نیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سوائے ان اسماء کے ساتھ قسم میں جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان مشترک ہیں جیسے کبیر، قادر اور عزیز وغیرہ۔ اگر ان اسماء میں قسم کا ارادہ ہو تو قسم ہوتی ہے اور اگر قسم کا ارادہ نہ ہو تو قسم نہیں ہوتی۔

صفات باری تعالیٰ کی دو قسمیں ہیں: (۱) صفات ذاتی (۲) صفات فعلی۔ جس صفت کی ضد کے ساتھ خدا تعالیٰ کو متصف نہ کیا جا سکتا ہو اسے صفت ذاتی کہتے ہیں۔ جیسے قدرت، عزت، علم اور عظمت۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم تھی لاَ وَمُقَلِّبِ الْقُلُوْبِ[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ اَعُوْذُ بِعِزَّتِکَ[2] اور جس صفت کی ضد کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کو متصف کیا جاتا ہو اسے صفت فعلی کہتے ہیں۔ جیسے رحمت و رأفت اور سخط و غضب وغیرہ۔

صف ذاتی کے ساتھ جب بھی قسم اٹھائی جائیگی تو وہ یمین ہوگی۔ کیونکہ ذات خداوندی کی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں سوائے علم اللہ کے کیونکہ کبھی علم سے معلوم بھی مراد ہوتا ہے۔ اس شک کی بناء پر اسے قسم نہیں کہا جائیگا۔ اسی طرح کبھی رحمت بول کر بارش مراد ہوتی ہے کبھی نعمت بول کر جنت مراد ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ففی رحمة الله هم فيها خلدون'' [مائدہ:۱۰۷]

''سو رحمت میں ہیں اللہ کی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اور کبھی سخط و غضب سے عذاب جہنم مراد ہوتا ہے۔ اور کبھی رضاء سے مراد ثواب جنت ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص کہے وجہ اللہ کی قسم تو یہ قسم ہے کیونکہ وجہ اللہ سے مراد ذات خداوندی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے و يبقى وجه ربك. (رحمن)

اگر کوئی شخص کہے حق اللہ کی قسم تو طرفین کے نزدیک یمین نہیں ہے کیونکہ حق اللہ تو ہے بندے پر اطاعت خداوندی۔ ہاں اگر کوئی شخص کہے حق کی قسم تو یہ قسم ہے کیونکہ حق اللہ تبارک وتعالیٰ

---

[1] [الاختیار:۵۲/۴] [2] [بخاری:۱۴۰۰]

کا نام ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص کہے حقاً علی تو یہ یمین ہے۔ اگر کہے لا إلٰہ إلاّ اللّٰہ لا فعلن تو بغیر نیت کے یمین نہیں ہے۔ اسی طرح سبحان اللہ، اللہ اکبر اور بسم اللہ بغیر نیت یمین نہیں ہیں۔ ہاں اگر نیت ہوگی تو یمین ہے۔

اگر کہے کہ اللہ کیلئے میرے ذمہ ہے کہ میں فلاں فلاں سے بات نہیں کروں گا۔ تو یہ یمین نہیں ہے جب تک کہ نیت نہ کرلے اگر نیت کرلے گا تو یمین ہے۔ پھر اگر بات کرے گا تو حانث ہوجائیگا اور کفارہ لازم ہوگا۔

اگر کوئی شخص کہے کہ میں قرآن سے، قبلہ سے، نبیؐ سے، نماز، روزہ وغیرہ سے بری ہوں تو یہ قسم ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کہے کہ میں صلیب کا پجاری ہونگا یا میں یہودی یا عیسائی ہوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من حلف بملة سوی الاسلام كذبا فهو كما قال.** "جس شخص نے ملت اسلام کے سوا کسی اور ملت کی جھوٹی قسم کھائی تو وہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے کہا۔"[1] نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے **من حلف انه برئ من الاسلام فان كان كاذبا فهو كما قال و ان كان صادقا فلن يرجع الى الاسلام سالما.** "جس شخص نے قسم کھائی کہ وہ اسلام سے بری ہے تو اگر وہ جھوٹا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا اور اگر وہ سچا ہے تو سلامتی کے ساتھ سلام کی طرف نہیں لوٹے گا۔"[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو شخص یہودی یا عیسائی ہونے کا حلف اٹھاتا ہے تو وہ یمین ہے۔[3]

حروف قسم

حروف قسم با، واؤ اور تا ہیں۔ یہ تمام حروف قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **واللّٰہ ربنا** "قسم ہے اللہ کی جو ہمارا رب ہے۔[انعام:۲۳] نیز ارشاد ہے **يحلفون باللّٰہ** "وقسمیں کھاتے ہیں اللہ کی" [توبہ:۷۴] اور ارشاد ہے۔ **تاللّٰہ لقد ارسلنا** اگر کوئی شخص کہے لِلّٰہِ تو یہ بھی قسم ہے کیونکہ لام با سے تبدیل شدہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **أمنتم به** اور **أمنتم له**

باء اسم ظاہر اور اسم ضمیر دونوں پر داخل ہوتی ہے۔ باللّٰہ بھی کہا جاسکتا ہے اور بِہٖ بھی۔ یہ تمام حروف میں اعم ہے۔ اور واؤ تا سے عام ہے۔ اسلئے کہ واؤ تمام اسمائے خداوندی اور تمام صفات خداوندی پر داخل ہوجاتی ہے جبکہ تا صرف لفظ اللہ پر داخل ہوتی ہے۔ تا اللّٰہ تو کہا جاسکتا ہے لیکن

---

[1] [مسند احمد بشرح البنا:۱۴/۱۶۸] [2] [مسند احمد بشرح البنا:۱۴/۱۶۸]

[3] [مسند احمد بشرح البنا:۱۴/۱۶۹]

تاالرحمٰن نہیں کہا جاسکتا۔

اگر حرف قسم کو حذف کر دیا جائے تو اس کی تین صورتیں ہیں۔(۱) آخر سے ساکن ہو تو قسم نہیں ہے۔(۲) آخر مکسور ہو تو قسم ہے۔(۳) اگر نصب ہو تو اس میں اختلاف ہے۔

اگر کوئی شخص کہے لعمر اللہ، ایم اللہ، وعہد اللہ، ومیثاقہ، علی نذر اور نذر اللہ تو یہ بھی تمام الفاظ قسم ہیں۔ عمر اللہ تو اس لئے کہ اس سے مراد بقاء ہے اور بقاء صفت خداوندی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے لعمرک انهم لفی سکرتهم یعمهون "قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں۔" [حجر:۷۲] ایم اللہ کا معنی ہے ایمن الله. یہ یمین کی جمع ہے۔ عہد اللہ کا بارہ میں ارشاد خداوندی ہے۔ واوفوا بعهد الله اذا عهدتم. "اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو۔" [نحل:۹۱] اور پھر فرمایا ولا تنقضوا الایمان "اور نہ توڑو قسموں کو" [نحل:۹۱] پس ثابت ہوا کہ عہد یمین کو بھی کہتے ہیں۔ میثاق بھی عرفاً عہد ہی کو کہا جاتا ہے۔ نذر بھی قسم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کفارة النذر کفارة الیمین. "نذر کا کفارہ یمین کا کفارہ ہے۔"[1]

اگر کوئی شخص کہے أحلف یا اقسم یا اشهد اور اس میں اسم خداوندی کا بھی ذکر کرے تو یہ یمین ہے۔ اگر کہے اعزم یا اعزم بالله یا علی یمین یا یمین الله تو یہ بھی یمین ہے۔ أحلف أشهد. اور أقسم تو اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے یحلفون لکم لترضوا عنهم. "اور وہ لوگ قسمیں کھائیں گے آپ کے سامنے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔" [توبہ:۹۶] اور قالوا نشهد انک الرسول الله. "(منافقین) کہیں ہیں ہم قائل ہیں کہ تو رسول ہے اللہ کا۔" [منافقون:۱] پھر فرمایا: اتخذوا ایمانهم جنة. "انہوں نے رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال بنا کر۔" [منافقون:۲] نیز ارشاد فرمایا: اذا اقسموا لیصرمنها مصبحین ○ ولا یستثنون. "جب ان سب نے قسم کھائی کہ اس کا میوہ توڑیں گے صبح اور ان شاء اللہ نہ کہا۔" [قلم:۱۷-۱۸] امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ استثناء صرف قسم میں ہوسکتا ہے۔ أعزم اور أعزم بالله اس لئے الفاظ قسم ہیں کہ عزم ایجاب کو کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ و ان عزموا الطلاق. "اور اگر ٹھہرا لیا چھوڑ دینے کو"

علی یمین اور یمین الله میں یمین کی تصریح ہے اور یمین صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ہوتی ہے۔

فقالت یمین الله مالک حیلة　　　وما أن أری عنک الغوایة تنجلی

---

[1] [ابوداؤد:۳/۲۴۱]

''وہ کہنے لگی خدا کی قسم تمہارے لئے کوئی حیلہ نہیں ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ تمہاری سرکشی ختم ہوگی۔''[1]

جو الفاظ قسم نہیں ہیں

پہلے گزر چکا ہے کہ ان اسماء کیساتھ قسم اٹھانا جو اللہ اور بندوں کے درمیان مشترک ہیں جب حالف کا ان سے یمین کا ارادہ نہ ہو تو یمین نہیں ہے۔ حق اللہ کی یمین یمین نہیں ہے۔ للّٰہ علیَّ بغیر نیت کے یمین نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی اور مثلاً نبی، کعبہ، قرآن وغیرہ کی قسم یمین نہیں ہے۔ اصل یہی ہے کہ غیر اللہ کا حلف جائز نہیں ہے۔ ایک شخص حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کیا میں کعبہ کی قسم کھا سکتا ہوں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رب کعبہ کی قسم کھاؤ! حضرت عمرؓ اپنے باپ کی قسم کھاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: **لا تحلف لابیک فانہ من حلف بغیر اللّٰہ فقد اشرک.** ''اپنے باپ کی قسم نہ اٹھاؤ! جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی، اس نے شرک کیا۔''[2] شرک کا لفظ زجراً ارشاد فرمایا۔ جبکہ بعض حضرات اسی لفظ کی وجہ سے اسے حرام کہتے ہیں۔ اس لئے بھی کہ حلف ہوتا ہے محلوف بہ کی تعظیم کیلئے اور تعظیم صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کی ہے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ حلف ہوتا ہی نہیں تو کفارہ بھی لازم نہ ہوگا۔

اگر کسی شخص نے کہا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میں زانی یا شرابی ہوں یا مجھ پر اللہ کا غضب اترے۔ یہ یمین نہیں ہے۔

کسی حلال کو حرام بنا لینے کا حکم

اگر کسی شخص نے خود پر اپنی کوئی مملوکہ چیز حرام کرلی۔ اب اگر اس چیز کو یا اس میں سے بعض کو استعمال میں لائے گا تو اس پر کفارہ لازم ہو جائیگا۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ یہ کھانا مجھ پر حرام ہے یا میرے لئے اس کا کھانا حرام ہے یا میرے اوپر میرا مال حرام ہے۔ تو وہ محرم لعینہ نہیں ہے۔

کیونکہ شریعت میں اس کی نظیر موجود ہے۔ پھر حرمت کا تعلق اس تمام چیز کے ساتھ ہوگا۔ اس کا جو جزو بھی استعمال ہوگا یہ حانث ہو جائیگا جیسے کوئی شخص کہے کہ میرے لئے پانی پینا حرام ہے۔ اب اگر وہ پانی صدقہ یا ہبہ کرتا ہے تو حانث نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ حرام سے مراد تھی کہ میں اس سے عرف والا فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔

---

[1] [دیوان امرؤ القیس ص ۱۲] [2] [مسند احمد بشرح البناء: ۱۶۴/۴]

''ہر حلال مجھ پر حرام ہے'' کا حکم

اگر کوئی شخص کہے کہ ہر حلال مجھ پر حرام ہے تو اس کا اطلاق کھانے پینے پر ہوگا۔ اگر کسی اور چیز کی نیت نہ کرے۔

اور اس سے کھانا پینا ہی مراد ہوگا کیونکہ یہ لفظ عام طور سے کھانے پینے کیلئے ہی استعمال ہوتا ہے۔ ہاں اگر اس نے اپنی بیوی کی بھی نیت کر لی تو کھانے پینے کے ساتھ ساتھ وہ بھی شامل ہوگی۔ اگر صرف اپنی بیوی کی نیت کی تو صرف اس کی بیوی اس قسم میں شامل ہوگی لہٰذا کھانے پینے سے حالف حانث نہیں ہوگا۔

ہمارے مشائخ فرماتے ہیں یہ کہنے سے غلبۂ استعمال کی وجہ سے بغیر نیت طلاق واقع ہو جائیگی اور اگر چار بیویاں ہوں تو ہر بیوی پر ایک طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اس کی بیوی ہی نہ ہو تو یہ یمین پھر بھی منعقد ہوگی اور اس پر کفارہ لازم ہوگا۔

اگر کوئی شخص کہے کہ فلاں کا مال مجھ پر حرام ہے۔ پھر اس نے اس کا مال کھا لیا یا اسے خرچ کر دیا تو حانث ہو جائیگا۔ الا یہ اس کی نیت یہ ہو کہ اس کا مال حرام ہے میرے لئے حلال نہیں ہے تب حانث نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ حرام کا ارتکاب نہیں کرے گا تو اس کا اطلاق زنا اور حرام بوس و کنار وغیرہ پر ہوگا خواہ مجبوب ہی ہو۔

اگر قسم کھائی کہ حرام وطی نہیں کرے گا، پھر اپنی بیوی سے حالت حیض یا ظہار کی صورت میں وطی کر لی تو حانث نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس کی بھی نیت ہو تو پھر حانث ہوگا۔ کیونکہ مذکورہ حرمت ایک عارض کی بناء پر ہے۔ فی ذاتہ یہ وطی حرام نہیں ہے۔

کفر اور ارتداد کی حالت میں قسم کھانا

اگر کافر نے حالت کفر میں قسم کھائی پھر حالت کفر میں ہی حانث ہو گیا یا اسلام لانے کے بعد حانث ہو گیا تو اس پر کچھ (کفارہ) نہیں، کیونکہ کافر یمین (قسم) کا اہل نہیں، اس لئے کہ قسم کا انعقاد اللہ تعالیٰ کی عظمت کے لئے ہوتا ہے اور کفر اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لائق نہیں اور نہ ہی کفر، کفارہ کی اہلیت رکھتا ہے۔ کیونکہ کفارہ عبادت ہے کہ یہ روزے سے بھی ادا ہو جاتا ہے، حالانکہ وہ اس کا اہل نہیں ہے۔

اگر کسی نے قسم کھائی پھر مرتد ہو گیا (نعوذ باللہ) تو ارتداد کے باعث اس کی قسم باطل ہو

جائیگی، لہٰذا اگر اس کے بعد اسلام قبول کرلیا تو اس صورت میں بھی اس پر کفارہ لازم نہ ہوگا، کیونکہ ارتداد سے اعمال باطل ہوجاتے ہیں۔

قسم کے ساتھ ہی ان شاء اللہ کہنا

اگر کسی نے کسی معاملہ میں قسم کھائی اور الفاظ قسم ادا کرنے کے متصل ہی ان شاء اللہ کہہ دیا تو قسم ٹوٹنے پر حانث نہیں ہوگا اور اس کے لئے متصلاً ان شاء اللہ کہنا ضروری ہے۔ کیونکہ خاموش رہنے سے کلام مکمل ہوجاتا ہے اور بعد از سکوت انشاء اللہ کہنا رجوع ہے، جب کہ قسم میں رجوع کا جواز نہیں ہے۔

اس کی دلیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''جس نے کسی بات پر قسم کھائی اور (معاً) انشاء اللہ کہا تو اس نے استثناء کیا۔''[1] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قسم کھائی پھر استثناء کیا (انشاء اللہ کہا) تو چاہے رجوع کرے اور چاہے ترک کردے حانث نہیں ہوگا''[2]

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سلیمان بن داوٗد علیہما السلام نے کہا کہ ''آج رات میں اپنی ستر ازواج سے ضرور ہمستر ہوں گا، پھر ہر بیوی ایک لڑکا جنے گی جو جہاد فی سبیل اللہ کریگا، کسی نے ان سے کہا کہ انشاء اللہ کہو، لیکن وہ نہ کہہ پائے، چنانچہ تمام بیویوں سے ہمستر ہوئے مگر ایک ہی بیوی سے آدھے دھڑ کا بچہ پیدا ہوا۔'' (راوی) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر سلیمان علیہ السلام انشاء اللہ کہتے حانث نہ ہوتے اور اپنا مقصود بھی پالیتے۔''[3]

قسم کا کفارہ

ارشاد خداوندی ہے:

لَایُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمٰنَ ۔ فَکَفَّارَتُہٗ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَاتُطْعِمُوْنَ اَھْلِیْکُمْ اَوْکِسْوَتُھُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ ذٰلِکَ کَفَّارَۃُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَیْمَانَکُمْ'' [المائدۃ:۸۹]

''اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری قسموں میں لغو قسم پر مؤاخذہ نہیں فرماتے لیکن

---

[1] [سنن ابی داوٗد:۳/۲۵] [2] [ایضاً] [3] [صحیح مسلم:۳/۱۲۷۵]

مؤاخذہ اس پر فرماتے ہیں کہ تم قسموں کو مستحکم کردو۔ سو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے اوسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو۔ یا ان کو کپڑا دینا یا غلام کا آزاد کرنا ہے۔ اور جس کی مقدور نہ ہو تو تین دن کے روزے ہیں۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب کہ تم قسم کھالو۔ اور اپنی قسموں کا خیال رکھا کرو۔"

حضور اکرم ﷺ نے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "جب تم کسی بات پر قسم اٹھاؤ، پھر اس کے علاوہ چیز کو اس سے بہتر خیال کرو تو اپنی قسم کا کفارہ دے کر اس بہتر چیز کو کرلو۔"[1] مطلب یہ ہے کہ قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرو۔ جیسا کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "جو شخص کس بات پر قسم اٹھائے پھر اس کے سوا چیز کو اس سے بہتر جانے تو اس بہتر بات کو بجالائے اور اپنی قسم کو چھوڑ دے۔"[2]

قسم کا کفارہ غلام کا آزاد کرنا ہے۔ اور اگر چاہے تو دس محتاجوں کو متوسط درجہ کا کپڑا دیدے جس سے وہ نفع اٹھا سکیں اور اگر عورت کو کپڑا دے تو اس کے ساتھ ایک بڑی چادر بھی دے جس سے وہ اپنا سارا جسم ڈھانپ سکے، اس لئے کہ عورت کا سر بھی قابل ستر چیز ہے۔ اس کے لئے سر کھلا رکھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

اور اگر چاہے تو دس محتاجوں کو بطور تملیک کھانا دے، اس کی صورت یہ ہے کہ ہر محتاج کو نصف صاع گندم یا اس کا آٹا یا ستو یا ایک صاع کھجور یا کشمش دیدے، صحیح قول یہ ہیکہ اس کا بھی نصف صاع کافی ہوگا۔ یا پھر ان محتاجوں کو صبح وشام دو وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھلا دے۔ یا دو دن شام کو یا دو دن صبح کو یا شام اور سحری کے دو وقت میں کھلا دے اور یہ کھانا اپنے گھر کے کھانے کی طرح ہو۔

اگر ایک ہی محتاج کو دس دن صبح وشام کھانا دیا تو کافی ہوگا اور اگر دس محتاجوں کو صبح کا کھانا دیا اور اس کے علاوہ دوسرے دس محتاجوں کو شام کا کھانا دیا تو کافی نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک محتاج کو صبح کھانا دیا اور اس کے سوا کسی اور شخص کو دس دن شام کا کھانا دیا تو بھی کافی نہ ہوگا، اس لئے کہ اس نے دس کا کھانا بیس پر تقسیم کر دیا اور اگر ایک محتاج کو بیس دن تک صبح کا کھانا دیا یا رمضان میں بیس راتیں شام کا کھانا دیا تو کافی ہو جائے گا۔

اگر ایک محتاج کو ایک ہی دن میں دس محتاجوں کا کھانا دیدیا تو کافی نہ ہوگا اور اگر کھانے کی قیمت دس محتاجوں کو دیدے تو کافی ہوگا۔

---

1 [صحیح مسلم: ۳/۱۲۷۳] 2 [ایضاً]

جس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں اس کو کفارہ دینا بھی جائز نہیں، جیسے والدین اور اولاد وغیرہ اور جیسے مساجد کی تعمیر میں اس کفارے کو صرف کرنا ناجائز ہے۔ اگر مذکورہ تین چیزوں (غلام آزاد کرنے، کپڑا دینے اور کھانا دینے) میں سے کسی چیز کے دینے کی طاقت نہ ہو تو مسلسل تین روز روزے رکھے، یہ تنگ دست آدمی کا کفارہ ہے اور پہلا فراخ دست آدمی کا کفارہ ہے۔ کفارۂ یمین میں مال داری کی حد یہ ہے کہ کفارہ میں کفایت کردہ مقدار سے زائد حاصل ہو، اور تمام کفارات میں کفارہ دینے والے کے اس حال کا اعتبار کیا جاتا ہے جو کفارہ ادا کرتے وقت ہو۔ اور اس حال کا اعتبار نہیں ہے جو کفارہ واجب ہونے کے وقت تھا، لہٰذا اگر کفارہ ادا کرتے وقت وہ شخص مفلس ہے تو اس کو روزے رکھنا جائز ہے، اگرچہ وہ کفارہ واجب ہونے کے وقت مال دار تھا اور اس کے برعکس اگر کفارہ واجب ہونے کے وقت مفلس تھا اور ادائیگی کے وقت مالدار ہو گیا تو اس کو روزے رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ مفلس کے لئے کفارہ کے صحیح ہونے کے لئے پے در پے روزے رکھنا شرط ہے، اگر متفرق طور پر روزے رکھے تو جائز نہیں ہوگا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اختیار ہے، خواہ پے در پے روزے رکھے یا متفرق طور پر دونوں طرح جائز ہے۔ اگر مفلس نے روزے رکھنا شروع کئے پھر درمیان میں مال دار ہو گیا تو افضل یہ ہے کہ اس دن کا روزہ پورا کرے اور اگر افطار کر لے (توڑ دے) تو ہمارے نزدیک اس پر قضا واجب نہیں ہوگی۔ اگر کفارہ حانث ہونے سے پہلے ادا کر دیا تو ہمارے نزدیک کافی نہیں ہوگا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے لیکن اگر روزوں کی صورت میں کفارہ ادا کرے تو جائز نہیں، اس صورت میں حانث ہونے کے بعد ہی کفارہ دینا جائز ہے۔

باہر جانے اور داخل ہونے پر قسم اٹھانے کی مثالیں

کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔ پھر اس نے کسی کو نکالنے کا کہا اور اس نے اس کو باہر نکالا تو حانث ہو جائے گا۔ اس لئے کہ حکم دینے کی وجہ سے وہ فعل اس کی طرف منسوب ہوگا۔ پس اگر بالجبر نکالا گیا تو حانث نہیں ہوگا۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ اپنے کام کے سوا اور کسی کام کیلئے نہیں نکلے گا۔ چنانچہ اپنے کام کے لئے نکلا اور پھر کوئی دوسرا کام بھی کر لیا تو حانث نہیں ہوگا۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ اپنے فلاں دوست کی طرف نہیں جائیگا، پھر اس کے ارادے سے نکلا پھر راستہ سے ہی واپس ہو گیا تو حانث ہوگا۔ اگر قسم اٹھائی کہ اس کی بیوی اپنے اہل (گھر) کے سوا کہیں اور نہ نکلے تو صرف اس کے ماں باپ کا گھر مراد ہوگا۔ اگر اس کے والدین موجود نہ ہوں تو اس کا ہر ذی محرم رشتہ دار مراد ہوگا۔ اگر اس عورت کے باپ نے اس کی ماں کے علاوہ کسی عورت

سے شادی کی ہوئی ہو یا اس کی ماں نے اس کے باپ کے علاوہ کسی اور سے شادی کی ہوئی ہو تو باپ کے اہل خانہ مراد ہونگے، ماں کے مراد نہ ہوں گے۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ جدہ کی طرف نہیں نکلے گا، پھر گھر سے نکلا تو حانث نہیں ہوگا جب تک کہ جدہ کے ارادہ سے اپنی آبادی کی حدود سے نہ گزر جائے۔ اس لئے کہ جدہ کے لئے نکلنا سفر ہے۔ اور سفر کے لئے آبادی کی حدود سے تجاوز ضروری ہے۔

کسی نے قسم اٹھائی کہ اس کی بیوی اس کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گی تو ہر بار اس کی اجازت لینا ضروری ہوگا۔ اور اگر وہ ایک ہی بار اجازت لینے کی نیت کرے تو اس کی تصدیق کی جائے گی، کیونکہ اس کے کلام میں اس کا احتمال موجود ہے۔ اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ تم (بیوی) باہر نہ نکلو تاوقتیکہ میں تمہیں اجازت نہ دیدوں تو ایک ہی بار اجازت دینا کافی ہوگا۔ چنانچہ اگر عورت اس کے بعد اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلی تو خاوند حانث نہیں ہوگا۔

اگر قسم اٹھائی کہ اس کی بیوی اس کی اجازت سے ہی گھر سے نکلے گی پھر اس کو ایک مرتبہ اجازت دی اور وہ گھر سے نکلی، پھر دوسری بار اس کی اجازت کے بغیر نکلی تو حانث ہو جائے گا، ہر بار باہر جانے کے لئے اجازت کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ اگر قسم اٹھائی کہ فلاں کے فلیٹ میں داخل نہ ہوں گا، پھر اس کی گزرگاہ میں داخل ہوا تو حانث ہوگا، اس لئے کہ گزرگاہ اسی کا حصہ ہوتی ہے۔ اگر ایک پاؤں داخل کیا دوسرا داخل نہیں کیا تو دیکھیں گے کہ اگر دونوں قدموں کا فاصلہ برابر ہو یا دوسری جانب اسفل ہو تو حانث نہیں ہوگا، اور اگر داخل ہونے والی جانب اسفل تھی تو حانث ہوگا۔ اس لئے کہ سارے جسم کا مدار اس کے داخل ہونے والے پاؤں پر ہے، ایسی صورت میں وہ داخل ہونے والا شمار ہوگا۔ اگر قسم اٹھائی کہ میں فلاں کے فلیٹ میں داخل نہیں ہوگا جس میں کوئی دوسرا شخص رہائش پذیر ہے، تو اس میں داخل ہونے سے حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہاں نسبت سکونت کی طرف ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حانث ہو جائے گا، اس لئے کہ وہ فلیٹ مالک کی طرف ملک رقبہ کے طور پر اور مستاجر کی طرف ملک منفعت کے طور پر منسوب ہے اور دونوں حقیقت ہیں۔

کسی نے قسم اٹھائی کہ فلاں کے گھر میں داخل نہیں ہوگا پھر ایسے گھر میں داخل ہوا جو اس کے اور فلاں کے درمیان مشترک ہے اور فلاں شخص اس میں سکونت رکھتا ہے تو حانث نہیں ہوگا، لیکن اگر قسم اٹھائی کہ مشترک زمین میں کھیتی باڑی نہیں کرے گا تو حانث ہو جائے گا، کیونکہ زمین کا ہر جزو (حقیقت میں) زمین ہی ہے۔ جب کہ گھر کا ایک حصہ عرف عام اور نامزدگی کے لحاظ سے گھر نہیں کہلاتا۔

کسی نے قسم اٹھائی کہ فلاں عورت کے فلیٹ میں داخل نہیں ہوگا، پھر اس کے فلیٹ میں

داخل ہوا، جبکہ اس عورت کا شوہر اس میں رہائش پذیر ہے تو حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ فلیٹ کی نسبت رہائش رکھنے والے کی طرف ہوتی ہے۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ چارپائی پر نہیں بیٹھے گا پھر ایسی چارپائی پر بیٹھ گیا جس کے اوپر بستر بچھا ہوا تھا تو حانث ہوگا۔ جس نے قسم اٹھائی کہ یہ کپڑا نہیں پہنے گا جبکہ وہ کپڑا اس نے پہنا ہوا ہے پھر اسی وقت اس کو اتار دیا تو حانث نہیں ہوگا اور اگر قسم کے بعد ایک لمحہ بھی رکا تو حانث ہوگا۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ اس فلیٹ میں سکونت اختیار نہیں کرے گا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تمام اہل وعیال اور سامان سمیت وہاں سے نکل جائے، کیونکہ بطور استقرار کے سکونت پذیر ہونا اپنے اہل وعیال اور گھریلو سامان وغیرہ کے ساتھ ہی متحقق ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس گھر سے اپنے مال واسباب کا اکثر حصہ اٹھالیا تو حانث نہیں ہوگا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر وہ وہاں سے اتنا مال واسباب نکال کرلے گیا کہ اس سے امور خانہ داری وازدواجی زندگی اور معاشی ضروریات کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں تو حانث نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اکثر کا اعتبار ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ضروریات زندگی کا اعتبار ہے۔ عطاء فرماتے ہیں کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول زیادہ بہتر اور لوگوں کیلئے بہت آسان اور سہل ہے۔ لہٰذا اگر قسم اٹھانے کے وقت سے ہی گھریلو سامان منتقل کرنا شروع کیا اور اس پر ایک ماہ کا عرصہ لگ گیا تو حانث نہیں ہوگا۔

یمین فور

بیوی نے گھر سے باہر جانے کا ارادہ کیا اور خاوند نے اسی وقت اس کو کہا کہ اگر تو باہر نکلی تو تجھے طلاق ہے، (یہ سن کر) بیوی بیٹھ گئی، پھر باہر نکلی تو طلاق نہ ہوگی، اس لئے کہ خاوند کا مقصد اس کو ایسے خروج (نکلنے) سے منع کرنا ہے جس کا اس عورت نے ارادہ کیا تھا، ایسی قسم کو یمین فور کہتے ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سب سے پہلے ظاہر کیا ہے۔

خاوند نے بیوی سے مجامعت کا ارادہ کیا اور بیوی نے انکار کیا۔ اس پر خاوند نے اس کو کہا کہ اگر تو میرے ساتھ کمرے میں داخل نہ ہوئی تو تجھے طلاق ہے، پھر وہ خاوند کی شہوت کے ختم ہونے کے بعد اس کمرے میں داخل ہوئی تو طلاق ہوجائے گی، اس لئے کہ خاوند کا کمرہ میں داخل ہونے سے مقصد شہوت کا پورا کرنا تھا جو کہ اب ختم ہوگئی ہے۔ لہٰذا حنث کی شرط پائی گئی، کیونکہ وہ قضائے شہوت کی خاطر کمرہ میں داخل نہیں ہوئی۔

بات کرنے یا نہ کرنے پر قسم اٹھانے کی مثالیں

کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ اس شخص سے چند روز تک بات نہیں کرے گا، تو اس سے تین دن مراد ہونگے۔ اور اگر قسم اٹھائی کہ وہ اس سے مہینوں بات نہیں کرے گا تو یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دس ماہ پر محمول ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک بارہ ماہ پر محمول ہوگا۔

کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ کلام نہیں کرے گا، پھر اس نے قرآن پڑھا یا تسبیح یا تہلیل (لا إله إلاّ الله پڑھنا) کہی تو حانث نہیں ہوگا۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ اس سے ایک ماہ تک بات نہیں کرے گا تو اس کی ابتداء قسم اٹھانے کے وقت سے ہوگی۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ فلاں سے بات نہیں کریگا۔ پھر اس سے اس طرح بات کی کہ اس نے سن لی تو حانث ہوگا۔ مگر یہ کہ وہ شخص سویا ہوا ہو۔ اور اگر بات کسی اور سے کی لیکن مقصد اسی کو سنانا تھا تو حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس نے اس سے حقیقۃً بات نہیں کی اور اگر ایک جماعت کو سلام کیا جس میں وہ بھی موجود تھا تو حانث ہو جائے گا۔ اس لئے کہ سلام کرنا سب سے کلام کرنا ہے، لیکن اگر سلام میں اس کی نیت نہ ہو بلکہ صرف دوسروں کی نیت ہو تو حانث نہ ہوگا۔

کسی نے حلف اٹھایا کہ فلاں کی بیوی سے کلام نہیں کرے گا۔ پھر فلاں نے اس کو طلاق دے دی، پھر اس نے (حالف نے) اس عورت سے کلام کیا تو حانث ہوگا۔ اگر رات کو کہا کہ میں فلاں آدمی سے دن کو بات نہیں کروں گا تو حلف اٹھانے کے وقت سے لیکر اگلے دن کے غروب آفتاب تک اس کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر دن کو کہا کہ میں فلاں آدمی سے رات کو بات نہیں کروں گا تو حلف اٹھانے کے وقت سے لے کر اگلے دن کی طلوع فجر تک اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور اگر دن کے کسی حصہ میں کہا کہ فلاں سے دن کے وقت بات نہیں کرے گا تو یہ دن رات کے باقی ماندہ حصے اور اگلے دن کی اس ساعت تک پر محمول ہوگا۔ اور اگر رات کے کسی حصہ میں کہا کہ فلاں سے رات کے وقت بات نہیں کروں گا تو یہ قسم اٹھانے کے وقت سے لے کر آئندہ رات کی اس ساعت پر محمول ہوگا۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ فلاں کے بھائیوں سے بات نہیں کرے گا تو بوقت قسم جو بھائی موجود ہونگے صرف وہی مراد ہونگے، دوسرے نہیں، پس اگر اس کے بہت سے بھائی ہوں تو حانث نہیں ہوگا جب تک کہ ان سب سے بات نہ کریگا۔

کھانے پر قسم اٹھانے کی مثالیں

کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ اپنے شریک کا کھانا نہیں کھائے گا، پھر ایسا کھانا کھالیا جو دونوں میں مشترک تھا تو حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس نے اپنا حصہ کھایا۔ کسی نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ سال کا پھل نہیں کھائے گا تو ان پھلوں کے کھانے سے حانث ہو جائے گا، سیب، بہی، امرود، ناشپاتی، خوبانی، آڑو، انجیر، تربوز اور خشک پھل، شہتوت، گنا اور ناپختہ کھجور۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر یہ قسم اٹھائی کہ سال کے پھل نہیں کھائے گا اور وہ موسم تازہ چیزوں کا ہو تو پھر یہ تر و تازہ پھلوں پر محمول ہوگا۔ جیسے تر و تازہ کھجور، انگور، انار، کھیرا، ککڑی، گاجر، سبز لوبیا، کھجور۔ کشمش اور انار کے دانے ادام (سالن) میں آتے ہیں پھل نہیں رہتے، اور خشک اخروٹ پھل میں نہیں آتا۔ بھنا ہوا گوشت اور انڈے۔ جبکہ پنیر بھی عام عرف میں ادام (سالن) میں آتا ہے، اگرچہ از روئے لغت اس پر ادام کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اگر قسم اٹھائی کہ وہ صبح کا کھانا نہیں کھائے گا تو اس سے طلوع فجر سے ظہر تک کا کھانا مراد ہوگا، کیونکہ عربی میں غداء (صبح کا کھانا) غدوۃ کے کھانے سے عبارت ہے جب کہ نصف نہار کے بعد غدوہ کا اطلاق نہیں ہوتا، پس اگر اس نے ظہر کے بعد کھالیا تو حانث نہیں ہوگا، اگر قسم اٹھائی کہ شام کا کھانا نہیں کھائیگا تو اس سے مراد ظہر سے نصف شب تک کا کھانا مراد ہوگا، اس لئے کہ عربی زبان میں عشاء اس کھانے کو کہتے ہیں جس کی ابتداء زوال کے بعد ہو، پس اگر اس نے نصف شب کے بعد کھالیا تو حانث نہیں ہوگا۔ اور نصف شب سے مراد مغرب اور فجر کے درمیان کا نصف حصہ ہے۔ اگر قسم اٹھائی کہ سحری نہیں کھائے گا تو اس سے مراد نصف شب سے طلوع فجر کے درمیان کسی وقت کا کھانا ہوگا۔ پس اگر اس نے نصف شب سے پہلے کھالیا تو حانث نہیں ہوگا۔ عربی لغت میں غداء اور عشاء ایسے کھانے کو کہتے ہیں جس سے عام طور پر شکم سیری مقصود ہو، معلوم ہوا کہ اگر ایک یا دو لقمے کھالیے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، جب تک کہ نصف شکم سیری سے زیادہ نہ کھائے، کیونکہ اہل عرب کہا کرتے ہیں: لم اتغدّ و انما أكلت لقمة أو لقمتين. یعنی میں نے غداء نہیں کیا بلکہ ایک دو لقمے لئے ہیں۔ اور ہر ملک اور شہر میں ان کا عرف اور عادت معتبر ہے۔ لہٰذا اگر قسم اٹھائی کہ ناشتہ نہیں کرے گا تو اگر شہری آدمی ہے تو دودھ پینے سے حانث نہیں ہوگا اور اگر دیہاتی ہے تو حانث ہو جائے گا اور غداء (صبح کا کھانا) کا اعتبار روٹی کیساتھ ہوگا۔ پس اگر قسم اٹھائی کہ غداء نہیں کھائے گا، پھر بغیر روٹی کے گوشت کھالیا تو حانث نہیں ہوگا۔

اگر قسم اٹھائی کہ ناپختہ کھجور نہیں کھائے گا تو تازہ کھجور کھانے سے حانث نہیں ہوگا، اور یہی حکم ہے جب تازہ کھجوریں خشک ہو جائیں۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ اس حمل (پیٹ کا بچہ) کو نہیں کھائے گا تو اگر وہ پیدا ہوا تو اس کے کھانے سے حانث ہوگا، کسی نے قسم اٹھائی کہ اس بکری کا کوئی حصہ نہیں کھائے گا تو یہ اس کے گوشت، دودھ اور مکھن پر محمول ہوگا اور استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ صرف گوشت مراد ہو۔ اگر کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ حرام چیز نہیں کھائیگا، پھر وہ مردار کھانے پر مجبور اور بے تاب ہوا یا شراب نوشی پر مجبور ہوا اور اس نے اس کو استعمال کرلیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ حانث ہو جائے گا اس لئے کہ اس نے حرام چیز کا استعمال کیا ہے، اگر چہ مضطر (لاچار شخص) مرفوع الاثم ہے اور حرام چیز حلال کے ساتھ موصوف نہیں ہوسکتی، اگر چہ اس سے گناہ اٹھالیا گیا ہے۔ مچھلی اور دنبے کی چکی گوشت میں نہیں آتی۔ پس اگر قسم اٹھائی کہ گوشت نہیں کھائیگا تو مچھلی کے سوا کسی بھی جانور کا گوشت کھالیا تو حانث ہوگا، خواہ پکا کر کھائے یا بھون کر یا اس کے پیس بنا کر کھائے اور خواہ وہ حلال ہو یا حرام ہو، جیسے مردار، خنزیر کا گوشت، متروک التسمیہ (جس پر بسم اللہ نہ پڑھی گئی ہو) جانور کا گوشت، حرم کا شکار اور مجوسی کا ذبیحہ، اس لئے کہ گوشت کا لفظ ان تمام کو شامل ہے۔ اور مچھلی پر گوشت کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جانور کی اوجھ، جگر، پھیپھڑا، گردہ، سری پائے، آنتیں، تلی، یہ سب گوشت میں آتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں گوشت کے ساتھ فروخت کی جاتی ہیں۔ اور چربی سے پیٹ کی چربی مراد ہوگی، لہٰذا اگر کسی نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ چربی نہیں کھائے گا اور پھر پیٹھ کی چربی کھالی تو حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ گوشت کا حصہ ہے اس کو موٹا گوشت کہا جاتا ہے۔

آنے جانے پر قسم اٹھانے کی مثالیں

کسی نے قسم اٹھائی کہ اگر اسے استطاعت ہوئی تو وہ اس کے پاس ضرور جائیگا تو یہ تندرستی کی استطاعت پر محمول ہوگا، لہٰذا اگر کوئی مرض یا بادشاہ یا کوئی اور عارض و مانع نہ ہوا اور وہ اس کے پاس نہ گیا تو حانث ہوگا، اس لئے کہ عرف میں استطاعت سے مراد اعضاء کی سلامتی اور موانع کا نہ ہونا ہوتا ہے۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ فلاں کے پاس ضرور جائیگا، پھر اس کے پاس نہیں گیا، یہاں تک کہ فوت ہو گیا تو زندگی کے آخری حصہ میں حانث ہوگا، اس لئے کہ حنث کا تحقق موت سے ہی ہوگا، کیونکہ قسم میں سچا ہونا اس سے پہلے متوقع ہے۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ اس کے پاس ضرور جائے گا تو اس سے مراد اس کی منزل یا تجارت گاہ یا دفتر یا کھیت میں آنا ہوگا، اس سے ملاقات ہو یا نہ ہو، اس لئے کہ جانے کا مطلب ہوتا ہے اس کی جگہ تک پہنچنا۔ کسی نے حلف اٹھایا کہ اس کی

بیوی شادی میں نہ جائیگی، پس وہ شادی سے پہلے چلی گئی اورا قامت پذیر رہی یہاں تک کہ شادی گزر گئی تو وہ حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ شادی (کا زمانہ) اس کے پاس آئی، وہ اس کے پاس نہیں گئی، کسی نے قسم کھائی کہ اس کی بیوی اپنے والد کے گھر نہیں جائے گی، پس وہ گھر کے دروازے تک گئی، گھر میں داخل نہیں ہوئی، تو وہ حانث نہیں ہوگا۔

قسم کھانے کی مختلف مثالیں

اگر قسم کھائی کہ میں پانی نہیں پیوں گا اور عورتوں سے شادی نہیں کروں گا، پھر پانی کا ایک قطرہ پی لیا یا کسی ایک عورت سے بھی شادی کر لی تو حانث ہوگا۔ اس لئے کہ جنس کا استیعاب اس کے لئے ناممکن ہے، لہٰذا اس کی قسم کو ادنیٰ فرد پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن اگر اس کی نیت جنس کی ہو تو اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اگر حلف اٹھایا کہ کوئی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ پھر اس نے اپنی ڈاڑھی کو خوشبودار تیل لگا لیا تو حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ اسے عرفاً سونگھنا نہیں کہتے، اگر قسم کھائی کہ زیور نہیں پہنے گا تو چاندی کی انگوٹھی پہننے سے حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ چاندی کی انگوٹھی اتباعِ سنت کے لئے پہنی جاتی ہے، صرف زینت کے لئے نہیں پہنی جاتی۔ اور یہی حکم سونے کی انگوٹھی کا ہے، اگر چہ اسے زینت کے طور پر پہنا جاتا ہے اور یہ حرام ہے اور اگر انگوٹھی عقیق کی ہو یا چاندی ہی کی ہو لیکن اسے عورتیں پہنتی ہوں تو زینت کی وجہ سے حانث ہو جائے گا۔ کسی نے قسم کھائی کہ وہ اس بستر پر نہیں سوئے گا، پھر وہ اس پر ایک اور بستر بچھا کر سو گیا تو حانث نہیں ہوگا اور اگر اس پر چادر ڈال کر اس چادر پر سو گیا تو حانث ہو جائے گا، اس لئے کہ چادر بستر کے تابع ہوتی ہے۔ اگر قسم کھائی کہ فلاں کے گھر میں داخل نہیں ہوگا تو اس سے مراد از روئے عرف کسی مناسب جگہ پر قصداً اس سے ملاقات کرنا ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ (حالف) قصداً اس کے پاس نہ گیا۔ مثلاً کسی اور کے پاس گیا یا کسی اور کام سے گیا یا اس کے پاس ایسی جگہ پر گیا جہاں پر ملاقات کے لئے عام طور پر بیٹھا نہیں جاتا تو اس کو داخل ہونا نہیں کہیں گے۔

دو آدمیوں نے قسم کھائی کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے پاس نہیں آئے گا، پھر وہ دونوں ایک ساتھ آپس میں ملے تو حانث نہیں ہوں گے۔ کسی نے قسم کھالی کہ شادی نہیں کرے گا، پھر کسی نے اس کی اجازت کے بغیر اس کی شادی کرا دی تو اگر اس نے قولاً اس کی اجازت دی تو حانث ہو جائے گا اور اگر بالفعل اجازت دی جیسے مہر دے دیا وغیرہ تو حانث نہیں ہوگا، اس لئے کہ تمام عقود اقوال کے ساتھ خاص ہیں۔ پس اس کا فعل عقد شمار نہیں ہوگا بلکہ وہ صرف

رضامندی ہوگی جبکہ حانث ہونے کی شرط عقد ہے، رضامندی نہیں ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ دونوں صورتوں میں حانث ہو جائے گا۔

اگر دوسرے کو شادی کرانے کا کہا تو حانث ہو جائے گا، اس لئے کہ نکاح کا وکیل، سفیر اور معبر کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر حالف کہتا ہے کہ میری مراد یہ تھی کہ میں شادی کی بات نہیں کروں گا تو دیانتاً تو اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے لیکن قضاءً تصدیق نہیں کی جائیگی۔ یہی حکم طلاق کا بھی ہے۔

خرید وفروخت پر قسم کھانے کی مثالیں

اگر قسم کھائی کہ بیع نہیں کریگا، پھر بیع کا وکیل بنایا تو حانث نہیں ہوگا، تمام مالی معاوضات کا یہی حکم ہے، اس لئے کہ عقد کا وجود عاقد کی طرف سے متحقق ہوتا ہے یہاں تک کہ تمام حقوق اسی کی طرف لوٹتے ہیں، پس حالف کی طرف سے عقد کی شرط نہیں پائی گئی اس لئے حانث نہیں ہوگا، لیکن اگر اس کی نیت کرلے تو حانث ہوگا کہ اس میں اس کو تنبیہ ہے۔ یا حالف ایسا شخص ہو جو بذات خود معاملات انجام نہ دیتا ہو تو پھر حانث ہوگا جیسے حاکم وقت یا جوان پردہ نشین عورت۔ اگر حالف کبھی خود بھی معاملہ کرتا ہو اور کبھی کسی کو وکیل بھی بناتا ہو تو اکثر واغلب حالت کا اعتبار ہے۔ کسی نے قسم کھائی کہ بیع نہیں کرے گا، پھر بیع کی مگر مشتری نے اسے قبول نہیں کیا تو حانث نہیں ہوگا، بیع صرف، بیع سلم، اجارہ اور نکاح وخلع کا بھی یہی حکم ہے۔ اور اگر اس (حالف) نے کوئی چیز ہبہ کی یا صدقہ کی یا عاریۃً دی اور دوسرے نے قبول نہ کی تو اس صورت میں حانث ہوگا، اس لئے کہ معاوضہ تملیک از جانبین کا نام ہے، لہٰذا معاوضہ کے ثبوت کے لئے قبول کی حیثیت رکن کی ہوگی، اور غیر معاوضہ میں صرف مملک (مالک بنانے والا) کی جانب سے تملیک ہوتی ہے۔ کسی نے قسم کھائی کہ فلاں کو اس کا حق ضرور دے گا، پھر کسی دوسرے کو ادائیگی کا حکم دیا یا حوالہ کیا (اس کے ذمے کر دیا) پھر اس نے قبضہ کرلیا تو قسم میں سچا ہو جائے گا۔ اور اگر اس کو کوئی چیز بیچی اور اس نے اس پر قبضہ کرلیا تو بھی قسم میں سچا ہو جائے گا۔ کسی نے قسم اٹھائی کہ وہ اپنے قرض دار سے جدا نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اپنا حق پورا پورا وصول کرلے، پھر وہ اس سے بھاگ گیا تو حانث نہیں ہوگا۔ کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنا قرض متفرق طور پر وصول نہیں کرے گا، پھر کچھ حصہ وصول کیا تو حانث نہیں ہوگا جب تک کہ باقی قرض وصول نہ کرلے۔ اس لئے کہ شرط سارے قرض کو متفرق طور پر وصول کرنے کی تھی اور حانث ہونے کی یہ شرط پائی نہیں گئی اور اگر اس نے مقروض کو باقی قرض سے بری کر دیا۔ (معاف کر دیا) یا اس کو ہبہ کر دیا تو اسے سارے قرض کا وصول کنندہ قرار نہیں دیا

جائے گا۔ اور اگر ایک ہی مجلس میں متفرق طور پر پے در پے اپنا قرض وصول کیا تو حانث نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ بسا اوقات کل قرض کا ایک ہی دفعہ حوالے کرنا دشوار ہوتا ہے پس ایسی بسیط مقدار قسم سے مستثنیٰ ہوگی اور اس سے حانث نہیں ہوگا۔ اور اگر دو دفعہ دینے کے درمیان میں کسی اور کام میں مشغول ہوگیا تو حانث ہوجائے گا، اس لئے کہ مجلس بدل گئی، پس ادائیگی بھی مختلف ہوئی۔

کسی نے قسم کھائی کہ وہ ضرور ہبہ کرے گا، پھر اس نے ایسا کیا لیکن دوسرے نے قبول نہیں کیا تو قسم میں سچا ہوگا، قرض عاریہ اور صدقہ کا بھی یہی حکم ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

نذر کا بیان

نذر ایک مشروع قربت وعبادت ہے۔ اور اس کا قربت ہونا اس وجہ سے ہے کہ اسے قرب لازم ہے جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے نذر کے ایفاء کا حکم دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ" [الحج:۲۹] "اپنی نذریں پوری کرو" حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "اے ابن عمر! اپنی نذر کو پورا کرو۔"[۱] نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نذر مانی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا تو اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی چاہئے اور جس نے معصیت کی نذر مانی تو اسے معصیت (نافرمانی) نہیں کرنی چاہئے۔"[۲]

نذر کی مشروعیت (جواز) پر ائمہ کا اجماع ہے۔

نذر وہی درست ہے جس سے مقصد اللہ تعالیٰ کی قربت ہو اور وہ واجب کی جنس سے ہو جیسے نماز، روزہ، حج، صدقہ (زکوٰۃ) وغیرہ۔ اور جو کام جنس واجب سے نہ ہو جسے تسبیح، وتحمید کرنا، بیماروں کی عیادت کرنا اور مساجد تعمیر کرنا، اس کی نذر ماننا درست نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نذر ماننا بھی درست نہیں ہے، جیسا کہ ابھی (حدیث میں) گزرا۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ لوگوں سے خطاب فرما رہے تھے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے سوال کیا، لوگوں نے کہا کہ ابو اسرائیل نے یہ نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا، نہ بیٹھے گا اور نہ ہی سایہ حاصل کرے گا اور نہ کسی سے بات کرے گا اور روزے رکھے گا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اس کو کہو کہ بات بھی کرے، سایہ بھی حاصل کرے اور بیٹھے بھی اور اپنا روزہ پورا کرے۔"[۳] اسی طرح حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "میری بہن نے نذر

۱ [صحیح البخاری: ۱۴۰۸] ۲ [ایضاً] ۳ [صحیح مسلم: ۱۲۶۴/۳]

مانی کہ بیت اللہ شریف برہنہ پا پیدل جائے گی، پھر اس نے مجھے کہا کہ میں اس کے لئے رسول اللہ ﷺ سے استفتاء لوں، چنانچہ میں نے آنحضرت ﷺ سے استفتاء لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس کو چاہئے کہ پیدل بھی چلے اور سوار بھی ہو۔''[1]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیدل چل رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ اس کے بیٹوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے ذمے نذر تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے بوڑھے! سوار ہو جاؤ! بے شک اللہ تعالیٰ تجھ سے اور تیری نذر سے بے نیاز ہیں۔''[2]

اگر کسی شخص نے مطلقاً یعنی کسی شرط یا تعلیق کے بغیر نذر مانی اور وہ نذر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرہ میں آتی ہو اور عبادات واجبہ کی جنس سے ہو تو اس کو پورا کرنا اس پر لازم ہوگا۔ جیسا کہ یوں کہے کہ اللہ کے لئے میرے ذمے ہے کہ میں ایک ہزار روپے صدقہ کروں یا ایک ہزار صدقہ کرنا مجھ پر نذر ہے۔ اسی طرح اگر نذر کو کسی شرط کے ساتھ معلق کیا پھر وہ شرط پائی گئی تو اس کا پورا کرنا لازم ہوگا۔ اس لئے کہ معلق بالشرط بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک منجز کے حکم میں ہے۔ اس لئے کہ یہ نذر جزاء کے لحاظ سے موجود ہے اور اصل جزا ہے، شرط تو تابع ہے۔ جیسا کہ کوئی کہے کہ اگر میرے مریض کو شفا ہوئی تو میرے ذمے ایک دن کا روزہ ہے، پس اس کے ذمہ ایک دن کا روزہ ہے جو کہ نذر میں اصل ہے اور شرط اس کے تابع ہے اور وہ پائی گئی ہے۔ چنانچہ وہ ایفائے نذر سے ہی بری الذمہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ نذر ہے اور اس میں قسم کا کوئی معنی موجود نہیں ہے۔

معلق بالشرط نذر جو اپنے وجود کا تقاضا نہیں کرتی

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر نذر میں ایسی شرط ہو جو اپنے وجود کی مقتضی نہ ہو تو اس سے بری ہونے کیلئے کفارہ یمین کافی ہوگا۔ جیسے کوئی کہے کہ اگر میں نے فلاں شخص سے بات کی تو میرے ذمے ایک سال کے روزے ہوں، یا اگر میں گھر میں داخل ہوا تو میرے ذمے تمام مملوکہ اشیاء کا صدقہ کرنا لازم ہو تو ایسی صورت میں بری الذمہ ہونے کے لئے کفارہ یمین کافی ہوگا۔ ہاں! اگر اس نے اس چیز کو ادا کر دیا جس کا اس نے التزام کیا تھا تو بھی عہدہ برآ ہو جائیگا، اس لئے کہ اس میں بھی یمین کا معنی موجود ہے۔ اور وہ لفظی طور پر نذر ہے، لہٰذا دونوں میں سے جس کو چاہے اختیار کرے۔ جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ''نذر

---

[1] [ایضاً] [2] [ایضاً]

کا کفارہ وہی ہے جو یمین کا کفارہ ہے۔"[1]

چند مثالیں

اگر کسی شخص نے کہا کہ اگر میں نے یہ کام کیا تو میرے مال میں سے ایک ہزار ریال صدقہ ہیں۔ پھر اس نے وہ کام کرلیا، حالانکہ اس کی ملک میں صرف سو ریال ہیں تو اس پر اس کے سوا اور لازم نہیں ہوں گے۔ اگر نذر مان کر اپنے بیٹے کو ذبح کرے گا تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک بکری ذبح کرنا اس پر لازم ہوگا اور اگر اپنے آپ کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بکری ذبح کرنا لازم ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر مکہ میں اپنا بیٹا ذبح کرنے کی نذر مانی تو حرم میں بکری ذبح کرنا اس پر لازم ہوگا۔ اگر اپنے والد یا والدہ کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اصح قول یہ ہے کہ یہ نذر درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہ معصیت ہے اور معصیت کی نذر درست نہیں ہے۔ اور بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر ماننے کی وضاحت حضرت ذبیح علیہ السلام کے واقع سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا تو بیٹے نے کہا "اِفۡعَلۡ مَاتُؤۡمَرُ" [صٰفٰت] پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بکری ذبح کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا: "قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّؤۡيَا" "یعنی تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔" ہمارے دین میں بھی یہی حکم چلا آ رہا ہے۔ بہر حال بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر کا صحیح ہونا اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ "ثُمَّ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا" [النحل:۱۲۳] "پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔" یا پھر اس لئے کہ سابقہ شریعت کا حکم ہمارے لئے بھی لازم الاتباع ہے۔ جب تک کہ نسخ ثابت نہ ہو جائے۔ اور بیٹے کی نذر ماننے کی صورت میں بکری کا واجب ہونا خلافِ قیاس ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے بطور استدلال معلوم ہوا ہے اور یہ صرف اولاد کی صورت میں وارد ہوا ہے اس لئے اسی پر منحصر ہوگا۔ اور اگر لفظ قتل کے ساتھ نذر مانی تو بالاجماع اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ نص میں ذبح اور نحر وغیرہ کا لفظ آیا ہے، جب کہ قتل کا لفظ ایسا نہیں ہے، نیز اس لئے کہ جب لفظ قتل سے بکری کو ذبح کرنے کی نذر ماننا درست نہیں تو مسئلہ مذکورہ میں بطریق اولیٰ درست نہ ہوگی۔

---

[1] [صحیح مسلم:۱۲۶۵/۳]

حدود کا بیان

حدود، حد کی جمع ہے اور حد کا لغوی معنی ہوتا ہے منع کرنا، روکنا، جیسے کہتے ہیں: أحدّت المعتدة: یعنی عدت گزار عورت نے اپنے آپ کو ناز ونعمت اور زینت وآرائش سے روکا۔ اسی طرح جامع مانع لفظ پر حد کا اطلاق ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ شے کے معانی (افراد) کو جامع ہوتا ہے اور دخول غیر سے مانع ہوتا ہے۔ اور حدود الشرع کا معنی ہوتا ہے، موانع اور زواجر، اور حد کا شرعی معنی یہ ہے کہ حد وہ سزا ہے جو مقرر ہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے بطور حق واجب ہو۔ قصاص کو حد کا نام نہیں دے سکتے۔ اگرچہ وہ سزا ہے، کیونکہ قصاص بندے کا حق ہے جو اس کے اسقاط کا بھی مالک ہے اور اس میں کمی کا بھی حقدار ہے، تعزیر بھی اسی طرح ہے، اس لئے کہ وہ مقررہ نہیں ہے۔ حد کی مشروعیت کتاب وسنت سے ثابت ہے، کتاب اللہ سے اس طرح ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ذی شان ہے: "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ" [النور:۲] الآیۃ۔ نیز فرمایا: "وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ [المائدہ:۳۸] نیز فرمایا: "وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ" "اور جولوگ عیب لگاتے ہیں حفاظت والیوں کو" [النور:۴] نیز ارشاد فرمایا: "اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا" "یہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں ملت میں فساد کرنے کو۔" [المائدہ:۳۳]

اور سنت رسول ﷺ سے اس طرح ثابت ہے کہ حدیث ماعز رضی اللہ عنہ، عامدیہ، عسیف اور دیگر مشہور احادیث جن کا ذکر ان شاء اللہ عنقریب آرہا ہے جو اس کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہیں۔ اور حد کی مشروعیت صرف نقلاً نہیں بلکہ عقلاً بھی ثابت ہے، کیونکہ بشری طبائع اور نفسانی خواہشات، شراب خوری، زنا کاری، قتل وغاری گری، غیر کا مال ہتھیانے اور سب وشتم کرنے کے ذریعہ حصول لذات کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ بالخصوص ہر طاقتور، کمزور پر اور ہر اعلیٰ، ادنیٰ پر غالب آنے کی خواہش رکھتا ہے، چنانچہ حکمت کا بھی تقاضا ہوا کہ ایسی حدود مشروع ہوں تاکہ فساد کی بیخ کنی ہو اور مجرم کو ارتکاب جرم پر زجر وتوبیخ بھی ہو اور سارے عالم کا نظام ٹھیک طرح سے قائم اور استوار رہے، کیونکہ عالم کا اقامت زواجر سے خالی ہونا اس کی ہلاکت وتباہی کو مستلزم ہے اور اس سے جو فساد وبگاڑ پیدا ہوگا وہ بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ ہے: وَلَكُمْ فِي

الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ"[البقرۃ:۱۷۹] الآیۃ۔ "اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو"

ایک عرب حکیم اور دانا شخص کا مقولہ ہے: القتل أنفی للقتل. یعنی ایک قتل، دوسرے قتل کی نفی کرتا ہے۔

حدود یہ ہیں: ۱۔حد زنا، ۲، حد قذف، ۳۔حد شراب، ۴۔حد سرقہ۔ ۵۔حد حرابہ۔

1- حد زنا

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زنا کی تعریف یہ ہے:هو وطئی فی قبل المرء ة العاری عن عقد النكاح و عن شبهته و يتجاوز الختان الختان. "یعنی زنا ایسی وطی (جماع) کو کہتے ہیں جو نکاح یا شبہ نکاح سے خالی شرمگاہ میں پائی جائے اور ایک شرمگاہ دوسری شرمگاہ میں داخل ہو جائے۔اور صاحبین کے نزدیک زنا کی تعریف یہ ہے: هو وطئی فی قبل المرأة العاری عن عقد النكاح الصحيح و يتجاوز الختان الختان. یعنی زنا ایسی وطی کو کہتے ہیں جو عورت کی ایسی شرمگاہ میں ہو جو عقد نکاح صحیح سے خالی ہو۔ یہاں پر پہلے ختان سے مراد مرد کا ختان ہے، یعنی سپاری جسے ختّان (نائی) ختنہ کے وقت کاٹتا ہے، پس جب مرد کا ختان عورت کی فرج (شرمگاہ) میں داخل ہو جائے تو حد واجب ہو جائے گی اور دوسرے ختان سے عورت کا ختان مراد ہے، اور وہ چھوٹی سی کھال ہوتی ہے جو عورت کی فرج کے اوپر والے حصہ میں موجود ہوتی ہے۔ جب مرد کا یہ حصہ عورت کے اس میں داخل ہو جائے تو حد واجب ہو جائے گی اور اس سے کم دخول موجب حد نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معمولی شبہ سے بھی حد ساقط ہو جائے گی، اس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فران ہے: ادر ؤوا الحدود بالشبهات واقيلوا الكرام عثراتهم، الا فی حد من حدود الله تعالیٰ[1] یعنی شبہات کی بناء پر حدود ساقط کر دیا کرو اور معزز لوگوں کی غلطیاں معاف کر دیا کرو، البتہ حدود اللہ میں سے کوئی حد قابل معافی نہیں۔" امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث جامع الاحادیث میں اور ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو حدیث اہل مصر و جزیرہ سے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے۔اور ابو مسلم الکجی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کا اول حصہ نقل کیا ہے اور ابن السمعانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الذیل میں عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے مرسلاً اس کو نقل کیا ہے نیز مسدد نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کو موقوفاً نقل کیا ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ادرؤوا

---

[1] [جامع الاحادیث:۱۷۲/۱]

الحدود علی المسلمین مااستطعتم فان وجدتم مخرجاً فخلوا سبیله ، فإن الامام لان یخطی فی العفو خیر من أن یخطی فی العقوبة[جامع الاحادیث:۱۷۲/۱]''مسلمانوں سے حتی الامکان حدود ساقط کیا کرو، اگر کوئی راہ نکلنے کی پاؤ تو اس کو رہا کرو۔ کیونکہ امام وقت کا معاف کرنے میں خطا کرنا سزا دینے میں خطا کرنے سے بہتر ہے۔''[1]

نیز آنحضرت ﷺ کا فرمانِ عالی ہے: "ادرؤوا الحدود ولا ینبغی للامام تعطیل الحدود"[2] ''یعنی حدود کو ساقط کیا کرو اور امام وقت کے لئے جائز نہیں کہ وہ حدود کو معطل کر دے۔''[3]

پس اگر کسی شخص نے ایسی عورت سے وطی کی جس سے بغیر گواہوں کے عقد کیا تھا، یا ایسی عورت سے وطی کی جو معتدۃ الغیر تھی، یا اس نے مجوسیہ سے عقد کیا تھا اور پھر وطی کرلی یا ایک ہی وقت میں پانچ عورتوں سے شادی کی تھی اور ان سے وطی کرلی، یا دو بہنوں کو نکاح میں جمع کیا پھر وطی کی، یا اپنی محرم سے شادی کی پھر اس سے وطی کرلی تو ان سب صورتوں میں اس نے وطی اس خیال سے کی کہ وہ عورت اس کے لئے حلال ہے۔ لہٰذا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے حد نہیں لگے گی اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر ایسی وطی موجب حد ہے جو علی التابید (ہمیشہ کے لئے) حرام ہو۔ جیسے محارم سے وطی کرنا، اور جو تزویج موجب شبہ ہو اس میں بھی حد لگائی جائے گی۔ اس لئے کہ صاحبینؒ کے نزدیک وہ دلیل جس پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اعتماد کیا ہے، ثابت نہیں ہے۔ نیز صاحبینؒ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: میرے چچا حارث بن عمرو کا میرے پاس سے گزر ہوا ان کے ہاتھ میں جھنڈا تھا جو آنحضرت ﷺ نے ان کو دیا تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ اے چچا! نبی کریم ﷺ نے آپ کو کہاں بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آنحضور ﷺ نے مجھے ایسے آدمی کی طرف بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے شادی کی ہے۔ آپ ﷺ نے مجھے اس کی گردن اڑانے کا حکم دیا ہے۔ نیز یہ حدیث بھی ہے کہ جو شخص محرم عورت سے وطی کرے اس کو قتل کردو۔[4]

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شبہ عقد حد کو ساقط کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، ''شبہات کی وجہ سے حدود کو ساقط کر دیا کرو۔''

---

[1] [رواہ الترمذی والحاکم والبیہقی عن عائشہؓ] [2] [ایضاً]
[3] [رواہ الدارقطنی والبیہقی عن علیؓ] [4] [مسند احمد بشرح البناء:۱۰۳/۱۶]

زنا کے ثبوت کے لئے کیا کیا ضروری ہے

زنا دو چیزوں سے ثابت ہو جاتا ہے۔(۱) بینہ (۲) اقرار۔

(۱) بینہ: بینہ کا مطلب یہ ہے کہ چار گواہ کسی مرد یا عورت کے متعلق زنا کی گواہی دیں۔

سوال: قتل تو زنا سے زیادہ سنگین جرم ہے لیکن اس میں چار گواہ شرط نہیں ہیں تو زنا میں چار گواہ کیوں ضروری ہیں؟

جواب: زنا کا فعل دو شخصوں سے تام ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر ایک کا فعل دو دو گواہوں سے ثابت ہوگا۔ جب کہ قتل صرف ایک فرد سے تام ہو جاتا ہے۔ اس لئے زنا میں چار گواہ اور قتل میں دو گواہ لازمی قرار دیئے گئے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زوج بھی گواہ ہوسکتا ہے یعنی اس کا گواہ بننا جائز ہے۔ جبکہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے اور ان چار گواہوں میں یہ شرط ہے کہ وہ مرد ہوں، آزاد ہوں، عادل ہوں اور مسلمان ہوں۔ زنا میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی گواہی قابل قبول نہیں ہے اور نہ ہی شہادت پر شہادت درست ہے۔ اور نہ ہی ایک قاضی کا دوسرے قاضی کے پاس مقدمہ بھیجنا جائز ہے۔ اگر چار سے کم افراد زنا کی گواہی دیں تو ان کی شہادت نامقبول ہوگی، اور وہ تہمت لگانے والے ہونگے، ان سب کو حد حذف لگے گی جبکہ مشہود علیہ اس کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح اگر دو گواہ متفرق طور پر آئیں اور یکے بعد دیگرے گواہی دیں تو بھی ان کی شہادت قبول نہیں کی جائیگی اور تہمت لگانے کی وجہ سے ان کو حد قذف لگائی جائیگی۔ لیکن جب چار گواہ ایک مجلس میں حاضر ہوں اور مجلس شہود میں بیٹھ جائیں اور ایک ایک کر کے قاضی کے سامنے پیش ہوں اور گواہی دیں تو ان کی گواہی قبول کی جائیگی۔ اس لئے کہ ایک ہی دفعہ شہادت دینا ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، شبل بن معبدؓ، نافع بن حارثؓ، زیاد بن ابیہ رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہؓ کو کوفہ سے مدینہ بلایا گیا تاکہ مغیرہ کے متعلق شہادت دیں کہ انہوں نے زنا کیا ہے۔ قضاء کی مجلس منعقد کی گئی اور گواہ ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صورت کو قبول کیا، آپ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کو بٹھایا، جب پہلے گواہ نے ان کے خلاف شہادت دی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے مغیرہ! تیرا چوتھائی حصہ ختم ہوگیا۔ پھر جب دوسرے گواہ نے شہادت دی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے مغیرہ! تیرا نصف حصہ ختم ہوگیا، پھر جب تیسرے گواہ نے بھی ان کے خلاف زنا کی شہادت دیدی تو آپ نے فرمایا کہ تیرا تین چوتھائی (3/4) حصہ ختم ہوگیا، حضرت

عمر رضی اللہ عنہ ہر بار شدت غضب سے اپنی مونچھوں کو بل دیتے تھے۔ پھر جب زیاد رضی اللہ عنہ گواہی کے لئے اٹھے اور وہ چوتھے گواہ تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ اے عقاب کی طرح کے آدمی! آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بات اس لئے کہی کہ زیاد کا رنگ سیاہی مائل تھا، اس لئے عقاب کے ساتھ تشبیہ دی۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ نے اس کو بہادری کی صفت کے ساتھ متصف کیا، اس لئے کہ عقاب جب کسی پرندے پر حملہ کرتا ہے تو اس کے پروں کو بے کار بنا دیتا ہے، اس کو اڑنے سے عاجز کر دیتا ہے، زیاد بھی اپنے ہمعصروں کے مقابلہ میں ایسا ہی تھا اور یہ تعریف ہے اور پہلی صورت میں مذمت کرنا مراد ہوگا۔ بہرحال، آپ رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ اپنے ساتھی کی ہتک عزت نہ کرنا، اس کی پردہ پوشی کرنا، زیاد نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ ان گواہوں نے کیا کہا ہے! البتہ میں نے ان دونوں کو ایک لحاف میں حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا جیسے موجیں حرکت کرتی ہیں اور میں نے ناپسندیدہ امر کو دیکھا، اس کے علاوہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حد کو ساقط کر دیا، اس لئے کہ اس نے تہمت کی صراحت اور وضاحت نہیں کی اور تین گواہوں پر حد قذف جاری فرمائی۔

بینہ کی تکمیل کے لئے ان گواہوں سے پہلے چند سوالات کا کر لینا ضروری ہے پھر اس کے بعد ان گواہوں کا تزکیہ اور تعدیل (جانچ پڑتال) ہوگی تاکہ حد کا وجوب ثابت ہو۔

گواہوں سے پوچھے جانے والے سوالات

قاضی ان چاروں گواہوں سے سوال کرے گا کہ زنا کیا ہوتا ہے؟ زنا کیسے ہوا؟ زنا کی ماہیت اور حقیقت اس لئے پوچھے کہ ہوسکتا ہے کہ ان گواہوں کو یا ان میں سے کسی ایک گواہ کو اشتباہ ہو گیا ہو، انہوں نے غیر زنا کو زنا خیال کر لیا ہو۔ کیونکہ زنا کے ماسوا چیز کو بھی مجازاً زنا کہہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دونوں آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں، دونوں پاؤں بھی زنا کرتے ہیں اور شرمگاہ بھی زنا کرتی ہے۔''[1]

اور زنا کی کیفیت اس لئے پوچھے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کو زنا پر مجبور کیا گیا ہو، ان دونوں صورتوں میں حد واجب نہیں ہوتی، پھر قاضی سوال کرے کہ زنا کہاں ہوا؟ کیونکہ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ زنا دارالحرب میں ہوا ہو اور یہ موجب حد نہیں ہے، کیونکہ قاضی کو اس پر دسترس اور کنٹرول حاصل نہیں ہے اس لئے اس میں شبہ پیدا ہو گیا۔ پھر وہ گواہوں سے سوال کرے کہ زنا کب ہوا؟ کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے اس وقت زنا کیا ہو جب وہ نابالغ بچہ ہو یا مجنون ہو۔ اور یہ بھی ممکن

---

[1] الترغیب والترہیب: ۳۶/۵

ہے کہ ان گواہوں نے متقادم زنا پر گواہی دی ہو پس ان کی شہادت قبول نہ ہوگی۔علماء کا تقادم زمان کی اس مدت میں اختلاف ہے جو حد کو ساقط کرتا ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس میں قاضی کی رائے معتبر ہوگی اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جس وقت انہوں نے زنا کا معاملہ دیکھا اس وقت سے گواہی دینے کے زمانہ تک ایک ماہ گزر جائے تو یہ تقادم زمان ہے جو مسقط حد ہے۔قاضی اس صورت میں ان کی گواہی کو قبول نہیں کرے گا،اس لئے کہ ایک مہینہ زمانہ بعید کے حکم میں ہے اور ایک ماہ سے کم ہو تو یہ زمانہ قریب کے حکم میں ہے۔ایک ماہ سے کم ہو تو ان کی شہادت قبول ہوگی۔امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی الجامع الصغیر میں ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لئے چھ ماہ کی مدت مقرر کی ہے۔

قاضی ان گواہوں سے یہ پوچھے کہ اس نے کس کے ساتھ زنا کیا ہے؟ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ عورت اس کی بیوی ہو، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ گواہوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم اس عورت کو نہیں جانتے،اس سے شبہ پیدا ہو جائیگا۔

جب گواہ ان سوالات کا جواب صاف اور واضح لفظوں میں دیدیں اور کہیں کہ ہم نے اس کو دیکھا ہے کہ اس نے اس کی شرمگاہ میں وطی کی ہے اور اپنا ذکر اس کی فرج میں اس طرح داخل کیا ہے جس طرح سرمہ دانی میں سلائی ڈالی جاتی ہے یا جیسے دوات میں قلم ڈالا جاتا ہے تو ان کی گواہی درست شمار ہوگی،اگر وہ کہیں کہ ہم نے اس کو قصداً دیکھا تو شہادت باطل نہیں ہوگی،لیکن اگر وہ کہیں کہ ہم نے اس کو لذت لینے کیلئے قصداً دیکھا تو اس صورت میں ان کی شہادت باطل ہو جائے گی۔

گواہوں کی تعدیل اور تزکیہ

قاضی ان گواہوں کی عدالت کے بارے میں تحقیق کرے گا۔اگر وہ گواہ ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے عادل قرار دیئے گئے تو ان کی شہادت پر حکم لگائے گا۔قاضی ان کی ظاہری عدالت پر اکتفاء نہ کرے۔اگر باطنی طور پر ان کی عدالت مخدوش ثابت ہوئی تو ان کی شہادت کو باطل قرار دے دے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''مسلمانوں سے حدود کو حتی المقدور ٹالو۔''اس صورت میں ان پر حد نہیں ہوگی،کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ سچے ہوں،لیکن اگر وہ سابقہ تہمت میں محدود ہوں یا اندھے ہوں تو ان پر حد قذف لگے گی۔اس لئے کہ اندھا آدمی تو اس چیز کو نہیں دیکھتا جس کی وہ گواہی دے سکے۔پس ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا،لہٰذا وہ تہمت لگانے والے ہونگے اور ان پر حدِ قذف واجب ہوگی۔

تزکیہ وتعدیل کی قسمیں

تزکیہ وتعدیل کی دو قسمیں ہیں۔ایک اعلانیہ: وہ یہ ہے کہ قاضی معدِّل اور گواہ کو جمع

کرے اور معدِّل کہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کی میں نے تعدیل کی ہے۔ اور دوسری سرّ یہ: وہ یہ ہے کہ قاضی مزکّی کے پاس ایک قاصد بھیجے اور اس کی طرف ایک مکتوب لکھے جس میں گواہوں کے نام ونسب مذکور ہوں تا کہ مزکّی کو ان گواہوں کی شناخت ہوسکے۔ پھر وہ جس گواہ کی عدالت کو پہنچائے اس کے نام کے نیچے لکھ دے ''عدل جائز الشہادۃ'' یعنی یہ گواہ عادل ہے اور اس کی شہادت جائز ہے۔ اور جس گواہ کے فسق کو پہچانے تو ہتک عزت سے بچنے کیلئے اس کے نام کے نیچے کچھ نہ لکھے یا ''واللہ اعلم لکھ'' دے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا اس کی تعدیل کرے اور اس کو اندیشہ ہو کہ اگر اس نے اس کے فسق کی صراحت نہ کی تو قاضی اس کی شہادت کے جواز کا فیصلہ دیدے گا تو اس صورت میں اس کی صراحت کردے کہ یہ فاسق ہے۔ اور جس کی نہ عدالت معلوم ہو اور نہ ہی فسق تو اس کے نام کے نیچے ''مستور'' لکھ دے۔ یعنی اس کا حال مستور اور پوشیدہ ہے۔ اعلانیہ تزکیہ شہادت کے مثل ہے۔ پس اگر وہ سارے گواہ اعلانیہ اور سریہ دونوں طرح سے عادل قرار پائیں تو حد کا حکم لگادے۔ اگر گواہان رجم سے پہلے اپنی شہادت سے رجوع کرلیں تو حد ساقط ہو جائے گی اور ان کو حدِ قذف لگے گی اور حد کا سقوط، ان گواہوں کے رجوع کی وجہ سے گواہی کے باطل ہونے کی بناء پر ہے اور اگر رجم کے بعد رجوع کریں تو دیت کے ضامن ہونگے۔ اور اگر ایک گواہ رجوع کرے تو وہ چوتھائی دیت کا ضامن ہوگا اور اسے حد قذف لگائی جائے گی۔

(۲) اقرار

اقرار یہ ہے کہ کوئی عاقل و بالغ شخص چار مرتبہ چار مختلف مجلسوں میں اپنے بارے میں زنا کا اقرار کرے اور قاضی ہر مرتبہ اس کو لوٹا دے، یہاں تک کہ اس کو نہ دیکھے اور اس کے اقرار پر مؤاخذہ نہ کرے بلکہ اقرار زنا پر اس کو ڈانٹے اور اس کے سامنے زنا کی کراہت ظاہر کرے اور اسے زنا سے اجتناب کرنے کا حکم دے، اگر وہ دوسری بار واپس آئے اور اسی طرح زنا کا اقرار کرے تو قاضی اس کے ساتھ اسی طرح معاملہ کرے۔ پھر اگر وہ تیسری بار واپس آکر اقرارِ زنا کرے تو قاضی اس کے ساتھ اسی طرح معاملہ کرے، اگر وہ چار مرتبہ ایک ہی مجلس میں اقرار زنا کرے تو یہ اقرار واحد کے حکم میں ہوگا، اگر زنا کا اقرار کیا پھر اس سے رجوع کرلیا تو اس کا رجوع عن الزنا صحیح ہوگا۔ اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ وہ اپنے والد (حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آیا، اس کا نام ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ تھا، اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مین نے زنا کیا ہے،

میں چاہتا ہوں کہ آپ ﷺ مجھے پاک کر دیں، نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: ''واپس چلے جاؤ!'' جب اگلا دن آیا تو وہ دوبارہ آئے اور آنحضرت ﷺ کے سامنے زنا کا اعتراف کیا، آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''واپس چلے جاؤ'' پھر آپ ﷺ نے اس کی قوم کی طرف ایک آدمی کو (تحقیق حال کیلئے) بھیجا۔ اس آدمی نے ان لوگوں سے اس کا حال معلوم کیا کہ تم ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا جانتے ہو، کیا تم اس میں کوئی خرابی دیکھتے ہو یا اس کی عقل میں کوئی فتور جانتے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ ہم اس آدمی میں کوئی خرابی نہیں دیکھتے اور نہ ہی ان کی عقل میں کوئی فتور یا خلل دیکھتے ہیں۔ پھر وہ شخص تیسری بار آیا اور آنحضور ﷺ کے سامنے پھر زنا کا اعتراف کیا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے پاک کر دیجئے! نبی کریم ﷺ نے دوبارہ اس کی قوم میں ایک آدمی بھیجا اور اس کے متعلق تحقیق کروائی تو اس بار بھی لوگوں نے وہی بات کہی جو پہلی بار کہی تھی کہ ہم اس آدمی میں کوئی خرابی نہیں دیکھتے اور اس کی عقل میں بھی کوئی خلل نہیں پاتے۔ وہ شخص چوتھی بار پھر پیش ہوا اور اس نے آنحضرت ﷺ کے سامنے زنا کا اعتراف کیا، پھر نبی ﷺ نے گڑھا کھودنے کا حکم دیا، ہم نے اس کیلئے ایک گڑھا کھودا، پھر اس کو اس میں سینے تک اتار دیا، پھر لوگوں کو حکم دیا کہ اس کو سنگسار کرو۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ (راوی حدیث) فرماتے ہیں کہ ہم، اصحاب رسول ﷺ یہ باتیں کیا کرتے تھے کہ ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ اگر تین مرتبہ اعتراف زنا کے بعد بھی اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تو آپ ﷺ ان کو نہ بلاتے، چوتھی بار اقرار زنا کرنے کے بعد ہی ان کو رجم کیا گیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چار بار زنا کا اقرار کرنا ہی موجب حد ہے۔[1]

جب چار مرتبہ اقرار زنا کا مرحلہ مکمل ہو جائے تو قاضی اس سے پوچھے کہ زنا کیا ہوتا ہے؟ اور کیسے ہوتا ہے؟ اور کہاں زنا کیا؟ اور کس کے ساتھ زنا کیا؟ اور اس سے یہ نہ پوچھے کب زنا کیا؟ کیونکہ تقادم زمان اقرار کے قبول سے مانع نہیں ہے۔ قاضی کے لئے مستحب ہے کہ اسے رجوع کی تلقین کرے، جیسا کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''شاید تو نے اس کا بوسہ لیا ہو یا اس کو دبا لیا ہو یا اس کو دیکھا ہو۔'' ماعز رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ پوری طرح مشغول رہے؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں! پھر آپ ﷺ نے ان کو رجم کرنے کا حکم دیا۔

---

[1] [مسند احمد شرح البناء: ۱۶/۹۰]

اقرار سے رجوع کرنا

اگر حد سے پہلے یا حد کے درمیان میں اقرار زنا سے رجوع کر لے تو اس کو رہا کر دیا جائیگا۔ اس لئے کہ اس کا رجوع کرنا ایسی خبر ہے جو صدق کا احتمال رکھتی ہے اور اس کی تکذیب کرنے والی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ پس تعارض اقرار بالرجوع کی وجہ سے شبہ ثابت ہو گیا۔ اس کی دلیل حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے ماعز رضی اللہ عنہ کو رجم کیا، جب ہم نے ان کو سنگسار کر رہے تھے تو انہوں نے سنگباری کی تکلیف کو محسوس کیا تو کہنے لگے لوگو! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیج دو، میری قوم نے مجھے مار ڈالا، لوگوں نے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تجھے مار ڈالنے والے نہیں ہیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے ان کو نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ رجم کر کے فارغ ہوئے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لوٹے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی بات ذکر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے اس آدمی کو کیوں نہیں چھوڑ دیا اور اسے میرے پاس لے آتے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ اس کے معاملہ میں تحقیق و تفتیش ہوتی اور توقف کیا جاتا، اگر ایسا شبہ پایا جاتا جو حد کو ساقط کرتا ہو تو اس شبہ کی وجہ سے اس حد کو ساقط کر دیتے اور اگر ایسا شبہ نہ پایا جاتا تو اس پر حد جاری کر دیتے۔

محصن کے لئے زنا کی حد پتھروں سے رجم کرنا ہے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔

مُحصِن کسے کہتے ہیں؟

حد رجم میں محصن وہ ہے جس میں احصان کی شرائط جمع ہوں، اور شرائط احصان سات ہیں: ۱۔ آزاد ہونا، ۲۔ عاقل ہونا، ۳۔ بالغ ہونا، ۴۔ مسلمان ہونا، ۵۔ نکاح صحیح ہونا، ۶۔ دخول ہونا، ۷۔ ان دونوں کا صفت احصان پر قائم ہونا۔

آزاد ہونے کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: "فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ" [النساء: ۲۵] "پس ان پر اس سزا سے نصف سزا ہو گی جو کہ آزاد عورتوں پر ہوتی ہے۔" اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی سزا واجب قرار دی جس میں تنصیف ہو سکتی ہے، رجم میں تنصیف نہیں ہو سکتی، لہٰذا رجم کی سزا باندیوں پر واجب نہیں ہو گی۔ اور عاقل اور بالغ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بغیر احکام الٰہی کا کوئی مخاطب نہیں ہوتا، جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تین قسم کے لوگوں سے قلم

[1] [مسند احمد بشرح البناء: ۹۳/۵]

اٹھالیا گیا ہے (یعنی وہ مستوجب سزا نہیں ہیں) ایک دیوانہ جو مغلوب العقل ہو جب تک کہ وہ ہوش مند نہ ہو جائے، دوسرا سونے والا جب تک کہ بیدار نہ ہو جائے اور تیسرا بچہ جب تک کہ بالغ نہ ہو جائے۔[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس نے جرم کیا تھا، آپ نے اس کو رجم کرنے کا حکم دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا، انہوں نے اس کو پکڑ کر چھوڑ دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کو میرے پاس لاؤ، حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! مجھے یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے، ایک بچہ ہے، جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے، دوسرا سونے والے سے، جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے اور تیسرا دیوانہ ہے جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہو جائے'' اور یہ عورت بھی فلاں قبیلہ کی دیوانی عورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے بدکاری اس حالت میں ہوئی ہو جب وہ اس بیماری میں مبتلا ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ مجھے نہیں معلوم، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے بھی نہیں معلوم۔[2] اور مسلمان ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، وہ محصن نہیں ہے''۔[3] اور یہ روایت مرفوع بھی منقول ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو یہودیوں کو جو رجم کیا تھا وہ بحکم تورات کیا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہودی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگے کہ ان کے ایک مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم تورات میں زنا کا کیا حکم پاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایسے شخص کو خوب ذلیل ورسوا کرتے ہیں اور اس کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بولے کہ تم جھوٹ بولتے ہو، تورات میں رجم کی سزا مذکور ہے، پس وہ تورات لائے اور اس کو کھولا تو ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ آیت رجم پر رکھ دیا، پھر اس سے آگے پیچھے پڑھنے لگا، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس کو کہا کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ! اس نے جو ہاتھ اٹھایا تو اس میں رجم کا حکم موجود تھا۔ پھر کہنے لگے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ سچ کہتے ہیں، تورات میں رجم کا حکم ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو رجم کرنے کا حکم دیا چنانچہ وہ دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔[4]

اور نکاح صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''البکر بالبکر

---

[1] [سنن ابی داؤد: ۱۴۰/۴] [2] [سنن ابی داؤد: ۱۴۰/۴]

[3] [نصب الرایۃ: ۳۲۷/۳] [4] [سنن ابی داؤد: ۱۵۳/۴]

جلد مِائة"[1] "کنوارے کو کنواری کے ساتھ سو کوڑے لگائے جائیں گے۔"

عربی زبان میں بکر اس کو کہتے ہیں جس نے شادی نہ کی ہو، یعنی غیر شادی شدہ شخص کو بکر کہتے ہیں۔ نیز اس لئے کہ نکاح صحیح کے ذریعہ حلال وطی کا حصول ہوسکتا ہے۔ اور دخول ہونے کی شرط اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنا پر لگائی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "والثيّب بالثيب جلد مئة والرجم" یعنی ثیب کو ثیب کے بدلہ سو کوڑے اور رجم کیا جائے گا۔" عربی لغت میں ثیب اس شخص کو کہتے ہیں جو حلال نکاح کے ساتھ قبل (عورت کی شرمگاہ) میں وطی کرے۔ نیز اس لئے کہ یہ ایسی وافر اور کامل نعمت ہے جو بے حیائی والے کام (بدکاری) سے باز رکھ سکتی۔ لہٰذا نعمت کے موجود ہونے کے باوجود ارتکاب جرم، نہایت شدید شمار ہوگا اور منعم کی نعمتوں کے مکمل ہونے کی صورت میں جنایت ومعصیت کا ارتکاب بہت زیادہ قبیح اور فحش ہوتا ہے، اس لئے اس مجرم کے حق میں سزا بھی زیادہ سخت ہی مناسب ہوگی۔

اور ان دونوں کے صفتِ احصان پر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہر ایسی وطی جو احد الواطئین کے احصان کی موجب نہ ہو وہ دوسرے کے احصان کی بھی موجب نہیں ہوتی، جیسا کہ اگر کوئی شخص چھوٹی بچی (نابالغہ) سے، دیوانی عورت سے یا کافر عورت سے شادی کرے اور اس کیساتھ دخول کرے تو وہ محصن نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر عورت تو آزاد، عاقلہ، بالغہ ہو لیکن مرد غلام ہو یا بچہ ہو یا دیوانہ ہو تو عورت محصنہ نہیں ہوگی۔ الا یہ کہ مسلمان ہونے، آزاد ہونے، بالغ ہونے اور باہوش ہونے کے بعد عورت کے ساتھ دخول (جماع) کرے تو اس صورت میں اس وطی سے محصنہ ہو جائیگی نہ کہ اس سے قبل۔ معلوم ہوا کہ احصان ایک عمدہ وصف اور بہترین خصلت ہے جو اقرار سے یا دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے ثابت ہوتی ہے۔ احصان کے لئے یہ کافی ہے کہ گواہ ہوں کہ اس نے عورت کے ساتھ دخول کیا ہے، اسی طرح اگر ان دونوں کے درمیان معروف لڑکا ہو، اس لئے کہ وہ نکاح صحیح کے ساتھ دخول ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اور اس سے اس کا محصن ہونا ثابت ہو جائیگا۔ اگر عورت کے ساتھ دخول کیا، پھر اس کو طلاق دیدی اور مرد کہتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ وطی کی ہے اور عورت انکار کرتی ہے تو اس سے وہ محصن ہو جائے گا اور عورت انکار کی وجہ سے محصنہ نہیں ہوگی اور جب ایک محصن ہو اور دوسرا محصن نہ ہو تو ہر ایک کو اپنی حد کے ساتھ خاص کیا جائیگا۔

---

[1] [صحیح مسلم: ۱۳۱۶/۳]

چند مسائل

اگر کسی شخص نے اجنبیہ عورت سے شرمگاہ کے علاوہ کسی اور حصہ میں مباشرت کی تو اسے بہ اجماع امت تعزیر لگائی جائیگی۔ اگر سہاگ رات کو کوئی دوسری عورت اس کے پاس بھیج دی گئی اور اس نے اس سے ہمبستری کرلی تو اس پر حد جاری نہیں کی جائیگی اور اس کے ذمہ مہر مثلی ہوگا اور اس کے قاذف (تہمت لگانے والا) پر حد جاری نہیں کی جائیگی اور عورت کے بچہ کا نسب اس سے ثابت ہوگا اور اس کے ذمے عدت ہوگی۔

جس نے اپنے بستر پر کسی عورت کو پاکر اس سے وطی کرلی تو اس پر حد ہوگی، اس لئے کہ یہ مسئلہ مسئلہ زفاف کے مشابہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ وہاں عورت سے ناواقف تھا اور اس عورت کے بچے کے بارے میں نسب ثابت نہیں ہوگا۔ اور یہی حکم ہے جب وہ اندھا ہو، اس لئے کہ اس کے لئے پوچھ کر تمیز کرنا ممکن تھا، البتہ اگر وہ اس کو بلائے اور کوئی اور اجنبی عورت اس کی بات پر جواب دے کہ میں تیری بیوی ہوں، پھر وہ اس سے وطی کرلے تو اس عورت میں اس پر حد نہیں لگے گی اور بچے کا نسب بھی اسی سے ثابت ہوگا اور وہ عورت اس عورت کی طرح ہوگی جسے اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کی طرف رخصت کر کے بھیجا گیا ہو۔

جس شخص نے ایسی عورت سے نکاح کیا جس کے ساتھ نکاح کرنا اس کیلئے حلال نہیں تھا، پھر اس سے وطی بھی کرلی تو اس پر حد واجب نہیں ہوگی بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کو تعزیر لگائی جائیگی۔ جب کہ صاحبینؒ کے نزدیک اسے حد لگائی جائیگی۔ بشرطیکہ اسے یہ مسئلہ معلوم ہو۔ اس لئے کہ یہ ایسا عقد ہے جو اپنے محل میں واقع نہیں ہوا لہٰذا یہ لغو ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کی شریعتوں میں محارم سے نکاح کرنے کو مباح کیا تھا۔ جو شخص کسی اجنبی عورت کیساتھ اس کی دبر میں وطی کرے تو اس پر بالاجماع حد جاری کی جائیگی اور جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ اس کی دبر میں مباشرت کرے تو اس پر حد تو نہیں لگے گی، البتہ تعزیر لگائی جائیگی کیونکہ اس نے حرام کام کا ارتکاب کیا ہے۔

جو شخص کسی کے ساتھ لواطت والا عمل کرے تو صاحبینؒ کے نزدیک وہ بھی زنا کے حکم میں ہے، اس پر حد ہوگی اور اس فعل بد پر چار آدمیوں کی شہادت ضروری ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کو تعزیر لگائی جائیگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فاعل اور مفعول کو ہر حال میں قتل کیا جائے گا خواہ وہ دونوں محصن ہوں یا محصن نہ ہوں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث

کو اس لئے نہیں لیا کہ اس کے راوی کو منکر قرار دیا گیا ہے۔ حوالہ اور تحقیق کے لئے دیکھیے، المیز ان، ترجمہ عمرو بن ابی عمرو۔

جو شخص کسی جانور سے بدفعلی کرے اسے تعزیر کی سزا دی جائیگی، اس لئے کہ یہ زنا کے زمرہ میں نہیں آتا۔ اگر کسی عورت نے کسی بندر کو اپنے اوپر قدرت دی، پھر اس نے اس کے ساتھ وطی کی تو اس عورت کا حکم وہی ہوگا جو کسی کا جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے کا ہوتا ہے۔

جب حد شبہ کی بناء پر ایک سے ساقط ہو جائے تو دوسرے سے بھی شریک ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اگر ایک شخص نکاح کا مدعی ہو اور دوسرا اس سے انکار کرتا ہو تو یہی حکم ہوتا ہے۔ اگر حد کا سقوط قصور فعل کی وجہ سے ہوا ہو تو دیکھیں گے کہ قصور فعل عورت کی جانب سے ہے یا مرد کی جانب سے، اگر قصور فعل عورت کی جانب سے ہے جیسے وہ چھوٹی بچی ہو یا دیوانی ہو یا اس سے بالجبر زنا کیا گیا ہو یا وہ سوئی ہوئی ہو تو عورت سے حد ساقط ہوئیگی۔ مرد سے ساقط نہیں ہوگی۔ اور اگر قصور فعل مرد کی جانب سے ہو جیسے وہ مجنوں ہو یا بچہ ہو یا اس پر جبر کیا گیا ہو تو اس صورت میں دونوں سے حد ساقط ہو جائیگی۔ جس نے کسی عورت کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کیا، پھر اس عورت کے ساتھ شادی کر لی تو اس پر بالاتفاق حد جاری ہوگی، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت کے مطابق اس پر حد نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح عورت پر بھی حد جاری ہوگی جب اس کے ساتھ زنا کیا ہو اور پھر اس سے شادی کر لی ہو۔

اگر مرد اقرار کرتا ہو کہ اس نے زنا کیا ہے لیکن عورت انکار کرتی ہو تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس مرد کو حد نہیں لگائی جائیگی اور صاحبینؒ کے نزدیک اس پر حد جاری کی جائیگی۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ بکر بن لیث (قبیلے) کا ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور اقرار کیا کہ اس نے عورت کے ساتھ زنا کیا ہے، چار مرتبہ اقرار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو سو کوڑے لگوائے، وہ غیر شادی شدہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مرد سے عورت کے خلاف بینہ طلب کئے تو عورت بولی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! خدا کی قسم! یہ شخص جھوٹا ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تہمت کے اسی کوڑے اس آدمی کو لگوائے۔"[1]

محصن زانی کی سزا

زانی اگر محصن ہو تو اس کی سزا یہ ہے کہ اسے پتھروں سے رجم کیا جائے حتیٰ کہ وہ مر

---

[1] [سنن ابی داؤد: ۱۶۰/۴]

جائے، اس کی دلیل حدیث ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کیا تھا اور وہ محصن تھے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں جو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، مگر تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز پائی جائے تو خون حلال ہو جاتا ہے، ایک شادی شدہ زانی کا، دوسرا جان کے بدلے جان کا قتل اور تیسرا وہ شخص جو (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو کر اپنے دین کو ترک کرنے والا ہو۔''[1] نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غامدیہ کو رجم کیا تھا۔ نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب کو نازل کیا، اور جو احکام ان پر نازل فرمائے ان میں سے ایک آیت رجم ہے، ہم نے اس آیت کو پڑھا ہے اور اس کو محفوظ بھی رکھا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی رجم کیا ہے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد رجم کریں گے، اور مجھے خدشہ اس بات کا ہے کہ طویل زمانہ گزرنے کے بعد کوئی کہنے والا یہ کہے کہ ہم کتاب اللہ میں آیت رجم کو نہیں پاتے، پھر وہ ایسے فریضہ کے ترک کرنے پر گمراہی کے گڑھے میں جا گریں جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، پس یہ رجم اس مرد و عورت پر لازم ہے جو زنا کرے اور وہ محصن ہو، جبکہ بینہ قائم ہو جائیں یا حمل یا اعتراف ہو جائے۔ خدا کی قسم! اگر لوگوں کو اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی کتاب میں اضافہ کر دیا، تو میں اس آیت کو ضرور لکھواتا۔[2] اور وہ آیت یہ ہے: ''اِذَا زَنَی الشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ فَارْجُمُوْھُمَا اَلْبَتَّۃَ نکالاً مِنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ'' [الاتقان: ۲۵/۴]

اور یہ ان آیات میں سے ہے جن کے متعلق علماء کا اجماع ہے کہ یہ قرآن کا وہ حصہ ہے جس کے الفاظ تو منسوخ ہیں لیکن اس کا حکم باقی ہے۔

اجرائے حد کے لئے زانی کو کھلے میدان میں لے جایا جائے گا جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا تھا، اور اس لئے بھی کہ اس طرح رجم کرنا سہل ہوگا اور کسی کو تکلیف بھی نہیں پہنچے گی۔ جب رجم کرنے لگیں گے تو رجم کرنے والے لوگ نماز کی طرح صف بندی کریں گے، جب ایک قوم رجم کر لے گی تو وہ پیچھے ہٹ جائے گی اور دوسرے لوگ آگے بڑھیں گے اور وہ رجم کریں گے۔ زانی محصن کے لئے گڑھا نہیں کھودا جائے گا اور نہ ہی باندھا جائیگا بلکہ اس کو لوگوں کے سامنے سیدھا کھڑا کیا جائے گا۔ اگر عورت کو رجم کرنا ہو تو امام کو اختیار ہے چاہے تو اس کے لئے گڑھا کھدوا لے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غامدیہ کیلئے گڑھا کھدوایا تھا،

---

1 [صحیح مسلم: ۱۳۰۲/۳۷] 2 [سنن ابی داؤد: ۱۴۴/۴]

اوراس لئے بھی کہ گڑھا کھودنا اس عورت کے لئے زیادہ ستر کا باعث بھی ہے کہ کہیں اس کا ستر کھل نہ جائے اور اگر چاہے تو نہ کھدوائے، اس لئے کہ اس عورت کا بھاگنے کی وجہ سے رجوع متوقع ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عورت (غامدیہ) کے متعلق حکم دیا، پس اس کے کپڑے اس کے بدن پر کس دیئے گئے پھر رجم کرنے کا حکم دیا اور اس کو رجم کیا گیا۔[1] اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عورت کے متعلق حکم دیا، پس اس کے لئے گڑھا کھودا گیا اور پھر اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا، پھر اس کو سنگسار کر دیا گیا۔''[2] رجم کی ابتدا گواہوں سے کی جائے گی (یعنی وہ پہلے رجم کرنا شروع کریں گے) پھر قاضی رجم کرے گا، پھر تمام لوگ رجم میں حصہ لیں گے۔ گواہوں سے رجم کی ابتداء ان کے امتحان وآزمائش کے لئے ہوگی، بسا اوقات گواہ قتل کو سنگین خیال کرتے ہوئے اپنی گواہی سے رجوع کر لیتے ہیں اور بسا اوقات بعض گواہ رجم (سنگساری) سے رک جاتے ہیں تو اس صورت میں اس کو رجم نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ رجوع کی دلیل ہے۔ اسی طرح اگر گواہ موقع سے غائب ہو جائیں یا سب فوت ہو جائیں یا بعض گواہ فوت ہو جائیں یا دیوانے ہو جائیں یا فاسق ہو جائیں یا تہمت لگانے کی وجہ سے سزا یافتہ ہو جائیں یا ان میں سے ایک کو حد قذف لگ جائے یا اندھا یا گونگا یا مرتد ہو جائے تو ان تمام صورتوں میں زانی کو رجم نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ استیفائے حد سے پہلے پیش آنے والی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے ابتدائے حد میں، جیسا کہ مقرّ کے رجوع کرنے کا حکم ہے۔ لہٰذا وہ ایسے ہوئے جیسے انہوں نے مذکورہ صفت وحالت میں گواہی دی، اس لئے حد جاری نہیں ہوگی۔

لیکن اگر گواہ عذر کی بناء پر رجم نہ کریں مثلاً وہ بیمار ہوں یا مقطوع الید ہوں تو قاضی پر لازم ہے کہ وہ سنگسار کرے، پھر لوگوں کو سنگساری کا حکم دے۔ اگر چار آدمی اپنے باپ کے خلاف زنا کی شہادت دیں تو ان پر واجب ہے کہ وہ رجم کی ابتداء کریں، اسی طرح بھائی اور محرم رشتہ دار کا بھی یہی حکم ہے اور ان کے لئے مستحب ہے کہ وہ قصداً قتل نہ کریں، البتہ دوسروں کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ ہر وہ شخص جو پتھر مارتا ہو وہ اس کو قصداً قتل کرے، کیونکہ وہ واجب القتل ہے۔ اور اگر زانی کا زنا اس کے اعتراف اور اقرار سے ثابت ہوا ہو تو پہلے قاضی رجم کرے گا، پھر تمام لوگ رجم کریں گے۔

اگر زانیہ حاملہ ہو تو وضع حمل تک رجم نہ کیا جائے اور بچے کو بڑا ہونے دیا جائے، اس لئے کہ حاملہ عورت کو رجم کرنے سے بچہ تلف ہوگا، حالاں کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے، اس کی دلیل

---

[1] [سنن ابی داود: ۴/۱۵۱] [2] [سنن ابی داود: ۴/۱۵۲]

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ غامدیہ (خاتون) آئیں اور انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں نے زنا کیا ہے، مجھے پاک کر دیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عورت کو واپس بھیج دیا، اگلے روز پھر وہ آ کر کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ نے مجھے واپس کیوں بھیج دیا؟ شاید آپ مجھے اسی طرح واپس بھیجتے ہیں جس طرح ماعز رضی اللہ عنہ کو آپ نے واپس بھیجا تھا! خدا کی قسم! میں حاملہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب تم چلی جاؤ۔ جب بچہ جنم لے تو آ جانا'' جب اس نے جنم دیا تو بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میں نے یہ بچہ جنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اب جاؤ، اس کو دودھ پلاؤ یہاں تک کہ تم اس کا دودھ چھڑاؤ تو آنا، جب اس نے اس کا دودھ چھڑایا تو بچے کو لے آئیں بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا بھی تھا، اور عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے اس کا دودھ بھی چھڑا لیا ہے اور یہ کھانا بھی کھانے لگا ہے پھر وہ بچہ ایک مسلمان آدمی کے حوالہ کر دیا گیا اور اس عورت کے متعلق حکم ہوا اور اس کے لئے اس کے سینے تک ایک گڑھا کھودا گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا، لوگوں نے اس کو رجم کرنا شروع کیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک پتھر لیا اور اس کے سر پر مارا جس سے خون کا چھینٹا خالد رضی اللہ عنہ کے چہرے پر پڑا۔ خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو برا بھلا کہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن لیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اے خالد! رک جاؤ، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ''مکس'' (وہ ٹیکس جو مظلوم پر لگایا جائے) والا بھی ایسی توبہ کرے تو اس کی مغفرت ہو جائے'' پھر اس عورت کا نماز جنازہ پڑھا گیا۔ اور پھر اس کو دفن کر دیا گیا۔[1]

محدود فی الزنا کو غسل بھی دیا جائے گا اور کفن دے کر نماز جنازہ بھی پڑھا جائیگا، اس لئے کہ وہ حق کی وجہ سے قتل ہوا۔ لہٰذا غسل کا حکم ساقط نہیں ہوگا، جیسے قصاص میں کوئی قتل کیا گیا ہو اس کو غسل بھی دیا جاتا ہے اور کفنایا بھی جاتا ہے اور نماز جنازہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس غامدیہ خاتون کا نماز جنازہ پڑھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ پر حد جاری کئے جانے کے دو تین روز کے بعد اپنے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کے لئے دعائے مغفرت کرو۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اللہ نے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کی مغفرت کر دی ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ پوری امت میں تقسیم کر دی جائے تو ان کو کافی ہو جائے۔''[2]

زانی محصن کی سزا میں رجم اور جلد (کوڑے لگانا) دونوں کو جمع نہیں کیا جائے گا۔

---

[1] [صحیح مسلم: ۱۳۲۳/۳]۔　[2] [صحیح مسلم: ۱۳۲۲/۳]

غیر محصن زانی کی سزا

اگر زانی غیر محصن ہو تو اس کی سزا سو کوڑے ہیں۔ امام وقت ایسے کوڑے سے اس کو مارنے کا حکم دے گا جس میں گرہ نہ ہو اور متوسط طریقہ سے مارنے کا حکم دے گا اور اس کے اعضاء پر متفرق طور پر کوڑے لگوائے گا۔ اس کے سر پر یا چہرے یا شرمگاہ پر مارنے سے احتراز کرے گا اور متوسط ضرب وہ ہوتی ہے جو مبرح اور غیر مؤلم کے درمیان ہو۔ اس لئے کہ ضربِ مبرح (سخت مارنا) سے وہ ہلاک ہی ہو جائے گا اور ضرب غیر مؤلم (ایسا مارنا جس سے تکلیف نہ ہو) سے اس کو زجر و تنبیہ نہ ہوگی۔ اور ازار کے سوا باقی سارے کپڑے اتار دیئے جائیں۔ اس لئے کہ کپڑے تکلیف کے پہنچنے سے مانع ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ" [النور:۲]

"یعنی اللہ کے دین کے لئے ان پر نرمی کا برتاؤ نہ کرو۔"

زانی کے متفرق اعضاء پر کوڑے لگائے جائیں، کیونکہ ایک ہی عضو پر سارے کوڑے لگانا موجب ہلاکت ہے، حالاں کہ کوڑے لگانا زجر کے لئے ہے نہ کہ ہلاکت کے لئے۔ نیز اس لئے بھی متفرق اعضاء پر کوڑے لگائے جائیں کہ جس طرح اس کے تمام اعضاء تک لذت پہنچی ہے اسی طرح تمام اعضاء تک تکلیف بھی پہنچے، البتہ ان اعضاء سے پرہیز کرے جن کے تلف ہونے کا خدشہ ہو، اس لئے کہ تلف کرنے کا وہ مستحق نہیں ہے، جیسے سر اور شرمگاہ پر کوڑے لگانا باعث قتل ہے اور چہرہ، دیکھنے اور سونگھنے کا محل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حد میں چہرے پر مارنے سے منع بھی کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص مارے تو چہرے پر مارنے سے احتراز کرے۔"[1]

مرد کو تمام حدود میں کھڑا کر کے مارا جائے گا، اس کو زمین پر چہرے کے بل نہ ڈالا جائے گا اور نہ ہی اس کے دونوں ہاتھ باندھے جائیں گے اور کوڑے مسلسل مارے جائیں گے اور یہ جائز نہیں کہ ہر روز کوڑوں کی تعداد مقرر کر کے متفرق طور پر مارے جائیں، اس لئے کہ اس سے ایلام (درد و تکلیف) حاصل نہ ہوگا، لیکن اگر ایک دن پچاس کوڑے لگاتار لگائے جائیں اور پھر دوسرے دن بھی اسی طرح پچاس کوڑے لگائے جائیں تو اصح قول کی بناء پر کافی ہو جائے گا۔

عورت کے کپڑے نہیں اتارے جائیں گے، صرف اوپر والا کوٹ وغیرہ اتارا جائے گا،

---

[1] [سنن ابی داود: ۱۶۷/۴]

اس لئے کہ عورتوں کے حال کی بنیاد ستر پر ہے، کپڑے اتارنے میں برہنگی ہے۔ عورت کو بٹھا کر حد لگائی جائیگی، کیونکہ یہی اس کے لئے زیادہ ستر کا باعث ہے، اس کے کپڑے اس پر لپیٹ کر باندھ دیئے جائیں گے اور یہ کام کوئی عورت انجام دے گی۔

غیر محصن زانی کو جلد (کوڑے لگانا) اور نفی (جلا وطنی) دونوں سزائیں نہیں دی جائیں گی، ہاں اگر قاضی اس میں کوئی مصلحت سمجھے تو بطور تعزیر کے جو مقدار مناسب خیال کرے لگا دے، لیکن بطور حد کے ایسا نہیں کرسکتا۔ اس کی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے:

"اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ" [النور:۲]

"زانی مرد اور زانی عورت ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔"

یہ آیت پوری حد کا بیان ہے لہٰذا اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر اس کے ساتھ جلا وطنی بھی بطور حد ہوتی تو غایت بعض حد ہوتی، نیز حدود کی مقادیر تو متعین ہیں اور جلا وطنی کی مسافت میں کوئی مقدار معین نہیں ہے۔ اور عورت کی جلا وطنی زنا کے دروازے کھولنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اسے اپنے خاندان اور قبیلے کے لوگوں سے حیا ہوتی ہے، ممکن ہے کہ اب وہ بدکاری کو پیشہ ہی بنا لے اور اس سے جو فتنہ وفساد پیدا ہوتا ہے وہ واضح ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کفی بالتغریب فتنة یعنی فتنہ وفساد کے برپا ہونے کے لئے یہی جلا وطنی کافی ہے۔" اور آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ ثیب کو ثیب کی وجہ سے سو کوڑے اور پھر رجم کیا جائے گا اور بکر کو بکر کی وجہ سے سو کوڑے پھر ایک سال کے لئے جلا وطن کیا جائے گا۔"

اس آیت کی وجہ سے منسوخ ہے، کیونکہ آیت اس سے متاخر ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ اصل میں پہلے سزا صرف ایذا رسانی مقرر ہوتی، ارشاد ہوا: "فَاٰذُوْهُمَا" [النساء:۱۶] "ان دونوں کو ایذاء دو" پھر یہ حکم منسوخ ہوا اور حبس کرنے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا: فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ اَوْیَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا" [النساء:۱۵] "تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں .... یا اللہ تعالیٰ ان عورتوں کے لئے کوئی اور صورت ظاہر کرے گا۔" پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "مجھ سے معلوم کرلو، اللہ نے ان کے لئے ایک صورت بیان کر دی ہے، وہ یہ ہے کہ ثیب کی وجہ سے ثیب کو سو کوڑے اور پھر سنگسار کیا جائے اور بکر کو بکر کی وجہ سے سو کوڑے اور ایک سال کے لئے جلا وطنی ہے۔" آپ ﷺ کا یہ فرمان اس صورت کا بیان تھا جس کا وعدہ آیت میں کیا گیا تھا، پھر سورۃ النور میں آیت جلد نازل ہوئی جس نے تمام سابقہ صورتوں کو منسوخ کر دیا یا اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد کے ذریعہ کتاب اللہ پر زیادتی (اضافہ) جائز نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو جلا وطن کیا تو وہ روم چلا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب میں کسی کو جلا وطن نہیں کروں گا۔ معلوم ہوا کہ اگر جلا وطنی حد ہوتی تو اس کا ترک کرنا جائز نہ ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ'' [النور:۲]

''اللہ کے دین کے معاملہ میں کہیں تم میں نرمی پیدا نہ ہو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جلا وطنی کی سزا تعزیر اور سیاست کے طور پر تھی۔

مریض، حاملہ اور حیض ونفاس والی عورتوں کی سزا

اگر مریض نے زنا کیا اور اس کی حد رجم ہو تو اس کو رجم کیا جائے گا، اس لئے کہ وہ اتلاف کا مستحق ہے، لہٰذا مرض کے سبب تاخیر حد کا کوئی معنی نہیں اور اگر اس کی حد جلد (کوڑے لگانا) ہو تو کوڑے نہیں لگائے جائیں گے جب تک کہ وہ شفایاب نہ ہو جائے تاکہ اس کی حد موجب ہلاکت نہ ہو، جبکہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے۔ اسی لئے جب گرمی شدید ہو یا سردی شدید پڑ رہی ہو تو اس کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔

اور جب حاملہ عورت زنا کرے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی جب تک کہ اسے وضع حمل نہ ہو جائے تاکہ اس سے بچہ ہلاک نہ ہو کیونکہ وہ قابل احترام جان ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غامدیہ (خاتون) کو وضع حمل تک مہلت دی، حتیٰ کہ اس نے بچہ کو دودھ پلایا پھر دودھ چھڑایا اور اگر اس کی حد کوڑوں کی ہو تو جب تک نفاس سے پاک نہ ہو جائے کوڑے نہیں لگائے جائیں گے، کیونکہ نفاس بھی ایک گونہ مرض ہے۔ حیض والی عورت کو حالت حیض میں ہی کوڑے لگائے جائیں گے، اس لئے کہ حیض مرض نہیں ہے۔ اگر حیض ونفاس والی عورتوں کی حد رجم ہو تو اس کو حالت نفاس میں رجم کیا جائے گا، اس لئے کہ حد میں تاخیر بچے کی وجہ سے تھی، اب تو وہ پیٹ سے نکل آیا ہے اس کی دلیل غامدیہ کے بارے میں دوسری روایت ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ وہ زنا سے حاملہ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا واقعی تم حاملہ ہو؟ اس نے کہا کہ جی ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ جب تک کہ تم اپنے پیٹ میں موجود بچے کو جنم نہ دے لو پھر ایک انصاری آدمی نے اس عورت کی کفالت کی یہاں تک کہ اس کا بچہ پیدا ہو گیا۔ پھر وہ آدمی آیا اور

عرض کیا کہ غامدیہ نے بچہ جنم دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابھی ہم اس کو رجم نہیں کریں گے، اس کے بچے کو دودھ پلانے والی کوئی نہیں ہے۔" وہ انصاری آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے اللہ کے نبی ﷺ! اس کو دودھ پلانے کی ذمہ داری میں لیتا ہوں، آپ ﷺ نے پھر اس کو رجم کرنے کا حکم دیا اور اس کو رجم کیا گیا۔[1]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس عورت کی سزا میں اتنی تاخیر کی جائیگی کہ اس کا بچہ اس سے مستغنی ہو جائے، اگر بچے کی تربیت و پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو۔

(۲) حد قذف

لفظ قذف کا لغوی معنی ہوتا ہے کسی چیز کا پھینکنا اور عیب لگانا اور تقاذف کا معنی ہوتا ہے ایک دوسرے پر کوئی چیز پھینکنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ" [الانبیاء:۱۸]

"ہم حق کو باطل پر اس زور سے پھینکیں گے کہ وہ اسے پیس کر رکھ دے گا۔"

نیز ارشاد خداوندی ہے:

"وَيَقْذِفُونَ بِالْغَيْبِ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ" [سبأ:۵۳]

"وہ دور دور سے بے تحقیق باتیں ہانکا کرتے تھے"

یعنی وہ لوگ (کفار) دنیا میں تو کفر کرتے رہے، اب انہیں ایمان کی سوجھی ہے۔ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس دو لڑکیاں، جنگ بعاث میں انصار کی طرف سے کہے گئے اشعار اور رجز پڑھ رہی تھیں، اس حدیث میں لفظ "تقاذفت بہ الانصار" آیا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ ان انصار نے ان اشعار اور اراجیز کے ذریعہ مخالفین کو سب وشتم کیا۔ اس میں بھی پھینکنے کے معنی موجود ہیں، کیونکہ سب وشتم کرنا بھی عیب لگانے اور بہتان طرازی کے معنی کو شامل ہے۔

اور اصطلاح شریعت میں قذف مخصوص قسم کے عیب لگانے کو کہتے ہیں یعنی زنا کا عیب لگانا۔

اس میں اصل یہ آیت مبارکہ ہے:

"وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً" [النور:۴]

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں (شادی شدہ) پر تہمت لگاتے ہیں، پھر چار گواہ

---

[1] [صحیح مسلم: ۱۳۲۲/۳]

نہ لائیں تو ان کو اسی کوڑے لگاؤ۔“

اس آیت قرآنی میں محصنہ (آزاد عورت) پر قذف کا حکم مذکور ہے۔ لیکن بطریق دلالۃ النص یہ قذف محصن (آزاد مرد) کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ اس حد کے وجوب کا مقصد عار وشرمندگی کو دور کرنا ہے اور یہ چیز دونوں کو شامل ہے اور محصنہ کا ذکر خاص طور سے اس لئے کیا گیا کہ عام طور پر قذف (تہمت) ان پر لگائی جاتی ہے۔

حدِ قذف کا ثبوت

حدِ قذف، قاذف کے ایک مرتبہ اقرار کرنے اور دو مردوں کی شہادت سے ثابت ہو جاتی ہے جیسے دیگر تمام حقوق کا حکم ہے۔ حدیث میں ہے کہ ھلال بن امیہ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے شریک بن سحماء کے ساتھ اپنی بیوی پر تہمت زنا لگائی تو آپؐ نے فرمایا: بینہ پیش کرو یا پھر تیری پیٹھ پر حد لگے گی۔“[1]

قاذف کسے کہیں گے؟

جب کوئی شخص کسی محصن مرد یا محصنہ عورت پر صریح لفظوں میں زنا کی تہمت لگائے۔ مثلاً یوں کہے کہ اے زانی! یا تو نے زنا کیا ہے۔ یا کہے کہ تو زانی ہے یا اے زانیہ، یا تو زانیہ ہے۔ یا کہے کہ اے زانی کے بیٹے یا اے زانیہ کے بیٹے، تو اس کو قاذف کہیں گے۔ لیکن اگر یوں کہے کہ تو لوگوں میں سب سے زیادہ زنا کرنے والا ہے۔ تو حد قذف جاری نہ ہوگی، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تو زنا پر لوگوں میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ یہی حکم ہے جب کسی قاذف (زنا کی تہمت لگانے والا) کی تصدیق کرے کہ تم نے سچ کہا ہے تو تصدیق کنندہ پر حد قذف جاری نہیں ہوگی اس لئے کہ یہ قذف میں صریح نہیں ہے۔

حد قذف کب واجب ہوتی ہے؟

جس زبان میں بھی تہمت لگائے حد واجب ہوگی۔ جب قاذف اپنی بات کی سچائی پر چار گواہ پیش کرنے سے عاجز آ جائے تو اس وقت حد قذف واجب ہو جائیگی۔ اور جب حد واجب ہو جائے تو پھر اس کو معاف کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ ایک اعتبار سے شرع کا حق ہے۔ اس لئے کہ یہ حد زجر وتنبیہ کے لئے مشروع کی گئی ہے اور یہ حد ایک مقررہ تعداد پر مشتمل ہے جس پر زیادتی

---

[1] [صحیح البخاری: ۱۰۰۳]

(اضافہ) جائز نہیں ہے۔ نیز مقذوف کا ان لوگوں میں سے ہونا ضروری ہے جن سے فعل زنا کا صدور ممکن اور متصور ہو، معلوم ہوا کہ اگر وہ مجنون ہو یا خنثیٰ ہو تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔

مقذوف کا محصن ہونا

مقذوف میں یہ شرط ہے کہ وہ عقل، بلوغ، حریت (آزاد ہونا)، اسلام اور عفت کے ساتھ متصف ہو۔ عقل و بلوغ کی شرط اس لئے ہے کہ مجنون اور چھوٹے بچے کو زنا کی وجہ سے ننگ و عار لاحق نہیں ہوتی، کیونکہ فعل زنا کی حقیقت ان سے متحقق نہیں ہوتی اور حریت (آزاد ہونا) کی شرط اس آیت قرآنی کی وجہ سے ہے:

فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَاعَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ [النساء:۲۵]

''یعنی ان باندیوں پر اس سزا کا نصف ہوگا جو سزا محصنہ عورتوں پر ہوتی ہے۔''

اور مسلمان ہونے کی شرط اس لئے ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''من اشرک باللّٰه فلیس بمحصن'' یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والا محصن نہیں ہے۔''[1]

اور عفت کی شرط اس لئے لگائی گئی کہ غیر عفیف (بدکار شخص) پہلے سے متہم بالزنا ہونے اور عدم حیا کے باعث عار محسوس نہیں کرتا۔ اور اس لئے کہ حد قذف جھوٹ کی سزا کے لئے واجب ہوتی ہے اور غیر عفیف پر تہمت لگانے والا تو سچا ہے۔

حد کب ساقط ہوتی ہے؟

مقذوف کی تصدیق سے قاذف سے حد ساقط ہو جاتی ہے یا مقذوف کے زنا پر چار گواہوں کے قائم ہونے سے بھی حد قذف ساقط ہو جاتی ہے خواہ حد کے بعد گواہ قائم کرے یا حد کے دوران۔ اگر حد کے بعد گواہ قائم کئے تو امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کی گواہی کو جائز قرار دیا جائے گا۔ یا اس لئے کہ اس بینہ سے اس کا زنا ثابت ہوا ہے اور حد اس ضرب سے منتفی ہوگی جو اس نے لگائی۔ پس وہ عام قسم کی ضرب ہے جو قبول شہادت سے مانع نہیں ہے۔

حد جاری کرنا کب واجب ہوتا ہے؟

مقذوف کے مطالبہ پر اجرائے حد واجب ہو جاتی ہے، اس لئے کہ یہ اپنی ذات سے عار کو دور کرنے کے لئے اس کا حق ہے۔ پس حد قذف اللہ کا وہ حق ہے جس میں بندوں کا حق بھی

[1] [نصب الرایۃ: ۳/۳۲۷، سنن البیہقی: ۸/۳۱۶]

شامل ہے۔ حد ہونے کے اعتبار سے اللہ کا حق ہے اور مقذوف سے دفع عار کی غرض سے اس کے مشروع ہونے کے اعتبار سے یہ بندے کا حق ہے۔ اور یہ حق تقادمِ زمان کی وجہ سے باطل نہیں ہوتا جیسا کہ اس سے رجوع کرنے سے باطل نہیں ہوتا کیونکہ بندے کا حق اس سے متعلق ہے۔ الجامع الصغیر میں چھ مہینے کی مدت کا اشارہ ملتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی کوئی مدت متعین نہیں فرمائی بلکہ ہر دور میں قاضی کی رائے کے سپرد کیا ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ماہ کی مدت مقرر کی ہے لیکن جیسا کہ گزر چکا ہے کہ تقادم زمان کا اعتبار زنا میں ہے، یہاں نہیں ہے۔

حد کیسے جاری کی جائے؟

آزاد کیلئے اسی کوڑے اور غلام کے لئے چالیس کوڑے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَاعَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ" [النساء:۲۵]

''ان باندیوں پر نصف سزا ہے اس کی جو آزاد عورتوں پر ہوتی ہے۔''

جب قاذف چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے اسی کوڑے لگائے جائیں گے، اور اس کی گواہی صریح نص کی بنا پر مردود ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا'' [النور:۴]

''اور جو لوگ محصنہ عورتوں (آزاد عورتوں) پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کرو۔''

قاذف کے اعضاء پر متفرق کوڑے مارے جائیں اور اسے اپنے کپڑوں سے برہنہ نہ کیا جائے کیونکہ حد قذف کا سبب قطعی نہیں لیکن اس کی پوستین، لبادہ (کوٹ، اچکن، جیکٹ وغیرہ) اتار لیا جائے، کیونکہ اس (لبادہ وغیرہ) سے چوٹ کا اثر نہ پہنچ سکے گا۔ آیت ہذا اگرچہ مطلق ہے لیکن اس میں غلام شامل نہیں ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے:

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا [النور:۴]

''اور ان کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کرو۔''

غلام اگرچہ تہمت نہ لگائے اس کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔ جب مسلمان کو قذف میں حد لگ جائے تو اس کی گواہی ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے اگرچہ وہ توبہ کرلے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا [النور:۴] یعنی پھر ان کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کرو۔ نیز

اس لئے کہ اس نے اپنی زبان سے مقذوف کو اذیت پہنچائی ہے، اس لئے اللہ نے بھی اس کی زبان کھینچ لی ہے اور زبان کا ثمرہ اقوال کا نفاذ ہے۔ اگر توبہ کے بعد اس کی گواہی قبول ہو تو اس بات کا وہم ہوگا کہ اس کی تہمت سچی تھی، اس سے مسلمان کی ہتک عزت ہوگی۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا" [النور:۵] میں استثناء کا تعلق اس سے پہلے مذکور "فَاسِقُوۡنَ" کے ساتھ ہے۔ "لَاتَقۡبَلُوۡا لَهُمۡ شَهَادَةً" سے نہیں ہے۔ نیز اس لئے کہ یہ استیناف کے زیادہ قریب ہے، مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں ذکر کی ہیں، ایک فسق، اور دوسری سقوط شہادت پس توبہ کرنے سے فسق کا نام اس سے زائل ہو جائے گا لیکن قبول شہادت کی ممانعت باقی رہے گی، کہ اللہ تعالیٰ نے سقوط شہادت کی تاکید تابید (اَبَدًا کے لفظ سے) کے ساتھ کی ہے، اگر توبہ سے اس کی گواہی قبول ہوتی تو تابید کا ذکر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اگر اجراء حد کے بعد مسلمان مرتد ہو جائے (نعوذ باللہ)، پھر مسلمان ہو جائے تو اس کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اسلام کی حالت میں پوری حد جاری کی گئی ہے۔ اور اگر کافر کو قذف میں حد لگے پھر وہ مسلمان ہو جائے تو اس کی گواہی قبول ہوگی۔

چند صورتیں

اگر کسی شخص نے غیر کو اس کے نسب کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ اے زانیہ کے بیٹے! تو اگر اس کی ماں زندہ ہو اور محصنہ ہو تو اسے حد کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا، اس لئے کہ حق اس کا ہے، اور اگر موجود نہ ہو تو اس کے سوا کسی اور کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کہ حد میں نیابت جائز نہیں ہے۔ اور اگر اس کی ماں فوت ہو چکی ہو اور محصنہ ہو اور بیٹا اس کے حق کا مطالبہ کرے تو قاذف کو حد لگائی جائے گی۔ اگر کسی شخص نے غیر کے نسب کی نفی اس کے دادے سے کی یا دادے کی طرف اس کو منسوب کیا یا ماموں یا چچا یا ماں کے شوہر کی طرف منسوب کیا تو ان صورتوں میں حد جاری نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرَاهِيۡمَ وَاِسۡمَاعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ" [البقرة:۱۳۳]

ترجمہ: حالانکہ ابراہیم علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے دادا تھے اور اسماعیل علیہ السلام ان کے چچا تھے۔

جس شخص نے غیر کو اس کے باپ کے علاوہ کسی اور صفت کی طرف منسوب کیا مثلاً سخاوت کی صفات کے ساتھ موصوف کرتے ہوئے کہا: اے جود و کرم اور سخاوت کرنے والے کے بیٹے! تو حد جاری نہیں ہوگی۔

جو دوسرے سے یوں کہے کہ تو فلاں کا بیٹا نہیں ہے، اگر وہ غصہ کی حالت میں نہیں تھا تو حد جاری نہیں ہوگی، اس لئے کہ عام طور پر اس سے مراد باپ سے مشابہت کی نفی ہوتی کہ وہ اپنے باپ کی طرح سخی نہیں ہے اور اگر حالت غضب میں کہا تھا تو حد جاری ہوگی۔

اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو فاسق، خبیث یا کافر، چور، کتا یا خنزیر کہے تو اسے تعزیر لگائی جائے گی، اس لئے کہ اس لفظ سے اس نے دوسرے کو اذیت پہنچائی ہے اور ایک عیب اس پر لگایا ہے اور حدود کا ثبوت قیاساً نہیں ہوتا۔ لہٰذا تعزیر واجب ہوگی تا کہ وہ بھی اس سے باز آئے اور دوسرے بھی عبرت پکڑیں۔

حد یافتہ شخص کا خون رائیگاں ہے

قاضی جس شخص کو حد لگائے یا تعزیر لگائے وہ اس سے مر جائے تو اس کا خون رائیگاں ہوگا، اس لئے کہ وہ از روئے شرع اس کا مامور ہے۔ لہٰذا اس کو سلامت رہنے کے ساتھ مقید نہ کیا جائے گا۔ قاضی نے حکم الٰہی کی وجہ سے حد کو پوری طرح نافذ کیا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ نے اسے بلا واسطہ موت دیدی، لہٰذا ضمان واجب نہیں ہوگی۔

خاوند کا اپنی بیوی کو فہمائش کرنا

خاوند کے لئے جائز ہے کہ وہ ترک زینت و آرائش، ترک فراش (بستر پر نہ آنے)، ترک صلوۃ، ترک غسل جنابت اور گھر سے نکلنے پر بیوی کی گوش مالی کرے، کیونکہ بیوی پر اپنے خاوند اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت واجب ہے، پس اس کی خلاف ورزی پر اسے سزا دی جائیگی۔ لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب زینت و آرائش کے تمام اسباب اس کو مہیا کر دیئے گئے ہوں اور اس کے دل میں اس کی انسیت و موانست پیدا کر دی گئی ہو اور جماع کے دواعی و اسباب موجود ہوں اور ترک صلوٰۃ، گھر سے بلا اجازت نکلنے اور دوسرے امور پر اس کو پہلے وعظ و تذکیر اور نصیحت و فہمائش کی گئی ہو۔ ایسا نہ کرے جیسے بعض لوگ کرتے ہیں کہ اس پر بے جا پابندی لگا دیتے ہیں اور گھر کے دروازے کو مقفل کر دیتے ہیں۔ لیکن خوب وعظ و نصیحت کرنے کے بعد بھی وہ راہِ راست پر نہ آئے تو نافرمانی کرنے پر اس کو سزا دے سکتا ہے۔ اس کے جواز میں وہ حدیث ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور زور سے مجھے گھونسا مارا اور فرمایا کہ تم نے لوگوں کو ایک جگہ پر روک رکھا ہے، ایک ہار کی

غرض سے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس گھونسے سے مجھے بہت درد ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور میری کوکھ پر مارنے لگے۔[1]

حدود میں تداخل کی صورت

اگر کسی شخص نے کئی مرتبہ چوری کی یا کئی بار زنا کیا یا کئی بار شراب پی تو ایک بار حد جاری ہونے سے ہر مرتبہ کے لئے سزا مقصود ہوگی۔ کیونکہ حد (سزا) جاری کرنے کا اصل مقصد مجرم کو "تنبیہ" کرنا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زنا، شراب اور چوری کا مرتکب ہوا تو اس پر ہر جرم کی الگ الگ حد جاری ہوگی، اس لئے کہ اگر اس کو ان میں سے صرف ایک کی سزا دی جائے تو ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ باقی جرائم کی کوئی حد (سزا) نہیں ہے، اس طرح اس کو تنبیہ نہیں ہوگی۔ مگر ایک ہی جرم کے تکرار سے ایسا نہیں ہوگا۔

تعزیر کی قلیل اور کثیر مقدار

تعزیر کی زیادہ سے زیادہ مقدار انتالیس کوڑے ہیں اور کم سے کم مقدار تین کوڑے ہیں، کیونکہ اس سے کم میں تعزیر واقع نہیں ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور تعزیر میں چالیس کوڑوں تک تجاوز نہیں کیا جائے گے، اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: من بلغ حدًا فی غیر حدٍ فھو من المعتدین. یعنی جو شخص غیر حد میں "حد" کی مقدار تک جا پہنچا تو وہ اعتدال سے تجاوز کرنے والوں میں سے ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے جو احناف کے نزدیک قابل حجت اور موجب عمل ہے۔ تعزیر میں غیر متفرق طور پر کوڑے لگائے جائیں گے۔

احناف کے علاوہ دیگر ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ تعزیر میں دس کوڑوں سے زیادتی نہیں کی جائیگی، جیسا کہ ابو بردہ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کسی کو دس سے زیادہ کوڑے نہ لگائے جائیں، البتہ حدود اللہ میں لگا سکتے ہیں۔"[2]

(۳) حد شراب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "زانی زنا کرتے وقت مومن نہیں ہوتا اور شرابی شراب پیتے وقت مومن نہیں ہوتا اور چور چوری کرتے وقت مومن نہیں ہوتا اور کوئی شخص لوٹ مار کرتے وقت مومن نہیں ہوتا، جب لوگ اپنی نگاہیں اٹھا اٹھا کر اس کی

---

[1] [صحیح البخاری: ۱۴۲۷] [2] [صحیح مسلم: ۱۳۳۳/۳]

طرف دیکھتے ہوں۔"[۱]

حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نعمان یا نعیمان کا بیٹا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، وہ حالت نشہ میں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ بات گراں گزری تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھر کے لوگوں کو حکم دیا کہ اس کو ماریں، انہوں نے اس کو ڈنڈوں اور جوتوں سے مارا، اور ان مارنے والوں میں میں بھی تھا۔"[۲] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نشے میں دھت ایک آدمی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو مارنے کا حکم دیا، پس کوئی تو ہاتھ سے مارنے لگا اور کوئی اپنے جوتے سے مارنے لگا اور کوئی اپنے کپڑے سے اس کو مارنے لگا۔ پھر جب وہ چلا گیا تو ایک آدمی نے کہا کہ اس کو کیا ہوا، اللہ اس کو رسوا کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اپنے بھائی کے مقابلے میں شیطان کے معاون نہ بنو"[۳]

حضرت سائب بن یزیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں شراب پینے والے لائے جاتے تھے اور ہم اپنے ہاتھوں، جوتوں اور چادروں سے ان کی خبر لیتے تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے آخر میں چالیس کوڑے لگائے جانے لگے، یہاں تک کہ جب لوگ حد سے تجاوز کرتے اور فسق میں بڑھتے تو اسی کوڑے لگائے جاتے۔"[۴]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب پر چالیس کوڑے لگائے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو اسی کوڑے سے مکمل کر دیا اور ہر ایک سنت ہے۔"[۵]

مسلم کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "اور عمر نے اسی کوڑے لگائے اور ہر ایک سنت ہے اور یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔"[۶]

حد شراب کے وجوب پر دلیل یہ حدیث ہے کہ "جب وہ شراب نوشی کریں تو ان کو کوڑے لگاؤ۔ پھر شراب پئیں تو پھر کوڑے لگاؤ اور اگر پھر شراب پئیں تو پھر کوڑے لگاؤ" الحدیث[۷] حد شراب کیفیت کے لحاظ سے حد زنا کی طرح ہے کہ مجرم کے کپڑے اتارے جائیں گے اور متفرق اعضاء پر کوڑے لگائے جائیں گے اور کمیت (تعداد) کے اعتبار سے حد قذف کی طرح ہے کہ باجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اسی کوڑے لگائے جائیں گے۔

---

۱ [صحیح البخاری:۱۴۲۲] ۲ [صحیح البخاری:۱۴۲۳] ۳ [صحیح البخاری:۱۴۲۴]

۴ [صحیح البخاری:۱۴۲۳] ۵ [سنن ابی داؤد:۱۶۴/۴] ۶ [صحیح مسلم:۱۳۳۲/۳]

۷ [سنن ابی داؤد:۱۶۴/۴]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو، جس نے شراب پی ہوئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو دو ٹہنیوں سے تقریباً چالیس مرتبہ مارا۔ (راوی کا) بیان ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا ہی کیا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے لوگوں سے مشاورت کی تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے خفیف حد اسی کوڑے ہیں۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا حکم دیا۔"[1]

حضرت ثور بن زید الایلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کی سزا کے بارے مشورہ لیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ اس کو اسی کوڑے لگائے جائیں۔ کیونکہ کوئی شخص شراب پیتا ہے تو نشے میں آتا ہے اور جب نشے میں آتا ہے تو ہرزہ سرائی کرنے لگتا ہے اور جب ہرزہ سرائی کرتا ہے تو دشنام طرازی اور بہتان تراشی کرنے لگتا ہے۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شراب پر اسی کوڑوں کی سزا مقرر کر دی۔[2]

حد کا ثبوت

حد شراب کا ثبوت شارب خمر کے ایک مرتبہ اقرار کرنے اور دو آدمیوں کی شہادت پر ہو جاتا ہے۔ اس میں عورتوں کی شہادت قبول نہ کی جائیگی۔ کیونکہ حدود میں عورتوں کی شہادت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ پس جو شخص شراب پیئے اور اس حالت میں گرفتار ہو کہ شراب کی بو اس سے آرہی ہو یا لوگ اس کو اس حالت میں لائیں کہ وہ حالت نشہ میں ہو، پھر اس پر دو آدمی گواہی دیں تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔

اسی طرح جب وہ اقرار کرے اور شراب کی بو موجود ہو تو حد جاری کی جائے گی۔ بو کا پایا جانا شہادت کے وقت ضروری ہے۔ اس لئے کہ جو شخص کسی آدمی پر قدیم زنا یا قدیم شراب نوشی یا قدیم سرقہ (چوری) کی شہادت دے تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔

اگر بو ختم ہونے کے بعد اقرار کرے تو شیخینؒ (امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ) کے نزدیک اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی، اسی طرح اگر شراب کی بو اور نشہ ختم ہونے کے بعد اس کے خلاف گواہی دی گئی تو حد جاری نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا کہ تقادم زمان بالاتفاق قبول شہادت سے مانع ہے اور شیخینؒ کے نزدیک بو کے موجود ہونے کی صورت میں ہی حد جاری ہوگی۔ اگر گواہوں نے اس کو اس حال میں گرفتار کیا کہ شراب کی بو موجود تھی یا وہ حالت نشہ میں تھا، پھر ایسے شہر میں اسے لے گئے

---

[1] [صحیح مسلم:۱۳۳۰/۳] [2] [الموطأ:۱۷۸/۵]

جہاں قاضی موجود ہوتا ہے لیکن عدالت میں پہنچنے سے پہلے وہ بوختم ہوگئی تو بالا جماع حد جاری ہوگی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بواور نشہ اگر چہ ختم ہو جائے بہر حال حد جاری ہوگی، پس ان کے نزدیک تقادم حد کو باطل نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص نے شرب خمر کا اقرار کیا، پھر اس نے رجوع کرلیا تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ معاملہ خالص اللہ کا حق ہے۔

شرابی پر حد کب جاری کی جائے گی؟

زوالِ سکر تک حد جاری نہیں کی جائیگی تا کہ زجر، جو اس سے مقصود ہے، حاصل ہو، دوسری وجہ یہ ہے کہ حالت سکر میں وہ زائل العقل ہے، اور جس نشئی پر حد جاری ہوتی ہے اس سے مراد وہ نشئی ہے جو بات کو یا جواب کو نہ سمجھ سکتا ہو اور نہ مرد وعورت میں امتیاز کرسکتا ہو اور نہ زمین و آسمان میں فرق کرسکتا ہو اور یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک شرابی وہ شخص ہے جو فضول گوئی کرتا ہو اور جس کا کلام خلط ملط ہو۔

اگر شرابی نے اپنی ذات پر نشے کی حالت میں اقرار کیا تو حد جاری نہ ہوگی، کیونکہ اس کے اقرار میں جھوٹ کا احتمال زیادہ ہے۔ جس شخص سے شراب کی بو پائی گئی یا اس نے شراب کی قے کی تو اس پر حد جاری نہ ہوگی کیونکہ بو میں احتمال ہے۔ یعنی شراب کے علاوہ بھی اور بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کے استعمال سے انسان کے منہ سے شراب کی بو یا قے کا گمان ہوتا ہے، چنانچہ شبہ پائے جانے کے باعث سقوط حد لازم آئے گی، نیز اس لئے کہ یہ چیز اس کے اختیار سے شراب نوشی پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ ممکن ہے کہ اس کو مجبور کیا گیا ہو یا پانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پیاس سے بیتاب ہو کر پی لی ہو، لہٰذا شبہ پائے جانے کے باعث حد جاری نہ ہوگی۔

اگر وہ نشئی مرتد ہو گیا تو اس کی اہلیہ اس (مرتد نشئی) سے جدا نہیں ہوگی، کیونکہ کفر اعتقاد کے باب سے ہے، پس نشے کے ساتھ اس کا تحقق نہیں ہوگا، اس لئے کہ زبان دل کی ترجمان ہے اور شک کی وجہ سے اس کا ارتداد قابل قبول نہیں ہوگا۔

(۴) حد سرقہ

مال و دولت انسان کو بڑا محبوب ہے اور انسانی طبائع اس کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ بالخصوص ضرورت اور حاجت کے وقت۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ نہ ان کی عقل ان کو اس سے روکتی ہے اور نہ کوئی آیت و حدیث اور نہ ہی امانت و دیانت اور مروت و انسانیت ان کو اس

شنیع فعل سے باز رکھتی ہے۔ اگر شرعی سزائیں نہ ہوتیں تو ایسے لوگ اعلانیہ طور پر لوگوں کے مال ہتھیانے اور ڈاکہ زنی کرتے پھرتے اور اس سے جو فساد و بگاڑ پیدا ہوتا ہے وہ واضح ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے اور لوگوں کی اصلاح حال کے پیش نظر قطع ید اور صلب جیسی سزا کا حکم دیا۔

سرقہ، لغت میں استراق السمع سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہوتا ہے، ''غیر کی بات کو چھپ کر سننا'' جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ [الحجر:۱۸]۔ ''مگر جو چوری چھپے بات سنتا ہو۔''

چنانچہ سرقہ کا لغوی مفہوم یہ ہوا کہ کسی چیز کا مالک کی اجازت کے بغیر خفیہ طریقہ سے لینا، وہ لی ہوئی چیز خواہ مال ہو یا کچھ اور ہو اور اصطلاح شریعت میں ''سرقہ'' وہ چوری کہلاتی ہے جس میں عاقل و بالغ آدمی کسی محفوظ شدہ نصاب یا جس کی قیمت نصاب تک پہنچتی ہو اور اس مال میں کہ وہ کسی غیر کی ملکیت ہو اور غیر کی ملکیت میں کوئی شبہ نہ ہو اسے پوشیدہ اور خفیہ طور پر حاصل کرے۔

واضح ہو کہ قابل حد سرقہ کے لئے چوری کی شرعی تعریف میں سات قیود ہیں: (۱) عاقل (۲) بالغ (۳) محرز (۴) نصاب (۵) غیر کی ملکیت (۶) ملکیت میں عدم شبہ (۷) خفیہ۔

حنفیہ کے نزدیک نصاب وہ ہے جس کی قیمت دس درہم یعنی ۲۹ گرام چاندی یا اس کی قیمت کے مساوی ہو، بشرطیکہ مسروقہ مال کی قیمت چوری کے وقت سے قطع ید تک دس درہم باقی رہے۔ پس اگر اس دوران اس کی قیمت دس سے کم ہو گئی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور لغوی معنی کا شرعی معنی میں ابتداء اور انتہاء دونوں میں یا صرف ابتداء میں لحاظ رکھا جائے گا۔

جیسا کہ کسی نے خفیہ طور سے کسی گھر میں نقب زنی کی اور مالک سے مال لے لیا اور اس کے نائب سے مال لے لیا اور یہ واقعہ رات کے وقت ہوا اور رات کے وقت کوئی مددگار یا فریاد رس ہوتا نہیں جو اس کی مدد کر سکے اس لئے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ (شرعاً) سارق (چور) ہوگا کیونکہ ابتداءً خفیہ طور پر مال کا لینا پایا گیا۔ لیکن دن کے وقت اگر یہ وقوعہ ہوا ہو تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ اگر وہ کسی کو مدد کیلئے پکارتا تو اس کی ضرور مدد کی جاتی اور چوری کرنا اس کیلئے ممکن نہ ہوتا۔ لہٰذا خفیہ کی شرط رات اور دن دونوں وقت ملحوظ ہوگی۔

سرقہ دو قسم پر ہے۔

(۱) سرقہ کبریٰ: جس کا ضرر اور نقصان صاحب مال اور عامۃ المسلمین سب کو پہنچے، جیسے رہزنی،

ڈکیتی، یعنی مسلمانوں کے ملک اور جن ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی ریاست کے سربراہ یا اس کے قائم مقام کے سپرد ہو ان سے خفیہ طور پر مال لے لیا جائے۔

(۲) سرقہ صغریٰ: جس کا ضرر اور نقصان صرف صاحب مال کو پہنچے، جیسے چوری، یعنی وہ مال مالک یا اس کے قائم مقام سے خفیہ طور پر لیا جائے۔

قطع ید کے وجوب پر دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

"وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا" [المائدہ:۳۸]

"اور چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو"

اور یہ آیت مبارکہ ہے:

"اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا" [المائدۃ:۳۳]

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے......"

نیز جس وقت ایک چور بارگاہ رسالت میں پیش کیا گیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "اقتلوہ" "اس کو قتل کر دو" صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس نے تو چوری کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اقتلوہ" "اس کو قتل کر دو"[۱]

نیز سارق (چور) کے قطع ید پر امت کا اجماع بھی ہے۔

کتنی قیمت پر قطع ید واجب ہوگا؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں چمڑے کی ڈھال کی قیمت (کے برابر چوری کرنے) پر ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔"[۲]

اب ڈھال کی قیمت کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، چنانچہ حاکم "المستدرک" میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ایمن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈھال کی قیمت کے برابر (چوری کرنے پر) ہاتھ کاٹا جاتا تھا اور اس وقت اس کی قیمت ایک دینار تھی۔"[۳]

حاکم نے حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما

---

۱ [سنن ابی داؤد:۱۴۲/۴] ۲ [صحیح البخاری ۱۴۲۶] ۳ [المستدرک:۳۷۹/۴]

فرماتے ہیں کہ ''عہد رسالت میں چمڑے کی ڈھال کی قیمت دس درہم لگائی جاتی تھی۔'' یہ حدیث صحیح علی شرط مسلم ہے، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ثابت قرار دیا ہے۔[1]

بہت سے ائمۂ جرح وتعدیل نے حضرت ایمن بن ام ایمن کو ثقہ رواۃ میں سے قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ دیکھئے ''الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۹۲/۱، مختصر الترغیب والترہیب''

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ذکر کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عہد رسالت میں ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔[2]

ڈھال کی قیمت کے بارے میں دوسرا قول وہ ہے جسے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ڈھال، جس کی قیمت تین درہم ہوتی ہے، اس پر ہاتھ کاٹا ہے، انہوں نے چوتھائی دینار قیمت بھی نقل کی ہے۔[3] بہر حال سقوط حد کے لئے احتیاطاً قول اول پر عمل کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔

وجوب قطع کی شرائط

۱۔ مال محفوظ مقام میں ہو، محفوظ مقام گھر، خیمہ، کمرہ یا جائے قیام ہے، یہ سب جگہیں محفوظ اور محرز ہیں۔ اگرچہ ان جگہوں میں کوئی موجود نہ ہو، خواہ ان مقامات سے اس طرح چوری ہوئی ہو کہ دروازہ کھلا ہو یا اس کا دروازہ ہی نہ ہو، اس لئے کہ عمارت احراز (حفاظت) کی غرض سے ہی بنائی جاتی ہے۔ البتہ قطع ید کا وجوب اخراج مال سے ہی ہوگا، جیسا کہ عنقریب ہم اس کو بیان کریں گے۔ یا پھر وہ مال اس کے صاحب کے پاس محفوظ ہو، خواہ وہ بیدار ہو یا سویا ہوا ہو۔

پس اگر کسی شخص نے دوسرے (غیر) کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ دھوکے سے اور خفیہ طور پر اس کا بٹوا اخذ کرے یا دوسرا شخص سویا ہوا ہو اور وہ (چور) اس کے سر کے نیچے رکھے ہوئے مال کو چرائے تو محض اخذ مال پر قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ اس کی دلیل صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''میں مسجد میں سویا ہوا تھا، میرے جسم پر تیس درہم کی دھاری دار چادر تھی، ایک آدمی آیا اور اس نے وہ چادر خفیہ طور پر لے لی، پھر وہ آدمی پکڑا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے متعلق قطع ید کا حکم دیا، میں حاضر خدمت ہوا، میں نے کہا کہ کیا آپ صرف تیس درہم پر اس کا ہاتھ کاٹتے ہیں، میں اس چادر کو اس کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، اور قیمت ادھار کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے اس کو میرے پاس

---

[1] [المستدرک: ۳۷۸/۴] [2] [سنن البیہقی: ۳۲۹/۸] [3] [صحیح البخاری ۱۴۲۵]

لانے سے پہلے ہی ایسا کیوں نہیں کرلیا؟"[1]

اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو نقل کیا ہے کہ وہ سوئے ہوئے تھے کہ ایک چور آیا اور اس نے ان کے سر کے نیچے رکھی ہوئی چادر چرالی......الحدیث۔

جو مال ایسی جگہ کی وجہ سے محفوظ ہو جو (جگہ) حفاظت مال کے لئے بنائی جاتی ہے، اس میں محافظ کا اعتبار نہیں ہے، کیونکہ وہ مال، صاحب مال کے بغیر ہی محفوظ ہے۔ البتہ قطع ید کی سزا اس صورت میں واجب ہوگی جب مال ایسی جگہ سے نکالا جائے جو جگہ حفاظت کے لئے بنائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ مالک کا قبضہ اس پر قائم ہے، جب تک کہ وہ اس کو گھر یا کمرے یا خیمے وغیرہ سے نہ نکالے۔ اور جو مال اپنے صاحب کی وجہ سے محفوظ ہو اس میں قطع ید کے وجوب کے لئے محض اس کا اخذ کرنا کافی ہے، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں صفوان رضی اللہ عنہ کی چادر کے معاملے میں ہوا کہ محض ان کے سر کے نیچے سے چادر کے چرانے پر سرقہ کا تحقق ہوگیا۔ اسی پر قیاس کیا جائے کہ اگر مال صحراء میں ہو یا مسجد میں ہو یا بازار میں ہو یا کھلیان میں ہو اور اس کی حفاظت کے لئے چوکیدار یا محافظ یا اس کا قائم مقام موجود ہو، پھر کوئی شخص خفیہ طور پر اس مال کو اخذ کرے تو قطع ید واجب ہوگا۔

اگر ایک چور گھر میں داخل ہوا، مالک کو اس کے اندر آنے کا پتہ نہ چلا تو چوری کرنے پر اس کا ہاتھ کاٹا جائیگا۔ اگر ایک جماعت چوری کی واردات میں شریک ہوئی ہو اور ہر ایک کے حصہ میں دس درہم آئے ہوں تو ان سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اگر چوروں کے گروہ میں سے ایک آدمی نے دس درہم کی چوری کی ہو تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور یہ قطع ید ان سب کے لئے ہوگا۔ اگر ایک چور گھر میں داخل ہوا اور گھر کے ایک کمرے سے ایک درہم چوری کر کے باہر صحن میں آگیا، پھر دوبارہ گیا اور ایک اور درہم چرایا اور مسلسل ایسا کرتا رہتا، یہاں تک کہ اس نے دس درہم چرالئے تو یہ ایک ہی سرقہ (چوری) شمار ہوگا۔ پس جب گھر سے دس درہم نکالے تو قطع ید ہوگا۔

اگر پھل، گندم اور گوشت کو محفوظ رکھا گیا ہو، ان کو فریج میں رکھ کر بند کرلیا گیا ہو، پھر چوری ہو جائے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر زیور سے آراستہ مصحف شریف کو یا دینی کتب کو بیچنے کی خاطر چرایا ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر اپنے پاس رکھنے کے لئے چرایا ہو تو نہیں کاٹا جائے گا۔ اگر خوشبو چرائی تو قطع ید ہوگا، اس لئے کہ یہ چیز جلدی سے خراب نہیں ہوتی۔

---

[1] [سنن ابی داؤد: ۱۳۸/۴]

جن صورتوں میں قطع ید واجب نہیں ہوتا

اگر کسی شخص نے کوئی غیر محفوظ مال لوٹ لیا ہو یا چوری کرلیا ہو جیسے درختوں پر لگے ہوئے پھل یا چراگاہ میں پھرنے والے جانور یا تجارتی دکان کے باہر پڑے ہوئے سامان۔ نہ کہ دکان کے اندر رکھے ہوئے سامان کو تو قطع ید واجب نہیں ہوگا۔ اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”خیانت کرنے والے، لوٹ مار کرنے والے اور چھینا جھپٹی کرنے والے پر قطع ید کی سزا نافذ العمل نہیں ہوگی۔“[۱]

اگر چور گھر میں داخل ہوا اور مالک کو اس کے آنے کا پتہ چل گیا اور چور کو بھی یہ معلوم ہو تو اس پر اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ خفیہ طور پر مال کا اخذ کرنا نہیں ہے بلکہ اعلانیہ طور پر ہے۔ اگر چور گھر میں داخل ہوا اور اس نے ایک کمرے سے ایک درہم چرایا، پھر اسے لے کر (گھر کی حدود سے) باہر آ گیا۔ پھر دوبارہ گیا، حتیٰ کہ اس نے دس مرتبہ ایسا کیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ یہ مختلف سرقات ہیں۔ اگر چور گھر میں رات کو گھسا گھر کا مالک گھر میں تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کا پتہ چل گیا تو اس پر قطع ید کی سزا نہیں ہوگی۔

اگر کپڑا چرایا جس کی قیمت دس درہم کے مساوی نہیں تھی جبکہ اس کی جیب میں پرس یا بٹوا وغیرہ ہے جس کے اندر دس سے زیادہ درہم موجود ہیں تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اگر اس کا علم نہ ہو تو قطع ید کی سزا نہیں ہوگی اور اگر اس کا علم ہو تو قطع ید کی سزا نافذ ہوگی۔

جب ایک جماعت چوری کی واردات میں شریک ہوئی اور ہر ایک کو انتیس گرام چاندی کی قیمت سے کم مال موصول ہوا ہو تو ان کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور ہر ایک نے جو حاصل کیا ہے اس کا ضامن ہوگا۔ جو چیز جلد خراب ہو جاتی ہے جیسے تازہ پھل، دودھ اور غیر محفوظ گوشت، ان کے چرانے پر قطع ید کی سزا نافذ العمل نہیں ہوگی۔ اس کی دلیل حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”لا قطع فی ثَمَرٍ وَلا كَثَر“[۲] یعنی درخت پر لگے پھل اور درخت کھجور کے گودے کو چرانے میں قطع ید نہیں ہے۔“ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مراسیل میں حضرت حسن البصری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انی لا اقطع فی الطعام[۳] ”یعنی میں کھانے کی چیز میں قطع ید نہیں کرتا۔“

---

۱ [سنن الترمذی: ۴/۳] ۲ [سنن الترمذی: ۵/۳] ۳ [نصب الرایۃ: ۳۶۲/۳]

مصنف عبدالرزاق میں حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:
''طعام'' سے مراد وہ کھانا ہے جو جلد خراب ہونے والی ہو، جیسے ثرید، گوشت۔''

اسی طرح موسیقی کے آلات، شطرنج اور نرد وغیرہ چرانے کی صورت میں بھی قطع ید واجب نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایسی چیز کے چرانے سے بھی قطع ید نہیں ہوگا جس میں روکنے اور منع کرنے کی تاویل ہوسکتی ہو، کیونکہ اس تاویل میں اس کے دعوے کی تصدیق کی جائیگی جو کہ ایک مسلمان کے ظاہر حال کا تقاضا ہے، بلکہ ایسا کرنا اس پر واجب ہے اور مصحف (قرآن مجید) کی چوری میں بھی قطع ید نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کے اخذ کرنے میں اس کی تلاوت اور دیدار کی تاویل کرسکتا ہے۔ گو کہ وہ مصحف سونے سے آراستہ ہو جس کی قیمت نصاب سرقہ کو پہنچتی ہو۔ شرعی اور دینی کتب کی چوری کا بھی یہی حکم ہے۔ جبکہ ان کو بیچنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے پاس رکھنے اور اس سے مستفید ہونے کے لئے چوری کرے، اس لئے کہ اس سے مقصود اس کو پڑھنا ہوتا ہے، اگر ان کتب دینیہ کو بیچنے کے لئے چوری کرے تو ان کی چوری میں اس کی تاویل معتبر نہ ہوگی بلکہ قطع ید واجب ہوگا۔ درختوں پر لگے پھل اور بن کٹی کھیتی کے چرانے میں قطع ید واجب نہیں ہوگا، اسی طرح پرندوں اور آوارہ پھرنے والی مرغیوں کی چوری میں بھی قطع ید نہیں ہوگا، لیکن اگر وہ محرز اور محفوظ جگہ میں ہوں اور وہاں سے چوری ہو جائے تو اس پر قطع ید ہوگا۔ ایسے مال کی چوری میں بھی قطع ید نہیں ہوگا جو عامۃ المسلمین کا حق ہے کیونکہ وہ بھی ان میں سے ہے۔ کتے کی چوری میں بھی قطع ید نہیں ہوگا گو اس کے گلے میں سونے کا پٹہ ہو، کیونکہ اصل مقصد کتے کا چرانا ہے اور وہ پٹہ اس کے تابع ہے، اگر کتے کے گلے سے سونے کا پٹہ کاٹ کر چرالیا تو قطع ید نہیں ہوگا کیونکہ یہ چوری محفوظ جگہ سے نہیں ہوئی۔ اگر کسی شخص نے اپنے والدین سے یا بیٹے سے یا رشتہ داروں (ذی رحم محرم) سے کوئی چیز چرائی تو اس پر قطع ید نہیں ہوگا، کیونکہ والدین اوز اولاد نہ صرف یہ کہ بلا تکلف ایک دوسرے کے گھر میں آمد و رفت رکھتے ہیں بلکہ اخذ مال میں بھی کوئی تکلف روا نہیں رکھا جاتا، اس بے تکلفی سے حرز زائل ہو جاتا ہے، جبکہ چوری کا تحقق حرز کے ساتھ مشروط ہے۔ نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أنت و مالک لأبیک'' یعنی تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے'' اور ذی رحم محرم کے چوری کرنے کی صورت میں قطع ید بھی اسی لئے نہیں ہے کہ باہمی آمد و رفت موجود ہوتی ہے اور اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ جو شخص اجازت لے کر گھر میں داخل ہو اور چوری کرے تو قطع ید نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر سسرال یا داماد کے گھر سے چوری کی ہو تو قطع ید نہیں ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اگر گھر داماد کا ہو تو قطع ید ہوگا لیکن اگر گھر بیٹی کا ہو تو

بالاجماع قطع ید نہیں ہوگا۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے کا مال چرانے میں بھی قطع ید نہیں ہوگا، کیونکہ ان کے درمیان ایسا سبب موجود ہے جو موجب توارث ہے، اور وہ شبہ ہے اور حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ اگر اجنبیہ عورت کی چوری کی، پھر اس سے شادی کر لی قبل اس کے کہ اس کے خلاف قطع ید کا فیصلہ ہو۔ تو شبہ کی وجہ سے قطع ید واجب نہیں ہوگا۔ اور اگر قطع ید کے فیصلے کے بعد شادی کی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شبہ کی بنا پر پھر بھی قطع ید نہیں ہوگا لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قطع ید واجب ہوگا۔ اگر شوہر کے مال کی چوری کی اس حال میں کہ وہ عدت میں ہو تو قطع ید واجب نہیں ہوگا۔ اگر مہمان نے اپنے میزبان کی چوری کی تو قطع ید نہیں ہوگا، اس لئے کہ گھر اس کے حق میں حرز نہیں رہا، کیونکہ اسے گھر میں آنے کی اجازت دی گئی ہے، پس اس کا یہ فعل خیانت شمار ہوگا، چوری نہیں۔ اگر قوم کا خادم ان کے سامان کو چرائے یا اجیر ایسی جگہ سے چوری کرے جہاں جانے کی اجازت ہو تو قطع ید نہیں ہوگا۔

اگر کسی شخص نے گھر یا دکان میں نقب لگائی اور اپنا ہاتھ اس میں ڈال کر کوئی چیز چرالی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد کے نزدیک قطع ید نہیں ہوگا اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قطع ید ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے محفوظ جگہ سے مال اخذ کیا ہے۔ اگر چوری کا اقرار کیا لیکن اسے نہیں معلوم کہ مال مسروقہ کس کا ہے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ غیر متعین چیز کے اقرار سے کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا، پس وہ سرقہ (چوری) اپنی ملک کے حکم پر رہے گا، اگر کسی آدمی کے خلاف ایک مدت کے بعد چوری کی گواہی دی گئی تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور وہ مال کا ضامن ہوگا۔

قطع ید کی کیفیت

چور کا دایاں ہاتھ کلائی کے جوڑ سے کاٹا جائے گا اور پھر داغا جائے گا۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مونڈھے تک ہاتھ کاٹا جائے۔ کیونکہ 'فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا'' [المائدہ: ۳۸] میں ''ید'' کا لفظ سارے ہاتھ کو کندھے تک شامل ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چور کا دایاں ہاتھ کلائی سے کاٹنے کا حکم دیا ہے، نیز ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں بھی دائیں ہاتھ کا ذکر ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چور کا ہاتھ جوڑ (کلائی) سے کاٹا۔[1] اور ہاتھ کو داغنے کی دلیل یہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''فاقطعوہ ثم احسموہ'' یعنی اس کا ہاتھ کاٹو، پھر اس کو داغو''۔ نیز اس لئے کہ داغنے سے خون بند ہو جائے گا، اگر نہ

[1] [سنن البیہقی: ۲۷۱/۸]

داغا گیا تو یہ ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے اور حد زاجر ہے متلف نہیں ہے۔ یعنی سزا کا مقصد مجرم کو تنبیہ کرنا ہے اس کو ہلاک کرنا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شدید گرمی یا شدید سردی میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک چور کو لایا گیا جس نے ایک چادر چرائی تھی۔ کسی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس نے چوری کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرا نہیں خیال کہ اس نے چوری کی ہو، چور کہنے لگا کہ ہاں! (میں نے چوری کی ہے) اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: 'اذھبوا به فاقطعوه، ثم احسموه ثم ائتونی به'' ''یعنی اسے لے جاؤ اور اس کا ہاتھ کاٹ دو، پھر داغنے کے بعد اس کو میرے پاس لے آؤ'' چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ پھر حاضر کیا گیا تو آپ نے اس سے فرمایا: اللہ سے توبہ کرو، اس نے کہا کہ میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تاب اللہ علیک'' ''اللہ تعالیٰ تیری توبہ قبول فرمائے۔''[1]

داغنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے بعد ابلتے ہوئے تیل میں ڈال دیا جائے تاکہ خون بند ہو جائے۔ تیل کی قیمت چور کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ ہی اس کا سبب بنا ہے۔ اگر چور کا دایاں ہاتھ نہ ہو یا مقطوع (کٹا ہوا) ہو تو بایاں پاؤں جوڑ سے کاٹا جائیگا اور اگر بایاں پاؤں بھی کٹا ہوا ہو تو پھر قطع ید کا حکم نہیں ہوگا۔

اگر چور نے دوسری بار چوری کی تو اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، اگر پھر تیسری مرتبہ چوری کا ارتکاب کیا تو پھر قطع ید کا حکم نہیں ہوگا بلکہ قید خانہ میں ڈال دیا جائیگا۔ تاوقتیکہ وہ توبہ کرلے۔ معلوم ہوا کہ پہلی مرتبہ چوری کا ارتکاب کرنے پر اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائیگا اور دوسری بار بایاں پاؤں اور تیسری بار ارتکاب سرقہ پر توبہ تائب ہونے تک جیل میں بند رکھا جائے گا۔ کیونکہ حدود کی مشروعیت ارتکاب جرم سے مجرم کو روکنے کے لئے ہوئی ہے اس کی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کے لئے نہیں ہوئی۔ جب کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دینے کے بعد بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں بھی کاٹنا انسانی جان کو ہر اعتبار سے تلف کرنا ہے۔

حضرت علی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''جب چور چوری کا ارتکاب کرے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے، اگر دوبارہ ارتکاب کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے، اگر سہ بارہ کرے تو میں اس کو حوالہ جیل کروں گا، تاوقتیکہ اس کی طرف سے کوئی خیر کی بات ظاہر ہو، مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ میں چور کو (تیسری بار چوری کرنے پر) اس حال میں چھوڑوں کہ اس کا کوئی ہاتھ ہی

[1] [المستدرک: ۳۸۱/۴]

نہ رہے جس سے وہ کھانا کھا سکے یا استنجاء کرے اور کوئی پاؤں نہ ہو جس کے ساتھ وہ چل سکے۔"[1]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر چور چوری پر چوری کرتا رہے تو اس کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جاتے رہیں، جب اس کا کوئی ہاتھ یا پاؤں نہ رہے تو ارتکاب جرم پر اس کو قتل کر دیا جائے۔

چور کے چاروں ہاتھ پاؤں کاٹنے پر مروی حدیث کے راوی کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مطعون قرار دیا ہے۔ جب چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور مسروقہ مال اس کے پاس ہو تو مال کو لوٹا دے اور اگر ختم ہو چکا ہو تو اس کا ضامن نہیں ہوگا، اس کی دلیل حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ چور پر حد جاری کئے جانے کے بعد وہ مال کا ضامن نہیں ہوگا۔

جو حضرات عدم تضمین کے قائل ہیں ان کے قول کی امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے تصحیح کی ہے اور ضامن قرار دینے والوں کے قول کو فاسد قرار دیا ہے، نیز انہوں نے عدم تضمین کا قول ابن سیرینؒ، شعبیؒ، نخعیؒ، عطاءؒ، حسنؒ اور قتادہؒ سے نقل کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ان حضرات کی دلیل واردشدہ آثار کے علاوہ ائمہ امت کے اس اجماعی مسئلہ پر قیاس ہے کہ اہل عدل وانصاف جب خوارج یا رہزنوں پر غلبہ پاتے ہیں تو ان کو اس چیز کا ضامن نہیں قرار دیتے جو انہوں نے ہلاک کی ہوتی ہے۔

اگر ظلم وتعدی کے سبب چور تضمین میں غاصب کی مانند ہو تو اس پر ضمان (تاوان) واجب ہوگا، یہی درست ہے، اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

"فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا" [المائدۃ:۳۸]

"پس ان دونوں کا ہاتھ (اس جرم کی پاداش میں) کاٹ دو یہ ان کے کئے کی سزا ہے"

اگر قطع ید کے ساتھ تاوان بھی لازم ہوتا تو اس کا حکم بھی دیا جاتا۔[2]

مصنف ابن ابی شیبہ میں امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ "اگر مسروقہ مال بعینہ چور کے پاس موجود ہو تو اس سے لیا جائے گا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائیگا اور اگر اس نے ہلاک کر دیا ہو تو ہاتھ کاٹا جائیگا اور اس پر ضمان (تاوان) نہیں ہوگا۔" ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ایک شخص چوری کا ارتکاب کرتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے تو ضامن ہونے کے لئے قطع ید کافی ہے۔

---

[1] [سنن الدارقطنی: ۱۰۳/۳]   [2] [حاشیۃ سنن البیہقی: ۲۷۷/۸]

مسروقہ مال پر چور کا دعوائے ملکیت اور اس کا حکم

اگر چور یہ دعویٰ کر دے کہ مسروقہ مال کا وہ مالک ہے تو قطع ید کا حکم اس سے ساقط ہو جائے گا، گو وہ اس پر بینہ قائم نہ کر پائے، کیونکہ اس میں شبہ موجود ہے اور شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے اور یہ شبہ مجردِ دعویٰ سے متحقق ہو جاتا ہے کہ اس میں صدق کا احتمال ہے، نیز اقرار کے بعد رجوع کر لینا درست ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص چوری کا اقرار کرے، پھر اپنے اقرار سے رجوع کر لے اور چوری سے انکار کر دے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا اور وہ مال کا ضامن ہوگا، کیونکہ حدود میں رجوع معتبر ہوتا ہے، جس مال میں بندے کا حق متعلق ہو اس میں رجوع معتبر نہیں ہے۔ اگر کسی آدمی کے خلاف چوری کا دعویٰ دائر کیا گیا، اس نے انکار کیا تو اس سے حلف لیا جائے گا، اگر حلف اٹھانے سے انکار کرے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا اور مالک ضامن ہوگا۔

قطع ید کب واجب ہوگا؟

قصاص اور حد قذف کی طرح یہاں بھی چور جب ایک بار چوری کا اقرار اور اعتراف کرلے یا دو گواہ گواہی دیدیں تو قطع ید واجب ہوگا۔ قاضی ان گواہوں سے چوری کی ماہیت (حقیقت)، اس کی کیفیت اور مزید احتیاط کے لئے اس کا وقت اور اس کی جگہ کے متعلق پوچھے گا۔ اور گواہوں سے چوری کے الزام کی تحقیق وتفتیش مکمل کرنے تک چور کو جیل میں بند رکھے گا۔ چور کا ہاتھ مسروق منہ (مالک) کی موجودگی میں کاٹا جائیگا، وہ اس کا مطالبہ کرے تو حکم نافذ کیا جائیگا۔ کیونکہ اس میں خصومت (جھگڑا) شرط ہے۔ جب ایک شخص کی بابت چوری کے کیس میں قطع ید کا فیصلہ دے دیا گیا پھر مسروقہ مال اس کو ہبہ کر دیا گیا یا اس نے مالک سے خرید لیا تو قطع ید نہیں ہوگا۔ کیونکہ قطع ید کے لئے یہ شرط ہے کہ نفاذِ حکم کے وقت خصومت مالک اور سارق کے مابین قائم (موجود) ہو۔ جب کہ مذکورہ صورت میں خصومت استیفاء کے وقت زائل ہو چکی ہے، پس یہ ایسا ہوگا جیسے وہ فیصلہ دیئے جانے سے قبل ہی مال مسروقہ کا مالک ہو گیا، اگر کوئی چور ایک بار چوری کرے، پھر اس پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہو اور اس نے مال مسروقہ بھی مالک کو واپس کر دیا ہو پھر اسی مال کو دوبارہ چرائے اور مال مسروقہ اپنی پہلی حالت میں باقی تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی تو دوسری بار اس کا ہاتھ اس چوری کی وجہ سے نہیں کاٹا جائے گا، کیونکہ یہ مسروقہ مال اس کے حق میں غیر متقوم (غیر قیمتی) ہو گیا ہے، پس اگر اس کو ہلاک کر دے تو اس کا ضامن نہیں ہوگا،

لیکن اگر (دوبارہ چوری کرنے کے وقت) مسروقہ مال اپنی پہلی والی حالت میں باقی نہیں رہا تھا، اس میں تغیر اور تبدل ہو چکا ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ جیسے اگر اس نے پہلی بار سونے کی ڈلی چرائی ہو پھر اس پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، پھر وہ ڈلی اس نے مالک کو واپس کر دی، مالک نے اس ڈلی کی چوڑیاں اور ہار وغیرہ بنا لئے، پھر اس چور نے اس زیور کو دوسری بار چرا لیا تو ہاتھ کاٹا جائیگا (یعنی بایاں پاؤں) اور وہ زیور بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مالک کو واپس دینا ضروری ہوگا اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ مسروق منہ (ملک) کے لئے اس پر کوئی سبیل نہیں ہے۔

(۵) حد حرابہ (رہزنی کی حد)

جب روکنے والوں کا ایک گروہ یا فرد واحد جو روکنے پر قدرت رکھتا ہو مسلح ہو کر ڈاکہ ڈالنے کے لئے نکلے اور مسلمانوں یا ذمیوں کے راستے میں بیٹھ جائے، اور وہ راستہ ان کی بستیوں اور شہروں سے سفر کی مسافت کے بقدر دور ہو۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگرچہ مسافت سفر سے کم بھی ہو یا شہر میں ہی رات کے وقت رہزنی کرے تو اس پر قطاع الطریق (ڈاکو، رہزن) کے احکام جاری ہونگے۔ ایسے لوگ قاطع الطریق یا قطاع الطریق کہلاتے ہیں۔ اگر وہ لوگ قبل ازیں کہ کسی کا مال اخذ کریں یا قتل کریں، خود گرفتار کر لئے جائیں تو امام المسلمین انہیں (رہزنوں کو) قید کر دے، یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں، اگر انہوں (ڈاکوؤں) نے کسی مسلمان یا ذمی کا مال اخذ کیا اور وہ پکڑ لئے گئے تو مال کو اگر ان (رہزنوں) کے گروہ پر تقسیم کیا جائے تو ان ڈاکوؤں میں سے ہر ایک کو دس دراہم یا اس سے زائد ملتا ہو یا اس کی قیمت کی مقدار اتنی (دس دراہم، انتیس گرام چاندی) ہو تو حاکم وقت ان رہزنوں کے دائیں ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے قطع کر دے اور اگر انہوں نے صرف قتل کیا ہو اور مال اخذ نہ کیا ہو تو حاکم انہیں (رہزنوں کو) بطور حد قتل کر دے، انہیں معاف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے، بندوں کا حق نہیں ہے۔ اس باب میں ''اصل'' اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ'' [المائدہ:۳۳]

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان

کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں زمین سے دور کر دیا جائے۔"

اللہ اور رسول ﷺ سے لڑائی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دوستوں سے لڑتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محاربہ (لڑائی) محال ہے۔ اس آیت میں چار حالتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی حالت یہ ہے کہ اگر وہ رہزن صرف راستہ کو خوفناک بنائیں، نہ کسی کو قتل کریں اور نہ ہی کسی کا مال اخذ کریں تو اس صورت میں انہیں قید کیا جائے گا یہاں تک کہ توبہ تائب ہو جائیں، آیت ہذا میں نفی ہ ، الارض" سے یہی (حبس) مراد ہے اور صرف زبانی کلامی توبہ کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ ان پر نیک ہونے کے آثار نمایاں ہونے لگیں یا ان پر موت واقع ہو جائے۔ عورتیں اس حکم میں مردوں کی طرح ہیں۔

دوسری حالت یہ ہے کہ اگر وہ (ڈاکو) کسی مسلمان یا ذمی کا مال اخذ کریں اور لیا ہوا مال اس گروہ پر برابر برابر تقسیم ہو جائے اور ہر ایک کو اتنا مال حاصل ہو جس کی قیمت انتیس گرام چاندی کی قیمت یا اس سے زیادہ کو پہنچتی ہو، تو حاکم ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دے، ہاتھ اور پاؤں دونوں کا کاٹنا اس لئے واجب اور ضروری ہے کہ ان ڈاکوؤں نے دو جرم کئے، ایک راستہ کو خوفناک بنایا اور دوسرا راہ گیروں کا مال اخذ کیا، اس لئے اس کی سزا بھی ہاتھ کے ساتھ پاؤں کاٹنے کی صورت میں زیادہ سخت دی گئی۔ اور مخالف سمت سے اس لئے کاٹیں گے کہ اگر ایک ہی جانب سے کاٹ جائیں تو اس سے جنس منفعت جاتی رہے گی، اور مخالف سمت سے مراد دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں ہے اور یہ اس وقت ہے جب وہ صحیح الاعضاء ہو۔ (جیسا گزر چکا۔)

راہ زنی کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ (ڈاکہ زنی) ایسی جگہ پر ہو کہ وہاں کوئی مددگار نہ ہو اور نہ کوئی فریاد رس موجود ہو جو فریاد کرنے کے وقت اس مقطوع الطریق کی فریاد رسی کر سکتا ہو، لیکن اگر رہزنی ایسی جگہ پر واقع ہو جہاں پر مددگار موجود ہو تو ہاتھ وغیرہ تو نہیں کاٹے جائیں البتہ انہیں گرفتار کر کے قید میں ڈالا جائے گا۔ کیونکہ وہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور مال اس کے مالک کے سپرد کر دیا جائیگا۔ اور اگر انہوں نے کسی کو قتل کیا ہو تو اس معاملے کو مقتول کے اولیاء کے سپرد کریں گے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ اگر وہ (راہ زن) قتل کریں، خواہ قتل تلوار سے کریں، یا لاٹھی سے کریں یا پتھر سے کریں اور مال اخذ نہ کریں تو حاکم انہیں بطور حد کے قتل کر دے، نہ کہ قصاص میں۔ انہیں حد کے طور پر اس لئے قتل کریں گے کہ انہوں نے قتل کے ساتھ راستہ کو بھی پر خطر بنانے کا جرم

کیا ہے، لہٰذا ان کے خلاف قتل کا حکم نافذ العمل ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر مقتول کے ورثاء معاف بھی کرنا چاہیں تو ان کی معافی ناقابل التفات ہوگی، کیونکہ حدود خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے جنہیں درگزر کرنا جائز نہیں ہے۔

چوتھی حالت یہ ہے کہ اگر وہ مال بھی اخذ کریں اور قتل بھی کریں تو حاکم وقت کو اختیار ہے، چاہے تو ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹے اور سولی دے کر قتل کرے اور چاہے تو صرف ان کو قتل کرے اور چاہے تو صرف ان کو سولی پر لٹکا دے۔ ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹنے کی سزا اس لئے دی جائیگی کہ انہوں نے مال اخذ کیا اور قتل اور صلب (سولی دینا) کی سزا ان کے قتل کرنے کی وجہ سے دی جائیگی اور صرف قتل یا صرف صلب (سولی دینا) کی سزا اس وجہ سے دی جائیگی کہ انہوں نے بھی قتل کا ارتکاب کیا ہے۔ اور صرف قتل یا صرف سولی پر لٹکانے سے بھی زجر مقصود حاصل ہو جاتا ہے، یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پھانسی کی سزا میں معاف نہیں کروں گا، کیونکہ اس کا ذکر نص قرآنی میں آیا ہے، لہٰذا اس کا اسقاط جائز نہیں ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں بلکہ قتل اور صلب کی سزا دی جائیگی۔ مفتیٰ بہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

سولی پر لٹکانے اور پھانسی دینے کا طریقہ یہ ہے کہ زمین میں ایک لکڑی گاڑی جائے، پھر اس پر چوڑائی میں دوسری لکڑی باندھی جائے جس پر اس مجرم کے پاؤں رکھے جائیں اور اس کے اوپر ایک اور لکڑی باندھی جائے جس کے ساتھ اس کے ہاتھ باندھے جائیں، پھر اس کے بائیں پستان کے نیچے نیزہ مارا جائے اور اس کا پیٹ نیزے سے پھاڑے، یہاں تک کہ اس پر موت واقع ہو جائے۔ (ھو الصحیح)

بہر حال اسے زندہ حالت میں پھانسی دے کر پھر قتل کیا جائے، کیونکہ یہ طریقہ مرنے کے بعد سولی پر لٹکانے سے زیادہ مؤثر ہے اور اس سے زجر و تنبیہ کا مقصد بھی خوب حاصل ہوتا ہے۔

اور اسے تین دن سے زیادہ پھانسی پر نہ لٹکایا جائے، کیونکہ تین دن کے بعد بدبو پھیلنے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی، جب تین دن تک پھانسی پر لٹکایا جائے تو اس کے بعد اس کی لاش کو ورثاء کے حوالہ کر دیا جائے تاکہ وہ اس کو دفن کر سکیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو اسی لکڑی پر چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خود ہی گر جائے۔ اس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہوگی۔ لیکن قول اول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ پھانسی دینے سے عبرت حاصل ہو چکی ہے۔

اگر رہزنوں کے گروہ میں سے صرف ایک شخص نے قتل کا ارتکاب کیا ہو، سب نے نہ کیا

ہو پھر بھی حد سب پر جاری ہوگی، کیونکہ محاربہ (رہزنی کا معاملہ) تمام لوگوں (گروہ) سے محقق ہوتا ہے، لہٰذا حکم بھی سب پر برابر جاری ہوگا، اس لئے کہ اس نے قتل میں براہ راست حصہ لیا اور دوسرے اس کام میں اس کے مددگار ہیں۔

حد کا سقوط

اگر رہزنوں کے اس گروہ میں کوئی نابالغ بچہ ہو یا دیوانہ ہو یا مقطوع علیہ کا ذی رحم محرم (رشتہ دار) ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک باقیوں سے حد ساقط ہو جائیگی، کیونکہ رہزنی ایک ہی جرم ہے جو سب پر لاگو ہوتا ہے، پس جب نابالغ بچے یا دیوانے کا فعل قطع کا موجب نہ ہوا تو باقی افراد کا فعل اس جرم کا بعض حصہ ہوا اور بعض جرم پر حکم ثابت نہیں ہوتا، جس طرح ایک قتل میں مخطی (خطا سے قتل کرنے والا) اور عامد (قصداً کرنے والا) شریک ہوں تو حکم قتل ثابت نہیں ہوتا۔ اور رہی یہ بات کہ اگر اس گروہ میں مقطوع علیہ (جس پر رہزنی کی جائے) کا ذی رحم محرم (رشتہ دار) موجود ہو تو باقیوں سے حد اس لئے ساقط ہوگی کہ ذی رحم محرم کے مال میں اس کے حق کا شبہ موجود ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ سرقہ میں اس پر قطع ید کا حکم اسی بناء پر نافذ نہیں ہوتا، جب ان سے حد ساقط ہوگی تو قتل کا یہ معاملہ مقتول کے ورثاء کے سپرد ہوگا۔ اگر وہ چاہیں تو تیز دھار آلے سے قتل کرنے والے کو قتل کروالیں، جب کہ وہ دیوانہ نہ ہو، اگر وہ لاٹھی یا پتھر سے قتل کیا گیا ہو تو اس کی عاقلہ پر اس کی دیت ہوگی جو مقتول کے ورثاء کو دی جائیگی۔ اور اگر بچے یا پاگل نے قتل کی ذمہ داری لی تو بھی ان کی عاقلہ پر دیت ہوگی اور اگر ان دونوں نے مال چھینا ہو تو وہ ضامن ہونگے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر بچے یا پاگل نے اخذ مال کا ارتکاب کیا ہو تو ان سب پر حد جاری نہ ہوگی۔ اور اگر عاقل بالغ اس جرم کا ارتکاب کریں تو پھر سب پر حد جاری ہوگی لیکن بچے اور دیوانے پر حد جاری نہ ہوگی۔ پس جب بچہ یا دیوانہ ارتکاب جرم کریں تو وہ متبوع ہونگے اور باقی تابع ہونگے۔ جب متبوع سے حد ساقط ہوگی تو تابع سے بطریق اولیٰ ساقط ہوگی۔

گرفتاری سے قبل رہزن نے توبہ کرلی تو کیا حکم ہے؟

جس شخص نے رہزنی کی اور مال چھینا، پھر حاکم نے اس کو تلاش کرنے کا حکم دیا، ابھی وہ گرفتار نہیں ہوا تھا کہ توبہ تائب ہو کر پیش ہوگیا تو اس سے حد ساقط ہو جائیگی کیوں کہ حکم خداوندی ہے:

"اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رَّحِيمٌ " [المائدہ:۳۴]

"مگر جو لوگ قبل ازاں کہ تم ان پر قدرت حاصل کرو (پکڑو) توبہ کرلیں، پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور رحیم ہے"۔

جب گرفتاری سے پہلے توبہ کرنے سے حد ساقط ہوگئی تو اب معاملہ مقتول کے ورثاء کے حوالہ ہوگا۔ اگر اس کو رہزن نے قتل کیا ہو تو قصاص میں اس کو قتل کروائیں اور اگر زخمی کیا ہو تو اس سے بدلہ لے لیں، اور اگر چھینا ہوا مال موجود ہو تو قابل واپسی ہوگا اور اگر ختم ہو چکا ہو تو اس کا تاوان اس کے ذمہ ہوگا۔ اس لئے کہ توبہ کرنے سے بندوں کا حق ساقط نہیں ہوتا اور جب راہ زنی کی حد ساقط ہوگئی حالاں کہ اس نے قتل کیا ہے تو وجوب قصاص کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آلۂ قتل کا اعتبار اپنی اصل کے مطابق ہوگا۔

﴿کتاب الجهاد﴾

عربی زبان میں جہاد کے لئے ''سیر'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''سیر'' سیرۃ کی جمع ہے جس کا معنی ہوتا ہے طریقہ، خواہ اچھا ہو یا برا، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ **"فلان محمود السیرۃ"** یعنی فلاں شخص نیک سیرت ہے اور **"فلان مذموم السیرۃ"** یعنی فلاں بدسیرت و بدکردار ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں جہاد، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مغازی (غزوات) کی پیروی کرنے کو کہتے ہیں۔'' اور اصطلاح فقہ میں ''سِیَر'' کا اطلاق جہاد فی سبیل اللہ، دین حق کی طرف دعوت دینے اور قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ قتال کرنے، قتال فی سبیل اللہ میں براہ راست حصہ لیتے ہوئے اپنی مقدور بھر کوشش صرف کرنے یا اپنے مال یا اپنی رائے یا تکثیر جماعت کے ذریعے اس میں معاونت کرنے پر ہوتا ہے۔ یا اس کے علاوہ دیگر طریقوں سے جہاد فی سبیل اللہ میں تعاون کرنا جیسے زخمیوں کا علاج و معالجہ کرنا اور کھانے پینے کا انتظام و انصرام کرنا۔ رباط بھی جہاد کے حکم میں شامل ہے۔ رباط کہتے ہیں ایسی جگہ پر پہرہ داری کرنا جس سے آگے اسلامی حکومت نہ ہو۔ جہاد کی فضیلت کی بابت بہت زیادہ احادیث موجود ہیں۔

(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ **"الصلوٰۃ لوقتها، و برالوالدین، ثم الجهاد فی سبیل الله"**[۱] یعنی وقت پر نماز پڑھنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا افضل اعمال ہیں۔''

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں ایک صبح یا شام لگالینا دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔''[۲]

(۳) حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی مجاہد فی سبیل اللہ کو سامان جہاد فراہم کیا اس نے (بھی) جہاد کیا اور جو شخص کسی مجاہد فی سبیل اللہ کی خیر خواہانہ طریقہ سے گھر بار کی نگرانی کرتا رہا اس نے (بھی) جہاد کیا۔''[۳]

جہاد سے بھی زیادہ شاق اور دشوار کام اپنے نفس کو دوام و استمرار کے طور پر رغبت و نشاط

---

[۱] [صحیح البخاری: ۱۵۸۳] [۲] [صحیح البخاری: ۵۶۷] [۳] [صحیح البخاری: ۵۷۸]

کیساتھ طاعات پر لگائے رکھنا اور بے جا خواہشات سے اس کو دور رکھنا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرام ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے ہو'' یعنی بندے کا اپنی خواہشات کے خلاف جہاد کرنا[1]۔

جہاد اسلام کا ایک اہم رکن ہے اور ایسا محکم فریضہ ہے کہ اس کے منکر کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ کتاب اللہ سے اس کی فرضیت اس آیت مبارکہ سے ثابت اور معلوم ہو رہی ہے۔ ''قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ'' [التوبہ:۲۹] ''جو لوگ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے ساتھ قتال کرو۔''

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ'' [بقرہ:۲۱۶]

''تم پر قتال (جہاد) فرض کر دیا گیا ہے، جب کہ وہ تمہیں ناگوار ہے۔''

یعنی جہاد کی فرضیت تم پر شاق اور گراں بار ہے۔ نیز ارشاد فرمایا:

''فاقتلوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ'' [التوبہ:۵]

''مشرکین سے قتال کرو۔ جہاں ان کو پاؤ۔''

نیز فرمایا:

وقاتلوھم حتی لاتکون فتنه ...... [البقرہ:۱۹۳]

''یعنی ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہو جب تک کہ شرک کا قلع قمع نہ ہو جائے اور دین سارا کا سارا اللہ کا نہ ہو جائے۔'' (یعنی دین غالب ہو جائے)۔

احادیث مبارکہ سے بھی جہاد کا حکم ثابت ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں جب تک کہ وہ یہ نہ کہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پس جس نے لا اله الا الله کہہ دیا اس نے اپنا مال اور اپنی جان مجھ سے محفوظ کر لی، البتہ اسلام کا حق باقی رہے گا اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔''[2]

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تین چیزیں ایمان کی اصل (بنیاد) ہیں۔ لا الہ الا اللہ کہنے والے سے تعرض نہ کرنا، اس کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار نہ دو، اور کسی عمل کی وجہ سے اسلام سے خارج نہ کرو۔ اور جہاد اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا اور

---

[1] [جامع الاحادیث:۴/۲۴۱] [2] [صحیح البخاری:۱۵۲۶]

اس وقت تک جاری رہے گا جب تک میری امت کا آخری شخص دجال سے قتال کرے گا، کسی ظالم کا ظلم یا عادل کا عدل اس کو باطل نہیں کرے گا۔ اور تقدیر پر ایمان لانا"[1] اجماع امت بھی اس کی فرضیت کی دلیل ہے، چنانچہ رسول کریم ﷺ جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تھے تو اس کے امیر کو وصیت فرماتے کہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور فرماتے تھے کہ "اللہ کے نام اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور جو اللہ کا انکار کرے اس سے قتال کرو، جہاد میں خیانت کا ارتکاب نہ کرو اور دھوکہ نہ دو اور مثلہ نہ بناؤ اور بچے کو قتل نہ کرو۔ جب مشرکین میں سے اپنے دشمن کا سامنا ہو تو ان کو تین چیزوں کی طرف بلاؤ، ان میں سے جو چیز قبول کریں تم بھی اس کو قبول کرلو اور ان سے تعارض نہ کرو، ان کو اسلام کی طرف دعوت دو، اگر وہ یہ دعوت قبول کرلیں تو تم بھی ان کی طرف سے قبول کرلو اور پھر ان سے تعرض نہ کرو۔ پھر ان کو اپنے علاقہ سے منتقل ہو کر مہاجرین کے علاقے میں آنے کی دعوت دو اور ان کو بتاؤ کہ اگر وہ یہ کام کرلیں تو ان کے لئے وہی انصاف ہوگا جو مہاجرین کے لئے ہوتا ہے اور ان پر وہی بار ہوگا جو مہاجرین کے لئے ہوگا۔ اگر وہ اپنے علاقے سے منتقل ہونے سے انکار کریں تو ان کو بتاؤ کہ وہ مسلمان دیہاتیوں کی طرح ہونگے۔ ان پر وہ ہی احکام لاگو ہونگے جو ان مسلمانوں پر لاگو ہوتے ہیں۔ اور مال فی اور غنیمت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، مگر یہ کہ وہ مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ جہاد کریں، اگر وہ انکار کریں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو، اگر وہ قبول کریں تو تم بھی ان سے قبول کرو اور تعرض سے باز رہو، اگر وہ جزیہ دینے سے بھی انکار کریں تو اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے ان کیساتھ قتال کرو اور جب تم قلعہ والوں کا محاصرہ کرو اور وہ (دشمن) یہ چاہین کہ تم ان کو اللہ اور اس کے نبی کی امان اور پناہ میں دیدو تو ایسا نہ کرو بلکہ تم (ان کو اپنی اور اپنے ساتھیوں کی) امان اور پناہ دو، کیونکہ تمہارا اپنی امان توڑنا اس سے زیادہ اھون (آسان اور ہلکی) ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی پناہ اور امان کو پائے مال کرو، اور جب اہل قلعہ کے محاصرہ کے وقت وہ (دشمن) تم سے یہ چاہیں کہ تم ان کو اللہ کے حکم پر (قلعہ سے) اتارو تو تم ان کو اللہ کے حکم پر نہ اتارو بلکہ اپنے حکم پر اتارو، کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کہ تم اللہ کے حکم کو پورا کرسکو، یا نہ کرسکو۔"[2]

جہاد کا حکم

نفیر عام کی صورت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور نفیر عام نہ ہو تو فرض کفایہ ہے۔
پہلی بات کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

"اِنفِرُوْا خِفَافاً وَ ثِقَالاً" [التوبہ:۴۱]

"ہلکے اور بوجھل ہو کر نکلو۔"

---

[1] [سنن ابی داؤد: ۷۸/۳]   [2] [صحیح مسلم: ۱۳۵۸]

نفیر عام کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے نکلنے کی ضرورت پیش آجائے، کیونکہ تمام کے تمام لوگوں کے نکلنے سے ہی اصل مقصود ''غلبہ دین اور قہر مشرکین'' حاصل ہوگا، اس لئے ان پر جہاد نماز وغیرہ کی طرح فرض عین ہوگا جب دشمن (مسلمانوں کے) شہر پر حملہ کردے۔ اور جہاد کا حکم نافذ ہوجائے تو تمام لوگوں پر اس کا دفاع واجب ہوگا، عورت بھی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نکلے گی جبکہ وہ قتال کے طریقہ کو جانتی ہو اور بالغ، جس کے والدین موجود ہوں، ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد پر نکلے گا۔ کیونکہ جہاد نماز و روزہ کی طرح فرض عین ہو چکا ہے۔ اگر صورت حال ایسی نہ ہو تو جہاد فرض کفایہ ہوگا۔ یعنی بعض لوگ جہاد کے فریضہ کو قائم کریں تو باقی لوگوں سے اس کی فرضیت ساقط ہوجائے گی، اس لئے کہ جہاد سے مقصود کفر کا شر دور کرنا، ان کی قوت وشوکت کو توڑنا اور اسلام کا بول بالا کرنا ہے۔ پس جب بعض لوگوں کے قائم کرنے سے مقصود حاصل ہوتا ہے تو دوسروں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر ان کے ذریعہ کفایت نہ ہو تو الاقرب فالاقرب کے مطابق فرض ہوگا، تا آنکہ کفایت حاصل ہوجائے۔

حضور نبی کریم ﷺ جہاد کے لئے جایا کرتے تھے جبکہ مدینہ کے تمام کے تمام لوگ نہیں جاتے تھے، نیز اس لئے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے لہٰذا بطور کفایت کے فرض ہوگا۔ نیز اس لئے کہ اگر تمام کے تمام لوگوں پر فرض قرار دے دیا جائے تو مسلمانوں کے تمام مصالح (معاملات) اور نظام زندگی تعطل کا شکار ہوجائے۔ البتہ اگر جہاد کے لئے کوئی بھی کھڑا نہ ہو تو دیگر فرائض کفایہ کی طرح اس کے ترک کرنے کے سبب تمام لوگ گنہگار ہوں گے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ تمام دنیا کے لوگوں پر جہاد علی الکفایہ واجب ہے۔ بلکہ حاکم وقت پر لازم ہے کہ وہ تمام اسلامی سرحدات کو غازیوں کی ایک جماعت سے خالی نہ رہنے دے۔ ان غازیوں کے پاس دشمن سے لڑنے کا ضروری سامان بقدر کفایت موجود ہو۔ جب لوگ اس کو قائم کریں تو باقیوں سے اس کا وجوب ساقط ہوجائیگا اور اگر سرحدات پر مامور مجاہدین کفار کے مقابلہ سے عاجز ہوں اور ان پر دشمن کے حملہ کا خوف ہو تو قریب کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنی جان، مال اور اسلحہ کے ذریعے ان کی مدد کریں۔ جیسا کہ ہم ذکر چکے ہیں کہ جہاد تمام اہل جہاد پر فرض ہے، البتہ بعض لوگوں کے اہتمام کرنے سے حصول کفایت کی بنا پر باقیوں سے ساقط ہوگا، بصورت دیگر ساقط نہیں ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ جب نفیر عام ہو تو جہاد ہر اس شخص پر فرض عین ہو جاتا ہے جو دشمن کے قریب ہو اور جو لوگ دشمن سے دور ہوں تو ان پر جہاد فرض کفایہ ہوگا اور عدم احتیاج کی صورت میں

ان کے لئے جہاد نہ کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر ان کی احتیاج پیش آجائے بایں صورت کہ جو لوگ دشمن کے قریب ہیں وہ دشمن سے مقابلہ کرنے سے عاجز اور قاصر آگئے ہیں یا عاجز تو نہیں آئے لیکن کسل مندی کی بنا پر جہاد نہیں کررہے تو ان کے آس پاس کے مسلمانوں پر نماز وروزے کی طرح جہاد فرض عین ہوگا۔ ان کے لئے ترکِ جہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ فرضیت درجہ بدرجہ شرقاً غرباً تمام اہل اسلام پر ہوگی۔ جیسے میت کی نماز جنازہ ادا کرنا کہ جو شخص شہر کے کسی گوشہ میں فوت ہو جائے تو اس کے پڑوسیوں اور اہل محلّہ کی ذمہ داری ہے کہ اس کا اہتمام وانتظام کریں جو لوگ اس میت سے دور رہتے ہیں ان کی یہ ذمہ داری نہیں ہے لیکن اگر دور رہنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اہل میت اس کے حقوق کو ضائع کریں گے یا اس کے حقوق کی ادائیگی سے عاجز ہیں تو پھر ان کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اس میت کے حقوق ادا کریں، اسی طرح یہاں پر بھی ہے۔

جو لوگ جہاد کے مکلّف نہیں ہیں

بچے پر جہاد فرض نہیں ہے، کیونکہ وہ مکلّف نہیں ہے اور اگر ایک لڑکا قریب البلوغ ہو اور وہ قتال کی طاقت رکھتا ہو تو باپ اس کو جہاد پر جانے کی اجازت دے سکتا ہے۔ جہاد ایسے بالغ لڑکے پر فرض نہیں ہوگا جس کے والدین یا والدین کے والدین اس کے جانے کو پسند نہ کرتے ہوں، اگر ان کی جان کے ضیاع کا خوف ہو تو ان کی اجازت کے بغیر نہ جائے کیونکہ والدین کی اطاعت فرض عین ہے اور جہاد پر جانا فرض کفایہ ہے، فرض عین کی رعایت کو ملحوظ رکھنا اس پر مقدم ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد پر جانے کی اجازت لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے کہا کہ ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ففيهما فجاهد. یعنی پھر ان کی اطاعت کرو اور یہی تمہارا جہاد ہے۔[1]

حضرت عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ نے جب جہاد پر جانے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اپنی والدہ کی اطاعت کو لازم جانو کہ اس کے پاؤں تلے جنت ہے۔''[2]

عورت پر بھی جہاد واجب نہیں ہے، کیونکہ عورت ضعف کی بنا پر اہل قتال میں سے نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر خاوند اس کو اجازت دے تو جہاد پر جا سکتی ہے۔ اور عورت کے حق میں جہاد فرض کفایہ اس وقت ہوگا جب اس کے ساتھ کوئی محرم رشتہ دار بھی جہاد پر جائے، کیونکہ جب حج میں (جو کہ فرض عین ہے) اس میں عورت کے ساتھ محرم کا ہونا شرط ہے تو اس میں بھی شرط ہوگا۔

اسی طرح نابینے آدمی، اپاہج اور جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں، ان پر بھی بوجہ عجز

[1] [صحیح البخاری: ۲/۱۲۷] [2] [جامع الاحادیث: ۲/۶۱]

کے جہاد واجب نہیں ہے۔ نیز ارشاد خداوندی ہے:

"لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ" [النور:٦١]

"اندھے پر بھی کوئی گناہ نہیں اور لنگڑے پر بھی کوئی گناہ نہیں اور بیمار پر بھی کوئی گناہ نہیں۔"

یہ آیت مبارکہ معذورین کے متعلق نازل ہوئی ہے جن کے لئے جہاد پر نہ جانا جائز ہے۔ کیونکہ قتال میں اعضاء کا استعمال ہوتا ہے جبکہ اپاہج، لنگڑا اور دوسرے معذورین عجز کی بناء پر اس کے اہل نہیں ہیں۔

جہاد ابتدائی صورت میں دعوت الی اللہ کا نام ہے

مسلمان مجاہدین جب اہل حرب کا شہر یا قلعہ میں گھیراؤ (محاصرہ) کرلیں تو ان کو اولاً اسلام کی طرف دعوت دیں جیسا کہ اس سے پہلے ایک حدیث مبارکہ بیان ہو چکی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات مخالفین اسلام کی دعوت قبوت کر لیتے ہیں اور مسلمان بھی ہو جایا کرتے ہیں تو اس صورت میں مقصود حاصل ہو گیا، لہٰذا اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو ان سے قتال ممنوع ہوگا، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "أمرت ان أقاتل الناس...... الحديث "یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں تاوقتیکہ وہ مسلمان ہو جائیں۔" نیز اصل مقصود بھی یہی ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور یہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو انہیں جزیہ کی طرف دعوت دی جائیگی جب کہ وہ جزیہ دینے کے اہل ہوں۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

"حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" [التوبۃ:٢٢٩]

"یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں۔"

ان کی طرف سے جزیہ اس لئے قبول کیا جائے گا تا کہ ان کا اور مسلمانوں کا نفع ونقصان مشترک ہو۔ یعنی ان کا مال اور ان کی جان مسلمانوں کی طرح محفوظ ہو جائے۔

مسلمانوں پر واجب ہے کہ جسے اسلام کی دعوت نہیں پہنچی اس کو اسلام کی دعوت دیں تا کہ انہیں معلوم ہو سکے کہ ان سے قتال کس بناء پر کیا جا رہا ہے۔ بعض اوقات وہ دعوت کو قبول بھی کر لیتے ہیں، اس صورت میں قتال کی مشقت سے بھی بچاؤ ہوگا۔ نیز اس سے قبل ایک حدیث بھی گزر چکی ہے۔ اور جسے اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو اسے قتال سے پہلے اسلام کی طرف دعوت دینا

مستحب ہے تا کہ انہیں خوب اندازہ ہو جائے اور یہ تجدید دعوت واجب نہیں ہے، جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو مصطلق پر حملہ کیا تھا اور وہ اس وقت غفلت میں تھے اور ان کے چوپائے پانی پی رہے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب کفار کو اسلام کی دعوت پوری طرح پہنچ چکی ہو اس کے بعد تجدید دعوت کے بغیر ہی ان کے ساتھ قتال کرنا جائز ہے۔

اگر وہ (دشمن) اسلام بھی قبول نہ کریں اور جزیہ دینے سے بھی انکار کریں تو اللہ تعالیٰ سے فتح اور نصرت کی دعا کرتے ہوئے ان پر حملہ کر دو اور ان کے ساتھ لڑائی کرو، اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے مددگار ہیں اور غرق اور حرق کے ذریعہ اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کے درختوں کو کاٹ ڈالیں، خواہ وہ درخت پھلدار ہوں اور ان کے کھیت کسی بڑی مشقت کے بغیر ہی برباد کر دیں، اگر ان کے بغیر ہی قدرت اور غلبہ ہو جائے تو پھر یہ سب کچھ جائز نہیں ہے لیکن جب اس کے بغیر مسلمانوں کی کامیابی اور غلبہ ممکن نہ ہو تو پھر جائز ہے، جب مسلمانوں کی کامیابی کا غالب گمان ہو تو ایسی کاروائی مکروہ ہوگی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو نضیر کے کھجور کے درخت جلا دیئے تھے اور ان کو کٹوا دیا تھا جو کہ مقام بُویرہ میں تھے، پھر یہ آیت اتری: ''مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ'' [الحشر: ۵] ''جن درختوں کو تم نے کاٹا یا جن کو تم نے اپنی جڑوں پر باقی رہنے دیا تو یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہے۔''[1] اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب یہودیوں کی بات سے بعض مسلمانوں کے دلوں میں کچھ شبہ پیدا ہونے لگا تھا، یہودیوں نے کہا تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ تو فساد سے روکتے ہیں، پھر آپ نے کھجور کے ان درختوں کو کیوں کٹوایا اور جلایا؟ کیا یہ فساد ہے یا اصلاح؟ آیت کا اگلا حصہ یہ ہے: ''وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ'' [الحشر: ۵] ''تا کہ وہ ان فاسقوں کو رسوا کرے''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل فساد نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے حکم سے ہی کیا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاتحانہ انداز میں طائف کی جانب رواں دواں تھے تو قبیلہ ثقیف کے ایک آدمی کے باغ کے پاس سے گزر ہوا جو اس میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف پیغام بھیجا کہ یا تو باہر آ جاؤ ورنہ ہم تیرے باغ کو تجھ سمیت جلا دیں گے۔ اس نے باغ سے نکلنے سے انکار کیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس باغ کے جلا ڈالنے کا حکم دیا اور جس وقت طائف کے قلعہ کے قریب اترے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے انگور کے درخت کاٹ ڈالنے اور ان کو جلا ڈالنے کا حکم دیا تا کہ وہ (دشمن)

---

[1] صحیح البخاری: ۸۲۸

خوب جلیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَلاَ يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَّغِيظُ الْكُفَّارَ وَلاَ يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيلاً اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ'' [التوبۃ: ۱۲۰]

''اور نہیں قدم رکھتے کسی جگہ جس سے کہ خفا ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے کوئی چیز مگر لکھا جاتا ہے ان کے واسطے اس کے بدلے نیک عمل''

اور جو ایسا چلنا چلے جو کفار کے لئے موجب غیظ ہو اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی ان سب پر ان کے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا۔''[1]

کفار مسلمان قیدیوں کو سپر (ڈھال) بنائیں تو کیا حکم ہے؟

اگر کفار مسلمان قیدیوں کو سپر (ڈھال) بنائیں تو مسلمان مجاہدین حملہ سے باز نہ آئیں، کیونکہ وہ اس کو مسلمانوں کے قتال کو بالکلیہ ختم کرنے کا ذریعہ بنائیں گے، البتہ مسلمان کفار پر حملہ کا قصد کریں، کیونکہ مسلمان کو قصداً قتل کرنا جائز نہیں ہے اور جب حملہ کے فعل میں کافر اور مسلمان کا امتیاز (فرق) نہ ہو پائے تو ہم کافروں پر حملہ کا قصد (نیت) کریں گے، اگر کوئی مسلمان جس کو کفار نے اپنا سپر (ڈھال) بنایا ہو، زخمی ہو جائے یا مارا جائے تو ہم اس کے ضامن نہیں ہوں گے، حملہ آور مجاہد کا قول مع الیمین معتبر ہوگا کہ اس نے کفار پر حملے کا قصد کیا تھا نہ کہ مقتول مسلمان کا قصد کیا تھا۔ کیونکہ اصول ہے: ''الفروض لاتقرن بالغرامات'' یعنی فروض اور تاوان جمع نہیں ہوتے جیسا کہ اگر کوڑے لگنے یا ہاتھ وغیرہ کے کٹنے سے کوئی محدود (سزا یافتہ شخص) مر جائے تو اس کا خون رائیگاں جاتا ہے۔

لڑائی میں عورتوں کے نکلنے کا حکم

عورتیں مردوں کے ہمراہ بڑے لشکر میں نکلیں گی۔ محدود افراد پر مشتمل چھوٹے لشکر میں نہیں نکلیں گی۔ اور جو کام ان کے لائق ومناسب ہیں انہیں بجالائیں گی۔ مردوں کی جگہ مقتولین کی خدمت بجالائیں گی، تمام مرد حضرات قتال اور لڑائی میں مصروف بہ عمل رہیں گے اور جوان عورتیں اپنے گھروں میں رہیں گی مردوں کے شانہ بہ شانہ قتال میں حصہ نہیں لیں گی، یہ بات فتنہ وفساد کو دور کرنے کے لئے ہے، البتہ ضرورت کے وقت باحیا ہو کر مردوں سے بچتے ہوئے نکلیں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں جہاد کے لئے نکلا کرتی تھیں۔

---

[1] دیکھئے: [illegible] ۱/۳۹۱

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ احد کے دن جب لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یکطرف ہو گئے تھے تو میں نے عائشہ بنت ابی بکرؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ دونوں پانی کے مشکیزے اپنی کمر پر لاد کر لاتیں، پھر لوگوں (زخمیوں) کے منہ میں پانی ڈالتیں، پھر واپس جا کر مشکیزوں کو بھرتیں، پھر آ کر ان لوگوں کے منہ میں پانی انڈیلتیں۔[1]

ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں، زخمیوں کو پانی پلاتیں اور ان کا علاج کرتی تھیں اور مقتولین کو اٹھاتی تھیں۔[2]

ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی ہے۔ میں لوگوں کے کجاوں میں پیچھے رہتی تھی، عورتوں کا کام زخمیوں کی دوا و علاج ہوتا تھا۔[3]

نجدۃ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو جہاد پر ساتھ لے جاتے تھے اور کہا ان عورتوں کے لئے بھی جہاد میں حصہ مقرر کرتے تھے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو جواب میں لکھا کہ آپ نے مجھ سے یہ پوچھنے کے لئے خط لکھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو جہاد پر لے جاتے تھے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جہاد پر لے جاتے تھے اور وہ عورتیں زخمیوں کا علاج معالجہ کرتی تھیں اور انہیں مال غنیمت میں سے حصہ بھی دیا جاتا تھا۔[4]

ام عطیہ رضی اللہ عنہا عورتوں کو غسل دیا کرتی تھیں، اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم بنت ملحان رضی اللہ عنہا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں جایا کرتی تھیں، حنین کے دن جب لوگ ایک طرف کو چلے گئے تھے تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیا۔ لیکن ایسے فوجی دستے جن میں عورتوں کی شرکت عام طور پر فتنہ سے محفوظ نہ ہو، اس میں عورتوں کا نکلنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں عورتوں کی فضیحت اور ضیاع معرض خطر میں ہوتا ہے۔

عہد شکنی، خیانت اور مثلہ کرنے کی ممانعت

مسلمانوں کو عہد شکنی، خیانت اور مثلہ نہیں کرنا چاہئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جس مسلمان کا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو معاہدہ کی مدت ختم ہونے تک اسے اس کا پاس رکھنا چاہئے۔ یا پھر برابری کے طور پر اس معاہدہ کو توڑ دیا جائے۔“[5]

---

[1] [صحیح بخاری: ۵۸۴]　[2] ایضاً　[3] [الاصابۃ: ۴/۴۷۷]
[4] [صحیح مسلم: ۱۴۴۴/۳]　[5] [سنن ابی داؤد: ۸۳/۳]

معلوم ہوا کہ عہد شکنی سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے۔ جسے ''غدر'' کہتے ہیں۔
اور مال غنیمت میں سے چوری کا ارتکاب ''غلول'' کہلاتا ہے اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ. وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ''

[ال عمران:۱۶۱]

''اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو شخص خیانت کرتا ہے وہ قیامت کے دن اس خیانت کردہ چیز کو لائے گا۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی حفاظت کے لئے کرکرہ نامی آدمی مقرر تھا، وہ فوت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''هو في النار'' وہ جہنم میں ہے، لوگوں نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس نے مال غنیمت میں سے ایک عباء (چوغہ) چوری کی تھی۔[1] معاہدہ سے قبل دھوکے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایک (جنگی) تدبیر اور چال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الحرب خدعة'' یعنی جنگ دھوکہ کا نام ہے۔[2]

مسلمانوں کو چاہئے کہ دشمن کا مثلہ نہ کریں یعنی دشمن کے قیدیوں کے ہاتھ پاؤں یا ان کے دیگر اعضاء کان، ناک، زبان، انگلیاں وغیرہ کاٹ کر پھر ان کو قتل کر دینا یا رہا کر دینا مناسب نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مثلہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سر کاٹ دیئے جائیں اور پیٹ چیر دیئے جائیں۔ اس سے ممانعت ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں صدقہ وخیرات کی ترغیب دیا کرتے تھے اور مثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے۔''[3]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قتل کے طریقہ میں اہل ایمان سب سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں''[4]

عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی ممانعت

مسلمان مجاہدین کو چاہئے کہ وہ کسی عورت یا بچے یا دیوانے یا شیخ فانی یا اپاہج وغیرہ کو قتل نہ کریں، کیونکہ وہ اہل قتال میں سے نہیں ہیں، لیکن اگر ان میں سے کوئی بادشاہ ہو یا قتال پر قدرت رکھتا ہو یا اس کی ترغیب دیتا ہو یا جنگ میں صاحب الرائے ہو یا جو شخص مال ودولت کے ذریعے

---

۱ [صحیح البخاری:۶۲۴] ۲ [صحیح مسلم:۱۳۶۱/۳]
۳ [سنن ابی داؤد:۵۳/۳] ۴ [سنن ابی داؤد:۵۳/۳]

دوسروں کولڑائی پر آمادہ کرتا ہوتا ہو یا بوڑھا ہو لیکن جنگی تدابیر سے واقف ہو تو اس کو قتل کرنا جائز ہے۔ اور احناف کے نزدیک ان کا قتل محاربہ کی وجہ سے مباح ہے۔ لہٰذا اگر ان میں سے کوئی شخص قتال کرے تو اس کا شر دور کرنے کی غرض سے اس کو قتل کیا جائیگا۔ لڑائی کی ترغیب دینے والے کو بھی قتل کیا جائیگا اور جس کی رائے سے لڑائی میں زیادہ مدد مل سکتی ہو یا جس کے پاس مال و دولت ہو اور وہ اس کے ذریعے مدد کرتا ہو تو وہ بھی لڑنے والے (دشمن) کی طرح ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے درید بن الصمہ کو قتل کیا تھا، حالانکہ اس کی عمر ایک سو بیس سال کی تھی، کیونکہ وہ صاحب الرائے تھا۔ چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اقتلوا شیوخ المشرکین، واستحیوا شرخھم"[1] یعنی مشرکین کے بوڑھوں کو قتل کرو اور ان کے بچوں کو زندہ رہنے دو۔" اگر نصاریٰ کے پادری اور ان کی عبادت گاہوں کے لوگ، دشمنوں کے ساتھ ملے ہوئے ہوں اور دوسروں کو لڑائی پر آمادہ کرتے ہوں یا مسلمانوں کی پوشیدہ باتوں کی رہنمائی کرتے ہوں تو ان کو بھی قتل کیا جائے، لیکن اگر وہ مخالفین (دشمنوں) کے ساتھ ملے ہوئے نہ ہو اور نہ ہی مسلمانوں کی پوشیدہ امور ان کو بتاتے ہوں بلکہ اپنے آپ کو انہوں نے عبادتخانوں تک محدود کر رکھا ہو تو پھر ان کو قتل نہ کیا جائے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی غزوہ (جہاد) میں ایک عورت مقتول پائی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے ناگواری کا اظہار فرمایا۔"[2]

رباح بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ کسی چیز پر جمع ہیں، آپ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا کہ دیکھ یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟ اس نے آکر بتایا کہ ایک مقتول عورت پر جمع ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، یہ عورت تو قتال کے لائق نہیں تھی،" اس لشکر کے امیر خالد بن الولید رضی اللہ عنہ تھے، آپ ﷺ نے ان کی طرف ایک آدمی بھیجا اور فرمایا کہ "خالد رضی اللہ عنہ کو کہو کہ وہ کسی عورت اور اجیر (مزدور) کو ہرگز قتل نہ کریں۔" ممکن ہے کہ وہ اجیر اہل قتال میں سے نہ ہو اس لئے اسے قتل کرنے سے منع فرمایا۔

اگر دشمن کی صف میں باپ موجود ہو تو کیا حکم ہے؟

مسلمانوں کے لئے یہ امر مکروہ کہ وہ اپنے جنگجو باپ کو قتل کرنے میں پہل کرے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا" [لقمان:۱۵]

[1] [سنن الترمذی: ۷۲/۳] [2] [سنن ابی داؤد: ۵۳/۳]

''اور دنیا میں ان دونوں کے ساتھ اچھے طریقہ سے پیش آؤ۔''

اور عام حالات میں باپ پر خرچ کرنا واجب ہوتا ہے، لہٰذا اس کو قتل کرنا اس حکم کے خلاف ہے۔ لیکن جب باپ اپنے بیٹے کو قتل کرنے کا قصد کرے اور بیٹے کے لئے قتل کے سوا اس کے دفاع کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس کو قتل کرنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ اصل مقصود تو دفاع ہے جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے احد کی لڑائی میں اپنے باپ کو قتل کیا تھا، اسی طرح مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے احد کی لڑائی میں اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے ماموں عاص بن ہشام کو بدر کی لڑائی میں قتل کیا تھا۔ نیز ارشاد خداوندی ہے:

''لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُم.........'' [المجادلہ:۲۲]

''تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہو اللہ کے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خواہ وہ اپنے باپ ہوں یا اپنے بیٹے۔''

کفار سے امن وصلح کا معاہدہ کرنا

جب مسلمانوں کے پاس قوت موجود ہو تو اس صورت میں اہل حرب (کفار) سے امن وصلح کا معاہدہ کرنا مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس میں کوئی مصلحت نہیں ہے اور اس سے جہاد کا صورۃً اور معنیً ترک کرنا یا اس کی تاخیر لازم آتی ہے۔ کیونکہ اس معاہدے کا مطلب ہے امن وصلح کی طلب اور ارشاد خداوندی ہے:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ [محمد:۳۵]

''سو تم بودے نہ ہو جاؤ اور نہ لگو پکارنے صلح اور تم ہی رہو گے غالب۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار کے ساتھ قتال کرنے میں کمزور نہ پڑو کہ ان کو صلح کی دعوت دینے لگو، جب کہ تم ہی اللہ کے وعدہ نصرت واعزاز کے مطابق سر بلند رہو گے۔

اور اگر مسلمانوں کے پاس قوت موجود نہ ہو اور انہیں کفار کی طرف سے اپنی جان کا خوف ہو تو پھر صلح کا معاہدہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا'' [الانفال:۶۱]

''اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو تو بھی جھک اسی طرف''

اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی ان کی طرف مائل ہو جاؤ اور ان کے ساتھ مصالحت کرلو۔ اور اس میں اسلام اور اہل اسلام کی مصلحت معتبر ہے۔ لہٰذا مصلحت کا تقاضا ہو تو مصالحت جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے سال اہل مکہ سے دس سال کا جنگ بندی کا معاہدہ کیا تھا، نیز اس لئے کہ جب امن وصلح کا یہ معاہدہ مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر ہو تو وہ بھی معنیً جہاد ہوگا۔ نیز اس لئے کہ اصل مقصود کفار کے شر کو دور کرنا ہے اور یہ مقصد اس سے حاصل ہوگیا۔ حاکم وقت اگر چاہے تو دس سال سے بھی زیادہ مدت کے لئے صلح کا معاہدہ کرسکتا ہے جبکہ مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہو، کیونکہ مسلمانوں کی مصلحت اور بہتری کسی مدت کے ساتھ متعین نہیں کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اگر حاکم نے ان کے ساتھ ایک مدت کے لئے معاہدہ کیا ہو، پھر اس نے دیکھا کہ ان کے ساتھ قتال کرنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے تو اس معاہدے کو فسخ کرے اور ان کو فسخ معاہدے کی اطلاع کردے تاکہ عہد شکنی سے بچ سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَانبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ'' [الانفال: ۵۸] ''پس آپ اس عہد کو ان کی طرف برابر طریقہ پر پھینک دیں۔'' جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس معاہدے کو جو اہل مکہ کے ساتھ طے پایا تھا۔ واپس کردیا تھا، نیز اصل اعتبار اسلام اور اہل اسلام کی مصلحت وخیر خواہی کا ہے۔ جب مصلحت بدل گئی تو اب اس معاہدے کو قائم نہ رکھنا جہاد ہوگا، اور اسے برقرار رکھنا صورۃً اور معنیً ہر اعتبار سے ترکِ جہاد ہوگا۔ البتہ اتنی مدت جس میں تمام کفار کو نبذِ عہد کی اطلاع ہو سکے، اسے ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔ جب اتنی مدت پوری ہو جائے (گزر جائے) جس میں کفار کا رئیس (بادشاہ) اپنے اطراف مملکت میں رد معاہدے کی خبر پہنچا سکتا ہو تو ان سے قتال کرنا جائز ہوگا، اگرچہ وہ (رئیس کفار) ان کو مطلع نہ کرے۔ کیونکہ کوتاہی ان کے رئیس کی ہے لہٰذا یہ غدر (عہد شکنی) شمار نہ ہوگا۔ اگر دشمنوں کی طرف سے معاہدے میں خیانت کی ابتداء ہو اور ان کا رئیس اس بدعہدی سے باخبر ہو تو ردِ معاہدے کے بغیر ہی مسلمان ان سے قتال کریں، کیونکہ انہوں (دشمنوں) نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا اور ان کا رئیس بھی اس سے باخبر تھا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ ثابت ہے کہ کفار مکہ نے بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کو آگاہ کئے بغیر سرزمین مکہ پر حملہ کرکے مکہ کو فتح کیا، حالانکہ مذکورہ صورت حال کو دیکھ کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا یہ معاہدے کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ یعنی تاحال معاہدے کی مدت تو باقی ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے جواباً فرمایا کہ اہل مکہ نے بنوبکر کی وساطت سے بنوخزاعہ پر حملہ کرکے معاہدہ

توڑ دیا ہے۔ لہٰذا دریں صورت معاہدے کی مقررہ مدت کی تکمیل یا نقض معاہدہ کے باعث کفار مکہ کو معاہدہ صلح سے دستبرداری کی اطلاع کرنا لازمی نہیں ہے، واقدی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: اَنّھم غدر وا ونقضوا العھد فانا غازیھم"۔ یعنی انہوں نے عہد شکنی کی پس میں ان کے ساتھ جہاد کروں گا۔"[1]

لیکن اگر عہد شکنی کا یہ فعل ان کے رئیس کی اجازت کے بغیر ہو تو سب کے حق میں عہد شکنی قرار نہیں دی جائیگی، بلکہ صرف ان ہی لوگوں کے حق میں عہد شکنی ہوگی اور ان ہی کے ساتھ قتال کیا جائیگا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی ایک جماعت سے (بلا تعین مدت) معاہدہ کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے معاہدات میں غور کریں۔ چنانچہ جن سے چار ماہ کا عہد تھا ان کے معاہدے کو مدت معینہ تک کے لئے برقرار رکھا گیا۔ اور جن سے چار ماہ سے زیادہ کا عہد تھا ان کے معاہدے کی مدت کو کم کر کے چار ماہ کر دیا گیا۔ اور جن سے چار ماہ سے بھی کم کا عہد تھا ان کے معاہدے کی مدت میں توسیع کر کے اس کو چار ماہ کر دیا گیا، ارشاد خداوندی ہے:

"بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ" [التوبۃ: ۱]

"صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔"

سورہ براءت کی ابتدائی دس آیتیں اتریں تو حضور نبی کریم ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ دس آیات دے کر اہل مکہ کے پاس بھیجا کہ یوم نحر کو جب سب مشرکین جمع ہوں، ان آیات کو ان کے سامنے پڑھ دینا اور ہر صاحبِ معاہدہ سے دستبردار ہو جانا۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ کے لئے روانہ ہوئے تو جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور انہوں نے کہا کہ "آپ کی طرف سے آپ کا کوئی اہل بیت جائے" اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل عرب کا عرف یہ تھا کہ معاہدے کرنے یا اس کو توڑنے کے لئے قبیلے کا سردار جاتا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا اور ان سے فرمایا کہ تم ان آیات کو ان کے سامنے پڑھنا تاکہ عذر ختم ہو اور وہ یہ نہ کہیں کہ یہ تو معاہدہ توڑنے کے اس طریقے کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں معروف ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورۃ براءت کی آیات دے کر اہل مکہ کی طرف بھیجا تھا تو اس وقت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تم کس بات کا اعلان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہ اعلان کرتے تھے کہ جنت میں

---

[1] [دیکھئے، الدلائل للبیہقی: ۱۲/۵، نصب الرایۃ: ۳۹۰/۳]

مومن آدمی ہی داخل ہوگا!، بیت اللہ کا طواف ننگے بدن کوئی نہیں کرے گا! جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاہدہ ہو اس کی مدت چار ماہ تک ہوگی، جب چار ماہ گزر جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مشرکین سے دستبردار ہو جائیں گے! اور آئندہ سال کوئی مشرک حج نہیں کرے گا!''[1] جب صلح کا معاہدہ جس کی مدت متعین ہو اس کا وقت گزر جائے تو ردِ معاہدہ کی اطلاع دیئے بغیر ہی عہد (معاہدہ) ختم ہو جائے گا۔ اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان مجاہدین ان پر یلغار کر دیں، کیونکہ وقت گزرنے سے متعین مدت کے لئے کیا جانے والا معاہدہ باطل ہو جاتا ہے۔ ان کفار کی طرف سے جو کافر اس معاہدہ امن وصلح کے ساتھ ہمارے ہاں (دارالاسلام میں) آ جائے، پھر وہ مدت صلح گزر جائے اور وہ کافر ہمارے ملک میں موجود ہوں تو امن والی جگہ واپس جانے تک وہ امان میں ہوگا۔ اس کو قتل کرنا یا قید کرنا حلال نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَأْمَنَهٗ'' [التوبۃ:٦] ''پھر اس کو امن کی جگہ پہنچا دو۔'' جب مسلمان دارالحرب میں ہوں اور وہ جہاد کر رہے ہوں یا مجاہدین کی خدمت میں مصروف ہوں تو وہاں اپنے لئے اور اپنے آلات وسامان کے لئے جو کچھ پائیں ان کو ذخیرہ کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت کعب بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''خدا جانتا ہے کہ ایک شام ہم خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے کہ ایک یہودی کا بکریوں کا ریوڑ ان کے قلعے کی طرف جانا چاہ رہا تھا، اور ہم نے ان یہودیوں کا محاصرہ کر رکھا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کون ہے جو اس ریوڑ میں سے ہمیں کھلائے؟ کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''فافعل'' یعنی پھر یہ کام تم کرو۔'' الحدیث۔[2] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہمیں غزوات کے دوران شہد اور انگور حاصل ہوتے تھے، ہم وہ کھا لیتے تھے انہیں رکھتے نہیں تھے۔''[3]

البتہ مسلمان مجاہدین کے لئے یہ جائز نہیں کہ مال غنیمت میں سے کچھ بھی اپنے لئے (تقسیم سے قبل) لیں، کیونکہ سوئی اور دھاگہ کے برابر چیز بھی لینا غلول کے حکم میں آتا ہے، جو لوگ تجارت کی غرض سے وہاں گئے ہوں، جہاد وقتال کے لئے نہ گئے ہوں، ان کے لئے کفار کا مال قیمتاً لینا ہی جائز ہے۔ کیونکہ تاجر کا مال غنیمت میں کوئی حق نہیں ہے۔

کافر کا اسلام لا کر اپنے آپ کو محفوظ بنا لینا

جب دارالحرب کا کوئی باشندہ (کافر) مسلمان ہو جائے تو اپنے اسلام لانے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بھی اور اپنی نابالغ اولاد کو بھی محفوظ اور مامون کر لیتا ہے۔ کیونکہ چھوٹے بچے بھی اس

[1] [مسند احمد بشرح البناء:۲۱/۲۱۱] [2] [سیرۃ ابن ہشام:۲/۳۳۵] [3] [صحیح البخاری:۶۴۳]

کے اسلام لانے کی وجہ سے تبعاً مسلمان ہوں گے اور آزاد شمار ہونگے، اسی طرح ہر وہ مال جو اس کے پاس ہو یا کسی مسلمان یا ذمی کے پاس امانت کے طور پر اس نے رکھوایا ہو وہ بھی محفوظ ہو جائے گا، جیسا کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "من اسلم علی شیء فھو لہ"[1] "یعنی جو شخص جس چیز پر مسلمان ہو تو وہ چیز اسی کی ہوگی۔"

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری میں یہ باب قائم کیا ہے: "اِذا اسلم قوم فی دارالحرب، ولھم مال و ارضون فھی لھم"[2] یعنی "اگر دارالحرب کے کچھ لوگ اسلام لے آئیں اور وہ مال و جائیداد کے مالک ہوں تو ان کی ملکیت باقی رہے گی"، اسی طرح تمام منقولہ جائیداد پر ان کی ملکیت باقی رہے گی۔ لیکن اگر کسی حربی کے پاس اس نومسلم کا کوئی مال بطور امانت ہو تو یہ مال مسلمانوں کے مال غنیمت میں جائے گا۔ کیونکہ حربی کا قبضہ درست نہیں ہے۔ اور اس نو مسلم کی بیوی بھی مال غنیمت ہے، کیونکہ بیوی اس کے تابع متصور نہیں ہوگی۔ الا یہ کہ وہ بھی مسلمان ہو جائے۔ اسی طرح اس کا حمل بھی مال غنیمت متصور ہوگا۔ کیونکہ اس نومسلم کی بیوی کا حمل تا حال اس عورت کا جزو ہے، پس اس عورت کی غلامی کے ساتھ رحم میں موجود بچہ بھی غلام ہوگا اور مسلمان غیر کے تابع ہو کر مملوک ہونے کے قابل ہوتا ہے۔ یعنی حکم میں اپنی ماں کے تابع ہو کر غلام متصور ہوگا اور دین میں اپنے باپ کے تابع ہونے کی وجہ سے مسلم غلام ہوگا اور اس کی بالغ اولاد مال غنیمت متصور ہوگی۔ کیونکہ وہ باپ کے تابع نہیں ہیں بلکہ خود ان پر حکم لگایا جائیگا۔

دشمن کو اسلحہ فروخت کرنے کا حکم

کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اہل حرب کے ہاتھوں اسلحہ فروخت کرے۔ کیونکہ اس سے انہیں ہمارے ساتھ لڑنے کی قوت اور طاقت پیدا ہوگی۔ یہاں تک کہ جب ہم اسلحہ سازی پر قدرت حاصل کرلیں اور اہل حرب اس کی خریداری کے لئے ہمارے ملک میں آئیں تو ان کو اس سے منع کیا جائیگا۔ انہیں اس کے ذریعے قدرت اور طاقت فراہم نہیں کی جائیگی۔ کیونکہ اس سے وہ ہمارے خلاف قوت اور طاقت حاصل کرلیں گے نہ یہ معاہدۂ صلح سے قبل جائز ہے اور نہ اس کے بعد جائز ہے۔

مسلمان کا امان دینا

اگر کسی آزاد مسلمان نے (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کسی کافر کو یا کفار کی جماعت کو یا قلعہ

---

[1] [نصب الرایۃ: ۳/۴۱۰] [2] [صحیح البخاری: ۴۲۰]

والوں کو یا اہل شہر کو پناہ دے دی تو اس کی امان صحیح ہے، پھر کسی مسلمان کو روا نہیں کہ ان پناہ گیر کفار سے قتال کرے، اور صحت امان کی شرط یہ ہے کہ مؤمن ایسا مجاہد ہو کہ کفار اس سے خوف زدہ ہوں، کیونکہ امن و امان تو خوف کے بعد متحقق ہوتا ہے اور ایک فرد امان دینے میں سب کے قائم مقام ہوگا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ تمام کے تمام لوگ امان پر متفق ہوں۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے دو مشرک آدمیوں کو پناہ دی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا اور فرمایا کہ کیا تم مشرکوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں پناہ دیتی ہو؟ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے کہا کہ خدا کی قسم! پہلے تم مجھے قتل کرو گے پھر ان کو قتل کر سکو گے، (یہ کہہ کر) دروازہ بند کر لیا۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گئی، مجھے معلوم ہوا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل فرما رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کر رکھا تھا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ ''یہ کون ہے؟'' میں نے کہا کہ میں ام ہانی، ابو طالب کی بیٹی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مرحباً بام ھانی'' یعنی ام ہانی! خوش آمدید!، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہوئے اور ایک چادر میں ملبوس ہو کر آٹھ رکعتیں ادا کیں، پھر میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری ماں کے بیٹے، علی رضی اللہ عنہ، چاہتے ہیں کہ ایسے آدمی کو قتل ہی کریں گے جسے میں پناہ دے چکی ہوں، وہ ہبیرہ کا فلاں لڑکا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے ام ہانی! جسے تم نے پناہ دیدی اسے ہماری طرف سے بھی پناہ ہے۔ ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس وقت چاشت کا وقت تھا۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث میں ہے کہ ''تمام مسلمانوں کا عہد اور پناہ ایک ہے، پس جس شخص نے کسی مسلمان کی پناہ میں مداخلت کی (اس کو توڑا) تو اس پر بھی اسی طرح اللہ، ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ نہ اس کی کوئی فرض عبادت قبول ہوگی اور نہ نفلی۔''[2]

اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کا امان دینا (پناہ دینا) بھی جائز ہے، جب اس کا پناہ دینا جائز ہے تو کسی کو روا نہیں کہ پناہ گیر کافر کو قتل کرے یا اس کا مال چھینے۔

قریب البلوغ لڑکے کا امان دینا قابل اعتبار نہیں ہے، کیونکہ امان ایک معاملہ ہے اور وہ معاملہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ امان دینے کا معاملہ سمجھتا ہے اور اس کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے تو اس کا امان دینا جائز ہے۔

---

[1] [صحیح البخاری باب امان النساء و جوارہن: ۶۴۷] [2] [صحیح البخاری: ۶۴۷]

جس غلام کو قتال کی اجازت دی گئی ہو اس کا امان دینا درست ہے، کیونکہ وہ صاحب الرائے ہے، اس لئے اس کا امان دینا جائز ہے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسلاً منقول ہے کہ ”المسلمون تتكافأ دماؤهم ويسعى بذمتهم أدناهم“ یعنی مسلمانوں کے خون باہم یکساں ہیں اور ان کی ذمہ داری کے لئے ان کا (مسلمانوں کا) ادنیٰ بھی سعی کرے گا۔“[1] اور یہ حدیث صحیح بخاری باب ذمۃ المسلم میں اور صحیح مسلم باب فضائل مدینۃ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور سنن ابی داؤد باب ایقاد المسلم من الکافر (الدیات) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وحضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور سنن النسائی جلد دوم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہی اور سنن ابن ماجہ، باب المسلمون تتکافأ دماؤھم“ میں اور نصب الرایۃ، عمدۃ القاری اور فتح القدیر ص۲۱۳ وج ۵ میں بھی مروی ہے۔[2]

غلبہ کے طور پر فتح کئے ہوئے شہر کی تقسیم کا حکم

اگر مسلمان حاکم نے کسی شہر کو بطور غلبہ (قتال کے ساتھ) فتح کیا تو مفتوحہ شہر کی تقسیم کا مسئلہ مسلم حکمران کی صوابدید پر منحصر ہوگا۔ اگر چاہے تو اس مفتوحہ شہر کو مسلمانوں کے مابین تقسیم کر دے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کو مختلف حصوں میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا تھا[3] اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے بنوقریظہ کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔ اور اگر وہ چاہے تو اہل علاقہ کو اس مفتوحہ علاقہ پر برقرار رکھے اور ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں پر جزیہ مقرر کر دے اور ان کی زمینوں پر خراج (ٹیکس) عائد کر دے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع (موافقت) سے سوادِ عراق (عراق کی بستیاں) میں یہی کام کیا تھا۔ پس اسلامی مملکت کے سربراہ کو اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے جس پر چاہے عمل کرے اور فتویٰ اس پر ہے کہ بوقت ضرورتِ غانمین (غازیان اسلام) پہلی صورت (یعنی تقسیم کرنا) بہتر ہے اور عدم حاجت کے وقت دوسری صورت (حربیوں میں برقرار رکھنا) اولیٰ ہے تاکہ آئندہ کے لئے یہ سامان مہیا رہے۔ اور یہ صورت غیر منقولہ سامان میں ہے۔ اس لئے کہ شہر کے لوگ مسلمانوں کے لئے کام کرتے ہیں اور ان کفار کی گردنیں احساناً آزاد کرنا زراعت کی منفعت (مفاد) کے لئے ہے۔ اگر ان کے پاس اراضی نہ ہو تو پھر ان کی گردنیں احساناً آزاد کرنا جائز نہیں ہے اور ان کو مال منقولہ میں سے اس قدر دیا جائے گا جس سے وہ کاشتکاری کا کام کرسکیں۔ (اس سے معلوم ہوا کہ مفتوحہ علاقوں کے بارے میں مسلمان حاکم کو اختیار ہے کہ اگر وہ غازیان اسلام کی ضرورت وحاجت کے پیش نظر خیر وبھلائی کا عنصر دیکھے تو اسے اسوۂ حسنہ کے مطابق تقسیم کر دے اور اگر عدم ضرورت کے باعث اس میں غازیان اسلام کی بھلائی

[1] [جامع الاحادیث للسیوطی: ۲۰۹/۶] [2] [دیکھیے البنایۃ: ص۱۴۹، ج۱۹] [3] [مؤطا امام مالک]

مسلمان حاکم نہ دیکھے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل وتوافق کو مدنظر رکھتے ہوئے مفتوحہ اراضی کو تقسیم نہ کرے۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعد میں آنے والے مسلمانوں کے مفادات کی غرض سے عراق کی اراضی کو خراجی زمین کے طور پر برقرار رکھا تھا جس کی حکمت یہ تھی کہ آئندہ کے لئے عدم حاجت پر مبنی غیر منقسم اراضی بعد میں آنے والے مسلمانوں کے مفاد میں کام آسکے۔ یا امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول سواد عراق کی اراضی تقسیم نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رضامندی کے باعث عدم تقسیم عمل میں لائی گئی ہو، جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سواد عراق کے باشندوں پر جزیہ مقرر کیا تھا۔ ازمترجم۔)

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارض عراق پر خراج مقرر کیا تو غازیان اسلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی تقسیم کا مطالبہ کیا اور اس آیت سے استدلال کیا: مَآ اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى" [الحشر:۸] "اللہ تعالیٰ جو کچھ بستی والوں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمائے......"
نیز اس ارشاد باری سے استدلال کیا: "لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ" [الحشر:۸] الآیۃ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جواباً اس آیت سے استدلال کیا: وَالَّذِيْنَ جَآءُ وْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ" [الحشر:۱۰] "واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد"

اور فرمایا کہ اگر میں نے عراق کی اراضی تم میں تقسیم کر دی تو بعد والوں کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا (یہ سن کر) سب نے اطاعت کی اور اپنے قول سے رجوع کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو اختیار کرلیا۔ اور یہ ساری صورتحال غیر منقولہ اشیاء میں ہے۔ لیکن منقولہ اشیاء کو بطور احسان ان حربیوں کو لوٹانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت میں وہاں کے لوگوں کو لوٹانا وارد نہیں ہوا ہے۔

ہر وہ زمین جس کے باشندے مسلمان ہو جائیں یا وہ بطور غلبہ وقتال کے فتح ہو اور اسے مسلمان حاکم غازیوں میں تقسیم کر دے وہ عشری زمین کہلاتی ہے۔ اور ہر وہ زمین جو بطور غلبہ کے فتح ہو اور اس مفتوحہ علاقہ کے لوگوں (حربیوں) کو اس پر برقرار رکھا گیا ہو تو وہ خراجی زمین ہے، البتہ مکہ معظمہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو بطور غلبہ فتح کیا تھا اور اس کو اس کے رہنے والوں کے سپرد کر دیا تھا اور ان پر خراج مقرر نہیں فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر جریب پر ایک ہاشمی قفیز مقرر کیا ہے اور وہ ایک صاع (پیمانہ) ہے۔ اور کھجور اور انگور کے درختوں کے ایک جریب پر دس درہم مقرر کئے ہیں۔ جریب وہ مربع زمین جس کے ضلع کی لمبائی سات ذراع (شرعی گز) ہو، اسے خراج المقاطعہ یا خراج الوظیفہ بھی کہتے ہیں۔ (جیسا کہ آگے آرہا ہے۔)

قیدیوں کے بارے میں امام کو اختیارات

مسلمان حاکم کو قیدیوں کے بارے میں اختیار ہے، کہ وہ چاہے تو انہیں (کافر قیدیوں کو) قتل کر دے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن قتل کیا ہے۔ بایں وجہ کہ اس قتل میں مادۂ فساد کو قطع کرنا مقصود ہے۔ اور اگر چاہے تو انہیں غلام بنائے، کیونکہ اس میں ان کا شر مدفوع ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کیلئے بہت بڑا نفع بھی ہے اور اگر چاہے تو انہیں آزاد چھوڑ کر مسلمانوں کیلئے ذمی بنائے، (ماسوائے مشرکین عرب اور مرتدوں کے) الا یہ کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔

قیدیوں کو قتل کرنے کا اختیار اس لئے ہے کہ اس طرح فساد کی بیخ کنی ہوگی، اور بایں وجہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ عقبہ بن ابی معیط کو قید میں رکھ کر قتل کر دو۔[1] اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نضر بن حارث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں سخت تکلیف میں رکھ کر قتل کیا تھا۔[2] اور بنو قریظہ میں سے لڑنے والے لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور حاکم کو ان قیدیوں کو آزاد چھوڑ کر مسلمانوں کے لئے ذمی بنانے کا اختیار بھی دیا گیا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب وہ اس کے اہل بھی ہوں، پس اگر وہ مشرکین عرب ہوں یا مرتد لوگ ہوں تو پھر یہ حکم نہیں ہے بلکہ یا تو اسلام لائیں یا قتل کیا جائے۔

کیا مسلمان قیدیوں کے بدلے میں کافر قیدیوں کو رہا کیا جا سکتا ہے؟

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسلمان قیدیوں کے بدلے میں کافر قیدیوں کو رہا نہیں کیا جائے گا بلکہ مالی معاوضہ لے کر بھی رہا کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ اس کی حاجت اور ضرورت درپیش ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" [التوبۃ:۵]

"مشرکوں کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ۔"

نیز ارشاد ہے:

"وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" [البقرہ:۱۹۳]

"اور ان کے ساتھ قتال کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے۔"

عقلی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے کافر قیدی ہمارے پاس جنگی بن کر آئیں ہیں اور ان کی جنگ کے شر کو دور کرنا مسلمان قیدیوں کو ان کے ہاتھوں سے چھڑانے سے زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے

[1] [سیرۃ ابن ہشام:۱/۷۰۸] [2] [سیرۃ ابن ہشام:۱/۷۱۰]

کہ مسلمان قیدیوں کا ان کے قبضہ میں ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ابتلاء وآزمائش ہے جس کی نسبت ہماری طرف نہیں ہے اوران کفار قیدیوں کوان کے حوالہ کر کے ان کی اعانت کرنا ایسا فعل ہے جو ہماری طرف ہی منسوب ہوگا۔ بدر کے دن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند کرتے ہوئے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے اور مسلمانوں کے مفادات (مالی استحکام) کواختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر عتاب فرماتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی:

"لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ"

[الانفال:۶۸]

"اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقرر نہ ہو چکا ہوتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارہ میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔"

البتہ ضرورت کے درپیش ہونے کی صورت میں ایسا کرنا جائز ہے تا کہ جہاد کی تیاری ہو سکے، کیونکہ اصل اعتبار مسلمانوں کی مصلحت و خیر خواہی کا ہے۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ مسلمان قیدیوں کے بدلے میں کافر قیدیوں کو رہا کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ مسلمان قیدیوں کا ہمارے پاس واپس آنا ہمارے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ نیز اس لئے کہ مسلمان کو چھڑانا کفار کو قتل کرنے سے بہتر ہے۔ بہرحال مشرکین کے قیدیوں کو مالی فدیہ لے کر آزاد کرنے (رہا کرنے) کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ مشہور مذہب کے مطابق ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں ان کے ساتھ معاونت ہے جو حرب اور قتال کے ساتھ خاص ہے۔ پس یہ ایسا ہی ہے جیسے مال لے کر ان کو اسلحہ فروخت کرنا۔

مال غنیمت

جو مال کفار سے قہر و غلبہ کے طور پر حاصل ہو اسے مال غنیمت کہتے ہیں اور جو مال ان سے ہدیہ یا چوری یا ہبہ یا غصب وغیرہ سے حاصل ہو وہ غنیمت نہیں ہے اور وہ صرف لینے والے کا ہے۔ مال غنیمت کی خرید و فروخت نہیں کی جائیگی جب تک کہ غازیوں میں اسے تقسیم نہ کر دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غنیمت کا مال خریدنے اور بیچنے سے منع فرمایا جب تک کہ اسے تقسیم نہ کر دیا جائے۔"[1]

جو غازی دارالحرب میں فوت ہو جائے اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور اگر احراز کے بعد انتقال ہوا ہو تو اس کا حصہ اس کے ورثاء کو ملے گا۔ مال غنیمت میں قتال کرنے والا اور مدد کرنے والا برابر ہوں گے۔ جب دارالحرب میں مسلمانوں کے لشکر کو مدد پہنچے تو سب مال غنیمت میں شریک

[1] [سنن الترمذی:۶۲/۳]

ہوں گے۔

دارالحرب میں مال غنیمت کی تقسیم مکروہ ہے، غنیمت کا مال دارالاسلام لایا جائے گا اور پھر یہاں تقسیم ہوگا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بدر کا مال غنیمت مدینہ منورہ میں تقسیم فرمایا، اور آنحضرت ﷺ کا خیبر کا مال غنیمت خیبر میں ہی تقسیم کرنا اور بنو مصطلق کا بھی مال غنیمت وہیں تقسیم کرنا اس بناء پر تھا کہ وہ علاقے داالاسلام بن گئے تھے، جس طرح جعرانہ میں بھی مال غنیمت تقسیم کیا گیا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مال غنیمت کی تقسیم دارالحرب میں جائز ہے۔ البتہ غانمین (غازیان اسلام) کی ملکیت اس وقت ثابت ہوگی جب دارالاسلام میں لاکر اسے محفوظ کرلیا جائے۔

تنفیل کا حکم

قائد کے لئے جائز ہے کہ وہ حالت قتال میں تنفیل (اصل حصہ سے زائد دینا) کا وعدہ کرے، بلکہ تنفیل کر کے انہیں قتال پر آمادہ کرے کیونکہ یہ قتال کی ترغیب ہے اور ارشاد الٰہی ہے:

"يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمؤمِنِينَ عَلَى الْقِتَال"[الانفال:٦٥]

"اے نبیؐ! مومنوں کو قتال پر آمادہ کرو۔"

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس ترغیب سے بہادر لوگ آگے بڑھیں گے، ان میں رغبت اور ولولہ پیدا ہوگا اور وہ اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہوئے قتال کے لئے پیش قدمی کریں گے۔ نفل: اصل میں اس اضافہ کا نام ہے جو امام غازیان اسلام کو وعدوں کے مطابق ان کے حصہ سے زائد دیتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا: من قتل قتيلاً لَهٗ عليه بيّنة فله سَلَبُه"[1] "جس نے (کسی کافر کو) قتل کیا اور اس کے پاس اس پر ثبوت موجود ہو تو مقتول کا سامان اسی (مجاہد) کا ہے۔" سَلَب سے مراد مقتول کے کپڑے، اسلحہ، سواری اور اس پر لدا ہوا تمام مال ہے اور جو مال اس مقتول کے علاوہ دوسرے کے پاس ہو وہ مال غنیمت ہے اس میں سب کا حصہ ہے۔ جب مقتول کا سامان مجاہد قاتل کے لئے مقرر ہو جائے تو باقی غازیوں کا اس سے حق منقطع ہوگا اور اس سامان میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا، لیکن اگر سربراہ نے یہ کہا کہ خمس نکالنے کے بعد اس کا سامان ملے گا تو پھر خمس نکالا جائیگا، اور اگر قائد لشکر نے سلب (سامان مقتول) دینے کے لئے تنفیل نہ کی ہو تو وہ سلب بھی مال غنیمت میں شامل ہوگا، مجاہد قاتل اس کا مستحق نہیں ہوگا۔

اور یہ تنفیل غنیمت کا مال اور احراز کرنے (نکال کر دارالاسلام لانا) اور جنگ ختم ہونے سے پہلے پہلے جائز ہے۔ لیکن جب مال غنیمت کو دارالحرب سے دارالاسلام منتقل کرلیا جائے تو پھر

---

[1] [صحیح مسلم: ۱۳۷۱/۳]

تمام غانمین کا حق ثابت ہوگا۔اس میں بھی تنقیل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے بعضوں کا حق ساقط ہوگا، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تنفیل تحریض (قتال پر آمادہ کرنا) کو مفید بھی نہیں ہے بلکہ یہ تو قتال سے باز رکھنا ہے، کیونکہ اس طرح مال غنیمت کے ایک حصے سے غانمین کا حق باطل کرنا لازم آتا ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احراز کے بعد تنفیل فرمائی تو وہ تنفیل خمس میں سے تھی یا مال صفی میں سے تھی، صفی اسے کہتے ہیں جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال غنیمت میں سے اپنے لئے منتخب فرمالیتے تھے، جیسے تلوار، زرہ یا باندی وغیرہ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اسی مال صفی میں سے تھیں۔[1] ان واقعات سے بعضوں نے یہ سمجھا کہ احراز غنیمت کے بعد بھی تنفیل جائز ہے اور وہ خمس میں سے جائز ہے، اس لئے کہ غانمین کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔امام کے لئے جائز نہیں کہ کل مال غنیمت کی تنفیل کرے کیونکہ وہ سب کا حق ہے، جب سارے مال کی تنفیل کرے گا تو کمزوروں کا حق اس سے منقطع ہوگا اور وہ حصے جن کو اللہ تعالیٰ نے غنیمت کے مال میں مقرر کیا ہے، باطل ہو جائیں گے۔

مال غنیمت کس طرح تقسیم کیا جائے؟

دارالحرب جانے سے پہلے افراد لشکر کی تدوین کی جائیگی تا کہ معلوم ہو کہ کون پا پیادہ ہے اور کون سوار؟ اور سوار وہ ہے جو اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جہاد کرے جس گھوڑے کو اس نے اپنے مال سے خرید کیا ہو، غنیمت میں اس کا اور اس کے گھوڑے کا حصہ دیا جائیگا۔

دارالحرب میں بھیجنے سے پہلے لشکر کے شرکاء کی تعداد اس بناء پر شمار کی جائیگی تا کہ ان کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم ان کے استحقاق کے مطابق ہو پس جو مجاہد سوار ہو کر دارالحرب میں جائے پھر اس کے بعد اس کا گھوڑا مر جائے تو اسے سوار والا حصہ ملے گا، اسی طرح حصول غنیمت سے پہلے یا بعد میں دشمن اس کو گرفتار کر لے تو بھی یہی حکم ہے۔اور اگر وہ اپنا گھوڑا فروخت کر دے یا ہبہ کر دے یا اسے رہن رکھ دے یا گھوڑا بوڑھا ہو یا بیمار ہو یا گھوڑے کا بچھڑا ہو جس پر سوار ہو کر قتال کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے پیادہ والا حصہ ملے گا۔اور اگر قتال کے بعد اس کو بیچ دیا تو اسے سوار والا حصہ ملے گا، کیونکہ اصل مقصود تو حاصل ہو چکا ہے۔

مال غنیمت کی تقسیم پانچ حصوں پر مبنی ہوگی، جن میں سے چار حصے غانمین کے ہوں گے، سوار کے لئے دو حصے اور پیادہ کے لئے ایک حصہ۔قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] [سنن ابی داؤد: ۱۵۲/۳]

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ" [الانفال:۴۱]

"اور جان لو کہ مالِ غنیمت کے طور پر تمہیں جو کچھ حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے پانچواں حصہ تو ان مذکورہ اصناف کا بتایا ہے اور باقی چار حصے غانمین (غازیانِ اسلام) کے ہیں جس پر لفظ "غَنِمْتُمْ" دلالت کر رہا ہے یعنی جو کفار پر غلبہ پانے کی وجہ سے اس کے مستحق ہوئے ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سوار کو تین حصے ملیں گے، اس لئے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوار کو تین حصے دیئے، ایک حصہ اس کا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے۔"[1] دوسری وجہ یہ ہے کہ گھوڑے کی مشقت آدمی کی مشقت سے زیادہ ہوتی ہے۔ پس ضروری ہوا کہ اس کا حصہ زیادہ ہو۔ نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑے کے دو حصے اور اس کے سوار کے لئے ایک حصہ مقرر کیا۔[2] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ گھوڑا حصے کا مستحق نہ ہو، کیونکہ گھوڑا دیگر آلات کی طرح حرب کا آلہ ہے، جیسے نیزے، کمان، تلوار، لیکن حدیث کی بناء پر قیاس کو ترک کر دیا گیا اور احادیث اس بارے مختلف ہیں۔ بعض احادیث میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوار کو تین حصے دیئے اور بعض میں ہے کہ سوار کو دو حصے دیئے۔ چنانچہ حضرت مجمع بن جاریہ (ایک قاری ہیں) فرماتے ہیں کہ ہم حدیبیہ میں موجود تھے۔ جب ہم واپس ہوئے تو دیکھا کہ لوگ اپنے اونٹوں پر جھوم رہے تھے..... الحدیث، اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے سامنے یہ آیت پڑھی:

"اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا" [الفتح:۱]

"ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے واسطے صریح فیصلہ۔"

تو ایک آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں، خدا کی قسم! پھر خیبر کو اہل خیبر پر تقسیم کر دیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سولہ حصوں میں تقسیم کیا۔ لشکر کی تعداد پندرہ سو تھی۔، جن میں تین سو سوار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوار کو دو حصے اور پیادلہ کو ایک حصہ دیا۔"[3] اور ایک روایت میں ہے کہ اس کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا۔

اگر اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا ہو تو اس صورت میں تخریج اس طرح ہوگی کہ پیدل حضرات بارہ سو ہوں گے جن کے بارہ حصے ہوں گے، ہر سو کا ایک حصہ اور سوار تین سو ہوں گے، جن

---

[1] [سنن ابی داؤد:۳/۷۵] [2] [صحیح البخاری:۵۸۱] [3] [المستدرک:۲/۱۳۱]

کے تین حصے ہونگے، ہر سو کا ایک حصہ، پھر اس کو دگنا کریں گے، کیونکہ ہر سوار کو دو حصے ملتے ہیں پس یہ چھ حصے ہوں گے، اس کو بارہ میں جمع کریں گے تو اٹھارہ حصے ہو جائیں گے۔ پس سوار کا تہائی اور پیدل کے دو تہائی ہوں گے۔

ضباعہ بنت زبیر رضی اللہ عنہا، حضرت مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں کہ "وہ (مقداد رضی اللہ عنہ) بدر کی لڑائی میں سبحہ نامی گھوڑے پر سوار تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دو حصے دیئے، ایک حصہ ان کے گھوڑے کا اور ایک حصہ ان کا"[1] جب روایات مختلف ہوئیں تو مختلف فیہ امر ساقط ہوگا اور متفق علیہ امر ثابت ہوگا۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ فارس (گھڑ سوار) کا انتفاع فرس (گھوڑا) کے انتفاع سے زیادہ ہے کہ گھوڑا خود تنہا لڑ نہیں سکتا اور گھڑ سوار خود تنہا بھی لڑ سکتا ہے، لہٰذا گھوڑا، گھڑ سوار سے زیادہ حصے کا مستحق نہیں ہوگا۔ اسی بناء پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کسی جانور کو کسی انسان پر فوقیت حاصل نہیں ہے اور اس کے علاوہ حدیث صحیح بھی وارد ہے کہ خیبر کا مال غنیمت تقسیم کیا گیا تو سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک حصہ دیا گیا اور گھوڑے کے سوا اور کسی چیز کا حصہ نہیں ہے اور پھر ایک ہی گھوڑے کا حصہ دیا جائیگا کیونکہ دو گھوڑوں پر سوار ہو کر قتال کرنا ممکن نہیں ہے۔

عجمی گھوڑا، خاص عربی گھوڑا، ہجین (جس کی ماں عربی گھوڑی ہو) اور مقرب (جس کا باپ عربی گھوڑا ہو) سب برابر ہیں۔ کیونکہ لفظ خیل (گھوڑا) کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس غازی کو دو گھوڑوں کا حصہ دیا جائے گا جب وہ میدان کارزار میں دو گھوڑوں کے ہمراہ وارد ہو، ان کی دلیل حضرت بشیر بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے میرے دو گھوڑوں کے چار حصے اور ایک میرا حصہ دیا پس میں نے پانچ حصے لئے۔"[2]

مال غنیمت میں سے کسی بچے کو یا کسی عورت کو حصہ نہیں دیا جائے گا، لیکن اگر بچے نے قتال میں شرکت کی ہو اور عورت نے زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کی ہو یا کسی ذمی نے مسلمانوں کی کسی طرح مدد کی ہو، دشمن کے ٹھکانے یا راستے کے بارے معلومات فراہم کی ہوں تو ان کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ دیا جاسکتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نجدہ کے سوال کے جواب میں فرمایا: آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کو جہاد میں لے جاتے تھے، عورتیں زخمیوں کا علاج کرتی تھیں اور انہیں مال غنیمت میں سے کچھ دے دیا کرتے تھے، البتہ ان کے لئے (باقاعدہ) حصہ مقرر نہیں کرتے تھے۔"[3]

---

[1] [معجم الطبرانی: ۶۱۳/۲] [2] [سنن الدارقطنی: ۱۰۴/۴] [3] [صحیح مسلم: ۱۴۴۴/۳]

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی قینقاع کے یہودیوں سے تعاون حاصل کیا تو ان کو کھانے کے لئے کچھ دے دیا۔ (مال غنیمت میں سے) ان کو حصہ (مقررہ) نہیں دیا''[1] نیز یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کو رد کیا اور ان سے تعاون حاصل نہیں کیا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کے میدان میں نکلے، یہاں تک کہ جب حرۃ الوبر مقام پر پہنچے تو ایک مشرک آدمی ملا اور اس نے اپنی جرأت کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ واپس ہو جاؤ، ہم کسی مشرک سے تعاون ہرگز حاصل نہیں کریں گے۔''[2]

حضرت عمیر مولی ابی اللحم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے سرداروں کے ہمراہ خیبر میں شریک ہوا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میرے بارے میں بات کی، تو مجھے حکم دیا گیا اور میرے گلے میں تلوار لٹکائی گئی جسے میں کھینچتا ہوں، مجھے بتایا گیا کہ میں غلام ہوں، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے لئے معمولی سے سامان کا حکم دیا۔[3]

خمس کی تقسیم

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ'' [الحشر:۷] ''جو مال لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے سو اللہ کے واسطے اور رسول اور قرابت والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافر کے'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ سورۂ حشر کی آیت میں فیٔ کا مصرف بیان کیا گیا کہ مال فیٔ ان لوگوں کا حق ہے، پھر سورۃ الانفال کی اس آیت میں اسے منسوخ کر دیا گیا، ارشاد فرمایا: ''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ'' [الانفال: ۴۱]۔ سورۃ الانفال کی اس آیت نے ماقبل کے حکم کو منسوخ کر دیا اور خمس کا حق ان کے لئے مقرر کر دیا جن کا مال فیٔ میں حصہ ہے اس کا ذکر سورۃ الحشر کی آیات میں آیا ہے۔ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے جائیں گے، جن میں سے چار حصے جہاد کرنے والوں کے ہوں گے اور باقی پانچواں حصہ پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائیگا، پس ایک خمس (۱/۵) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے اور ایک خمس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابت داروں کا (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں) اور ایک خمس یتیموں کا ار ایک خمس محتاجوں کا اور

---

[1] [نصب الرایۃ: ۳/۴۲۲] [2] [سنن الترمذی: ۳/۵۸] [3] [سنن الترمذی: ۳/۵۸]

ایک خمس مسافروں کا، وفات رسولؐ کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابت داروں کے حصوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صدقے کے طور پر جہاد میں صرف کیا۔[1] قرابت داروں کا حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت و مدد کرنے پر بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ملتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جب وفات ہوگئی تو نصرت بھی زائل ہوگئی اور پھر قرابت دار فقر کی بناء پر مستحق ٹھہرتے تھے۔ جن میں للذکر مثل حظ الانثیین (لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ) کے قاعدے کے تحت حصہ کو تقسیم کیا جاتا تھا، ان کے علاوہ کسی کو کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے مجھے خبر دی کہ جب خیبر کا معرکہ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذوی القربیٰ میں بنو ہاشم اور بنو مطلب کو حصہ دیا اور بنو نوفل اور بنو عبد شمس کو نہیں دیا، پس میں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! ہم بنو ہاشم کے فضل و مرتبہ کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان میں سے بنایا ہے، لیکن ہمارے بھائی بنو مطلب کا کیا حال ہے کہ آپ نے ان کو حصہ دیا اور ہمیں نہیں دیا، حالانکہ ہماری قرابت تو ایک ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں اور بنو مطلب نہ زمانہ جاہلیت میں ہم جدا تھے اور نہ زمانہ اسلام میں، ہم اور وہ ایک چیز ہیں۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذوی القربیٰ کے حصے کا استحقاق نصرت کی بناء پر تھا قرابت کی بناء پر نہیں تھا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ "آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے صدقہ حلال نہیں، اس لئے ان کے لئے خمس کا پانچواں حصہ رکھا گیا۔[2]

امام زیلعیؒ کہتے ہیں کہ ابو یوسفؒ امام کلبی سے بروایت ابو صالحؒ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں جو خمس تقسیم ہوتا تھا، وہ پانچ حصوں پر مبنی تھا، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک حصہ، ذوی القربیٰ اور یتامیٰ کے لئے ایک ایک حصہ اور محتاجوں کے لئے ایک حصہ اور مسافروں کیلئے ایک حصہ۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اسے (خمس کو) تین حصوں میں تقسم کیا: ایک حصہ یتیموں کے لئے، ایک حصہ محتاجوں کے لئے اور ایک حصہ مسافروں کے لئے۔ اور اس سے پہلے خمس کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔"[3]

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد خمس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک حصہ یتیموں کے لئے اور اس میں ان کا فقیر ہونا شرط ہے اور ایک حصہ محتاجوں کے لئے۔ اور ایک

[1] [تفسیر الطبری ۲۵/۱۸] [2] [نصب الرایۃ: ۴۲۵] [3] [نصب الرایۃ: ۴۲۴]

حصہ مسافروں کے لئے، جن کے پاس مال موجود نہ ہو۔ لہٰذا ذوی القربیٰ میں سے جو فقراء ہوں گے وہ فقراء کے حصے میں داخل ہوں گے اور ذوی القربیٰ میں سے جو یتیم ہوں گے وہ یتامیٰ کے حصہ میں داخل ہونگے اور ذوی القربیٰ میں سے جو محتاج اور مسکین ہوں گے وہ مساکین کے حصہ میں داخل ہوں گے اور ذوی القربیٰ میں سے جو مسافر ہوں گے وہ مسافروں کے حصہ میں داخل ہونگے اور ذوی القربیٰ سے مراد نبی ﷺ کے قرابت والے ہیں اور وہ دیگر یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل (مسافر) پر مقدم ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت "وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ" [الانفال:۴۱] "اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے" میں ذوی القربیٰ کا ذکر پہلے کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جو قرابت دار مال دار ہوں ان کو خمس میں سے نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اس کا استحقاق فقر و حاجت کی بناء پر ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نجدہ کے جواب میں فرمایا تھا جب نجدہ نے ذوی القربیٰ کے حصے کے متعلق ان سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ذوی القربیٰ کون ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کے لئے یہ حصہ ہے۔ آنحضور ﷺ نے ان کو حصہ دیا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کچھ حصہ ہمیں بھی پیش کیا تھا۔ جسے ہم اپنا حق خیال نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ہم نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

جو مسلمان دارالحرب میں قوت کے ساتھ داخل ہو اور وہاں سے کچھ حاصل کرے تو اس کا حکم:

جب مسلمانوں کی ایک جماعت دارالحرب میں داخل ہو اور ان کے پاس قوت مدافعت موجود ہو تو جو مال وہ حاصل کریں گے اس کے پانچ حصے کئے جائیں گے خواہ سربراہ اور حاکم کی اجازت سے حاصل کیا ہو یا اجازت کے بغیر۔ کیونکہ اسے مسلمانوں کی قوت سے حاصل کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ مال غنیمت متصور ہوگا اور اگر ان کے پاس قوت موجود نہ ہو اور مسلمانوں کے حکمران کی اجازت کے بغیر حاصل کیا ہو تو اس کے پانچ حصے نہیں کئے جائیں گے۔ رسول اکرم ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو کھجور کے درختوں کی طرف بھیجا جس کے ذریعے قریش کا گھاٹ لگایا گیا تھا، تا کہ وہ کوئی خبر لے کر آئیں، چنانچہ قریش کا ایک تجارتی قافلے گزرا تو انہوں نے ان کا سارا مال چھین لیا اور جن پر قابو پا سکے ان کو قتل کر دیا، پھر عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے خمس کا حکم نازل ہونے سے قبل اس مال

[1] [سنن ابی داؤد: ۱۳۶/۳]

غنیمت کے پانچ حصے کئے اوران کو اپنے ساتھیوں میں تقسیم کردیا، پھر جب وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا، میں نے تم کو شہر حرام میں قتال کا حکم نہیں دیا تھا، آپ ﷺ نے دو قیدیوں اور اونٹوں کو موقوف رکھا اور اس میں سے کچھ لینے سے انکار فرمایا، یہاں تک کہ جب قرآن میں اس کی حلت کا حکم نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی پریشانی کو دور کردیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان قیدیوں اور اونٹوں کو قبضہ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے اس مال غنیمت کو حلال ہونے کے بعد تقسیم کیا، اللہ کے حکم کے مطابق پانچ حصے کئے، ایک حصہ اللہ ورسول کا اور چار حصے ان کے (جن کا ذکر سورۃ الحشر کی آیت میں ہے: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ......") پس جیسا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ان اونٹوں میں معاملہ کیا تھا ویسا ہی ہوا۔[1]

کفار کا مسلمانوں کے اموال وغیرہ پر غلبہ پانے کا حکم

جب کفار ہمارے اموال پر غلبہ پالیں اوران کو اپنے ملک میں منتقل کرلیں تو وہ ان کے مالک ہوجائیں گے، پھر اگر ہم ان پر غالب آگئے تو جس نے تقسیم غنیمت سے قبل اپنی مملوکہ چیز پائی وہ اسے بلا معاوضہ لے سکتا ہے اور تقسیم کے بعد قیمتاً لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ اگر کوئی تاجر وہاں گیا اور اس نے وہ چیز خرید لی تو اس کا مالک اگر چاہے تو اس کی قیمت ادا کر کے اسے لے سکتا ہے اور اگر چاہے تو نہ لے اور اگر اس کو وہ چیز ہبہ کے طور پر دی گئی ہو تو وہ اس کو قیمتاً لے گا۔ جیسا کہ قبیصہ بن ذؤیب سے روایت آئی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں فرمایا: "اگر اس چیز کا مالک تقسیم غنیمت سے قبل پالے تو وہ چیز اسی کی ہوگی۔ اور جب اس پر تیر چلے ہوں تو پھر اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

رجاء بن حیوہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ دشمنوں نے مسلمانوں کے جو اموال اپنے قبضہ میں لے لئے ہوں پھر مسلمانوں کو وہ حاصل ہوجائیں تو جب تک مال غنیمت تقسیم نہ ہو اس مال کو اس کے مالک کے حوالے کردو۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سائب بن الاقرع رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ جو مسلمان بعینہٖ اپنا غلام اور مال پائے تو وہ اس کو لینے کا زیادہ حقدار ہے، لیکن اگر تقسیم ہونے کے بعد تاجروں کے قبضہ میں پائے تو پھر اس کو لینے کی کوئی صورت نہیں ہے۔[2]

سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ حضرت زین بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: "دشمن مسلمانوں کا جو مال اپنے قبضے میں لے لے پھر وہ مال چھڑا لیا جائے اور اس مال کا

---

[1] [سنن ابی داؤد: ۱۴۶/۳] [2] [سنن البیہقی: ۱۱۲/۵]

مالک تقسیم سے پہلے اپنے مال کو پہچان لے تو اس کو لوٹا دیا جائے گا اور اگر نہ پہچانے اور مال غنیمت تقسیم ہو جائے تو پھر نہیں لوٹایا جائے گا۔"[1]

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک غلام بھاگ گیا اور ایک گھوڑا (دشمنوں کی طرف) چلا گیا اور مشرکین نے ان دونوں پر قبضہ کرلیا، پھر وہ دونوں چیزیں مسلمانوں کو غنیمت سے حاصل ہوئیں تو وہ دونوں چیزیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو واپس کر دی گئیں اور ابھی مال غنیمت تقسیم نہیں ہوا تھا۔[2]

اہل حرب کا ایک دوسرے کے اموال پر غلبہ پانا

اگر اہل حرب میں سے کچھ لوگ دوسروں پر غالب آئیں اور ان کے اموال کو چھین لیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے، پھر اگر ہم ان پر غالب آئے تو دوسرے اموال کی طرح ان اموال کے بھی مالک ہوں گے اور وہ ہمارے آزاد لوگوں کے مالک نہ ہوں گے، کیونکہ اولاد آدم میں حریت (آزادی) اصل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ" [الاسراء:۷۰] "اور ہم نے اولاد آدم کو عزت دی ہے۔"

مسلمانوں کا دارالحرب میں جانا اور حربی کا دارالاسلام میں آنا

اگر مسلمان دارالحرب میں امان لے کر داخل ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اہل حرب کی جان و مال سے تعرض کرے۔ کیونکہ ایسا کرنا ان کے ساتھ عہد شکنی کرنا ہوگا اور عہد شکنی سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے، لیکن اگر اس نے ان کی کوئی چیز اخذ کی اور اس کو نکال لایا تو اسے صدقہ کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ (مسلمان) اس چیز کا امر ممنوع کے ساتھ مالک ہوا ہے، اور وہ امر ممنوع عہد شکنی اور خیانت ہے۔ اب اس کی صورت یہی ہے کہ اسے صدقہ کر دیا جائے، کیونکہ یہ ملک خبیث ہے۔ اسیر کا حکم اس کے برخلاف ہے، کیونکہ اسیر (قیدی) مستامن نہیں ہوتا اور اس نے ان (اہل حرب) کے ساتھ تعرض نہ کرنے کا التزام نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے تعرض جائز ہوگا، خواہ وہ اس کو رہا کر دیں۔ حربی کو دارالاسلام میں مستقل طور پر اقامت اختیار کرنے کا حق نہیں دیا جائے گا، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کے مخفی امور سے مطلع ہو کر دشمن کو ان سے آگاہ کر دے۔ البتہ تھوڑی مدت کے لئے روکا نہیں جائیگا۔ اس کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ

[1] [سنن البیہقی:۹/۱۱۳] [2] [الموطا:۱/۳۰۰]

ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ'' [التوبۃ:٦]

''اور اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دیدو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر اس کو امن والی جگہ میں پہنچا دو۔''

اگر حربی کو مطلقاً منع کیا جائے گا تو اس سے تجارت اور لین دین کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ ہمارے تاجروں کو بھی اپنے ملک میں داخل ہونے سے روک دیں، اس سے بہت سی خرابیاں لازم آتی ہیں۔ لہٰذا جب کثیر المیعاد کے لئے قیام جائز نہیں اور قلیل المیعاد کے لئے جائز ہے تو ان دونوں میں کوئی حد فاصل کا ہونا ضروری ہے، پس اس حد فاصل کا اندازہ ایک سال کے ساتھ لگایا گیا ہے لہٰذا جب وہ حربی ایک سال قیام کرلے اور اس کے بعد مزید رہنے کا خواہش مند ہو تو اسے دارالحرب واپسی کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لئے مضرت ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ اہل الذمہ والا معاملہ کیا جائیگا۔ اہل ذمہ پر جو جزیہ (ٹیکس) وغیرہ عائد کیا جاتا ہے وہی اس پر عائد کیا جائے گا، اگر وہ خراجی زمین خرید لے اور اس زمین کا خراج ادا کرے تو اس میں اقامت پذیر ہونے اور خراج کی ادائیگی کے باعث ذمی ہو جائے گا۔

اگر حربیہ عورت کسی ذمی سے شادی کرلے تو وہ ذمیہ ہو جائے گی اور اگر حربی مرد کسی ذمیہ سے شادی کرلے تو وہ ذمی نہیں بنے گا۔

اگر کوئی کافر دارالحرب سے امان طلب کر کے دارالاسلام میں آ گیا اور کچھ وقت قیام کر کے اپنے وطن (دارالحرب) واپس چلا گیا جب کہ اس کا مال بطور امانت یا بطور قرض دارالاسلام کے کسی باشندے (مسلمان یا ذمی) کے پاس موجود ہے تو واپس لوٹنے سے اس (حربی) کا خون بہانا جائز ہوگا، کیونکہ وطن واپس چلے جانے سے اس کی امان باطل ہوگئی، دریں صورت دارالاسلام میں اس کا چھوڑا ہوا مال (بطور امانت یا بطور قرض) اس کا مملوکہ نہ ہوگا، اگر وہی حربی جو پہلی مرتبہ مستأمن کی حیثیت سے داراسلام میں داخل ہوا تھا، اہل اسلام کے ہاں قید ہوا یا مسلمانوں نے دارالحرب پر غلبہ حاصل کرتے وقت یا اس کے بعد قتل ہوگیا تو داراسلام کے جس باشندے (مسلمان یا ذمی) پر اس کا قرض تھا وہ ساقط ہو جائے گا اور بطور امانت چھوڑا ہوا مال ''غنیمت'' متصور ہوگا، کیونکہ وہ مال فی المعنی اسی (مقتول حربی) کے قبضہ میں متحقق ہوگا، اس لئے کہ اس (حربی) نے اپنا مال از خود امین یا مودع کے پاس رکھا تھا، جبکہ بطور قرض چھوڑا ہوا مال ساقط ہو جائے گا، بایں وجہ کہ قرض کا تحقق مطالبے کے توسط سے ہوتا ہے اور وہ (مطالبہ) حربی کے قتل کی صورت میں زائل ہو جاتا ہے، چنانچہ اس طرح قرض بھی ساقط ہونے پر عام مسلمانوں کے قبضہ کی

مانند پہلے سے ہی اس کے (مقروض کے) قبضہ میں ہے۔ لہٰذا بطور قرض چھوڑا ہوا مال مقروض (مسلمان یا ذمی) کے ساتھ مخصوص ہو جائیگا۔

جزیہ کی اقسام

جزیہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) جو باہمی رضا مندی و صلح کے ساتھ عائد کیا جائے، اس کو جزیہ صلحی کہتے ہیں، جس مقدار پر باہمی اتفاق ہوا ہو اس سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔ (۲) جو جزیہ سربراہ مملکت ابتداء کر کے کافروں پر عائد کرے، جب کہ مسلمان حکمران کفار پر غلبہ پا کر انہیں (کفار کو) ان املاک پر برقرار رکھے۔ اسے جزیہ قہری کہتے ہیں۔

اگر اسلامی حکومت کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ صلح اختیار کر لے تو اسے چاہئے کہ وہ باہمی رضامندی کے ساتھ طے شدہ "جزیہ" پر عمل پیرا ہو، کیونکہ اس امر میں اصل موجب کا تحقق باہمی رضامندی پر مبنی ہے۔ لہٰذا (جزیہ صلحی میں) طے شدہ معاملے سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہوگا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے صلح کرتے وقت ایک ہزار دو سو جوڑوں پر صلح کی تھی، اس شرط کے ساتھ کہ نصف حلے (جوڑے) صفر المظفر کے مہینہ میں ادا کیا کریں اور نصف ماہ رجب المرجب میں اور مسلمانوں کو تیس گھوڑے، تیس زرہ، تیس اونٹ اور تیر وتفنگ تلواریں و نیزے وغیرہ بھی قابل واپسی کی شرط کی بنیاد پر دینے ہونگے...... الحدیث"۔[1]

اگر جہاد وقتال کے ذریعے مجاہدین اسلام نے کفار پر غلبہ پایا اور سربراہ مملکت نے اپنے اختیار سے جزیہ عائد کیا تو اس (جزیہ قہری کی) صورت میں ایسے مال دار پر جس کا مالدار ہونا واضح اور ظاہر ہو تو سالانہ اڑتالیس درہم بحساب ماہانہ چار درہم فی کس جزیہ مقرر کیا جائے گا، جب کہ متوسط طبقہ سے سال بھر میں چوبیس درہم، بحساب ماہوار دو درہم ہر ایک فرد پر جزیہ عائد کیا جائیگا اور نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر سالانہ بارہ درہم بحساب ایک درہم ماہوار فی کس جزیہ لاگو کیا جائے گا۔ مال دار پر جو جزیہ عائد ہوتا ہے یعنی سالانہ اڑتالیس درہم، وہ موجودہ حساب کے مطابق ایک سو انتالیس (۱۳۹) گرام چاندی کے وزن کے برابر ہوتا ہے اور متوسط درجے کے آدمی پر لاگو ہونے والا جزیہ یعنی چوبیس درہم، آج کے حساب کے مطابق ۶۹.۵ گرام چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ نچلے درجہ کے آدمی پر لاگو ہونے والا جزیہ یعنی بارہ درہم آج کے حساب کے مطابق ۲۴۸/۱۰ گرام چاندی کے برابر ہوتے ہیں۔ اور جزیہ سال کے شروع میں واجب ہوگا اور ہر ماہ اس کا حصہ لیا جائیگا۔

---

[1] [سنن ابی داؤد: ۱۶۷/۳]

مال دار، متوسط اور فقیر کی تعریف میں اختلاف ہے۔قول مختار یہ ہے کہ ہر شہر کے باشندوں کی حالت کو دیکھا جائے گا کہ وہ اس معاملے میں کس چیز کا اعتبار کرتے ہیں (یعنی ہر شہر کا عرف عام معتبر ہے) جس کے پاس مال کثیر ہو وہ مالدار ہے۔ بعض کہتے ہیں مال دار وہ ہوگا جو دس ہزار دراہم کا مالک ہو، پھر جو آدمی سال کے اکثر حصے میں مالدار رہا اس سے مالداروں والا جزیہ وصول کیا جائیگا اور اگر اکثر حصے میں فقیر رہا تو اس سے فقراء والا جزیہ وصول کیا جائیگا۔اور جو شخص سال کے اکثر حصے میں بیمار رہا اس سے جزیہ نہیں لیا جائیگا۔ کیونکہ مریض کام کرنے کی قدرت (طاقت) نہیں رکھتا۔ اگر نصف سال بیمار رہا پھر بھی یہی حکم ہے۔ اگر سال کا اکثر حصہ تندرست رہا تو اس کے ذمہ جزیہ ہوگا۔ کیونکہ اکثر پر کل کا حکم لگایا جاتا ہے۔ متوسط الحال وہ شخص ہے جس کے پاس مال ہو لیکن وہ اس کی وجہ سے کام کرنے سے بے پرواہ نہ ہو۔ اور فقیرِ معتمل وہ ہے جو کسی بھی صورت سے تحصیل مال پر قدرت رکھتا ہو، اگرچہ کسی ہنر یا پیشہ سے مکمل طور پر شناسا نہ ہو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ فقیر سال کے اکثر حصے میں تندرست رہا ہو، لیکن جو فقیر معتمل نہ ہو، احناف کے نزدیک اس پر جزیہ واجب نہیں ہے۔

جزیہ کس پر عائد کیا جائے گا؟

جزیہ ان لوگوں پر عائد کیا جائے گا: (۱) اہل کتاب (۲) عرب کے مجوسی (۳) عجم کے بت پرست لوگ۔

اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) پر جزیہ اس آیت کریمہ کی بناء پر عائد ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلاَ يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" [التوبۃ:۲۹]

"ان لوگوں سے قتال کرو جو لوگ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کو نہیں مانتے اور ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ اور نہ ہی دین حق کو اختیار کرتے ہیں اہل کتاب میں سے (ان سے قتال کرو)۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اس حال میں کہ وہ زیر نگین ہوکر رہیں۔"

مجوسیوں سے جزیہ لینے کی دلیل یہ ہے کہ جب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر

فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے اس بات کی گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ وصول کیا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے جزیہ لیا۔[1]

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوفرماتے ہوئے سنا کہ سنّوا بهم سنّة اهل الكتاب'' یعنی مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب والا طریقہ اختیار کرو، اس شرط پر کہ ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے گا اور ان کی عورت سے نکاح نہ کیا جائیگا۔[2]

اور عجم کے بت پرستوں پر جزیہ کے وجوب کی دلیل حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ جس وقت حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے عامل سے گفتگوفرمائی تو اس میں یہ بھی تھا کہ ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارے رب کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ قتال کریں جب تک کہ تم اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت نہ کرنے لگو یا جزیہ نہ ادا کردو......الحدیث[3]

جن پر جزیہ عائد نہیں کیا جائے گا

جن لوگوں پر جزیہ عائد نہیں ہوگا، وہ یہ ہیں: (۱) عرب کے بت پرست (۲) مرتدین (۳) عورت، بچہ اپاہج اور اندھا۔ (۴) فقیر غیر معتمل ۔ اب ہر ایک کے دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

عرب کے بت پرستوں پر جزیہ اس لئے عائد نہیں کیا جائے گا کہ ان کو غلام بنا کر یا جزیہ لے کر کفر پر برقرار رکھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ان کا کفر زیادہ قبیح اور شدید ہے۔

اہل عرب نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انہوں نے تکذیب کی اور وطن سے بے وطن کیا، پس ان کی سزا بھی سخت ہوئی کہ ان سے صرف دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ قتال کیلئے تیار ہو جاؤ۔ یعنی اسلام یا تلوار۔

مرتدین سے جزیہ نہ لینے کی دلیل یہ آیت ہے:

''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ'' [آل عمران:۹۰]

''بے شک جولوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھ گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائیگی اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔''

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ بدّل دينه فاقتلوه''[4] یعنی جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس

---

[1] [صحیح البخاری:۶۴۴] [2] [سنن البیہقی:۹/۱۹۰]
[3] [صحیح البخاری:۶۴۴] [4] [صحیح البخاری:۶۱۱]

کوقتل کردو۔‘‘

نیز محزن بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”من بدل دینه فاقتلوه، لایقبل اللّٰه توبة عبد کفر بعد اسلامه“[1] ”جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اس کو قتل کردو، اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی توبہ قبول نہیں کرتے جو مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جائے۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”تقتل المرتدة“ یعنی مرتدہ عورت کو قتل کیا جائے گا۔“

عورت، بچے، دیوانے، اپاہج، معذور اور اندھے اور بہت بوڑھے آدمی سے جزیہ اس لئے نہیں لیا جائیگا کہ جنہیں قتل کی سزا نہیں دی جاتی ان سے جزیہ بھی نہیں لیا جاتا، یہ وہ لوگ ہیں جن کو قتل کرنا جائز نہیں ہے لہٰذا ان کے ذمہ جزیہ بھی نہیں ہوگا۔

اسلم مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جزیہ کے امراء کے نام یہ حکم نامہ ارسال کیا: ”جزیہ ان ہی پر لاگو کیا جائے جنہوں نے نصرت و مدد کی ہو اور عورتوں اور بچوں پر جزیہ لاگو نہ کیا جائے۔“[2]

اور فقیر غیر معتمل سے جزیہ اس لئے نہیں لیا جائے گا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فقیر کے معتمل ہونے کی شرط لگائی ہے، چنانچہ صلہ بن زفر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بہت بوڑھے ذمی کو دیکھا، اس سے پوچھا کہ تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ مجھ سے جزیہ لیا جاتا ہے، حالانکہ میرے پاس مال نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا، ہم نے تیرے بڑھاپے کا خیال نہیں کیا، تجھ سے جزیہ لیتے رہے، پھر اپنے عاملوں (گورنروں) کو لکھا کہ بہت بوڑھے آدمی سے جزیہ نہ لیا کرو۔

جزیہ کب ساقط ہوتا ہے؟

جزیہ مرنے یا اسلام قبول کرنے سے ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ جزیہ کی مشروعیت کافر کو کفر سے روکنے اور اسلام کی طرف آمادہ کرنے کے لئے ہوتی ہے، مرنے یا اسلام قبول کرنے کے بعد اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پس جس کے ذمے جزیہ کی ادائیگی ہو وہ مسلمان ہو جائے یا فوت ہو جائے تو اس سے جزیہ بوجہ مذکورہ ساقط ہو جائے گا، اور اس کے ترکے سے نہیں لیا جائے گا۔

---

[1] [معجم الطبرانی: ۳۱۹/۱۹] [2] [سنن البیہقی: ۱۹۸/۹]

اگر اس پر دو سال کا جزیہ جمع ہو جائے اور سابقہ جزیہ کو ادا نہ کیا ہو تو ایک جزیہ دوسرے میں داخل ہو جائے گا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حدود کی طرح ایک ہی جزیہ پر اکتفاء کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے دو جزیے وصول کئے جائیں گے۔

اہل ذمہ

اہل ذمہ کے لئے ضروری ہے کہ ان معاہدات کی پاسداری کریں جو انہوں نے مسلمانوں سے جان و مال وغیرہ کے تحفظ کے سلسلہ میں کئے ہیں اس شرط پر کہ وہ مسلمانوں کی حرمتوں کا خیال رکھیں گے۔ ان کے دین اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے حرمتی نہیں کریں گے۔

سوید بن غفلہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس تھے جب وہ امیر المؤمنین کی حیثیت سے ملک شام میں موجود تھے کہ آپ کی خدمت میں ایک نبطی شخص لایا گیا جسے بہت مارا گیا تھا اور وہ شدید زخمی تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت غصہ آیا، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ دیکھو! اس نبطی کا ذمہ دار کون ہے؟ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ اس کے افسر عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ ہیں، صہیب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ امیر المؤمنین سخت غصے میں ہیں، اگر تم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ہمراہ دربار فاروق میں جاؤ تو بہتر ہے، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں سزا نہ دیدیں، چنانچہ عوف بن مالک رحمۃ اللہ علیہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ہمراہ آئے، جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ صہیب رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ امیر المؤمنین! میں حاضر ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا تم اس آدمی کو لے آئے ہو جس کو اس نے مارا ہے؟ صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا کی جی ہاں۔ پھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ امیر المؤمنین! یہ عوف بن مالک ان کے ذمہ دار ہیں، ان کی بات پہلے سن لیجئے، جلدی نہ فرمائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے اس کا یہ حال کیوں کیا؟ حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، اے امیر المؤمنین! میں نے اسے دیکھا تھا کہ یہ ایک مسلمان عورت کو ہانکے لے جارہا تھا کہ اس نے اس عورت کو گرانے کے لئے گدھے کو تیز دوڑایا لیکن وہ نہیں گری، پھر اس کو دھکا دے کر گدھے سے گرادیا، پھر اس کے ساتھ اس نے جماع کیا، پس میں نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عورت کو اپنی تصدیق کے لئے پیش کرو۔ چناں چہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ اس عورت کے پاس گئے اور اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات ذکر کی تو اس عورت کے والد اور شوہر نے کہا کہ تم نے اس کو رسوا کردیا،

ہم نہیں بھیجیں گے، عورت کہنے لگی کہ خدا کی قسم! میں اس کے ساتھ امیر المؤمنین کے پاس ضرور جاؤں گی، جب اس عورت نے اصرار کیا تو اس کے والد اور شوہر نے کہا کہ اچھا! ہم تیری طرف سے امیر المؤمنین کو پیغام پہنچا دیں گے، پس وہ دونوں دربار فاروقی میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی بات کی تصدیق کی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس یہودی سے فرمایا کہ ہم نے اس پر تمہارے ساتھ معاہدہ نہیں کیا تھا، پھر اس کو سولی دینے کا حکم دیا، پس اسے سولی پر لٹکا دیا گیا، اس کے بعد فرمایا: لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد و امان کی پاسداری کرو، جس نے عہد شکنی کی اس کے لئے کوئی ذمہ (امان) نہیں ہے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل الذمہ کے صلح وعہد کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے بشرطیکہ وہ عہد توڑنے کی جرأت نہ کریں، اگر کوئی ذمی اپنے عہد کو توڑے گا، تو پھر عہد برقرار نہیں رہے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودیہ عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کیا کرتی تھی، ایک دن گستاخی کی تو ایک آدمی نے اس کا گلہ گھونٹ کر اس کو مار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عورت کا خون رائیگاں قرار دے دیا۔[2]

عرفہ بن حارث الکندی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک نصرانی کا ان کے پاس سے گزر ہوا۔ انہوں نے اس کو اسلام کی طرف دعوت دی تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی شروع کر دی۔ عرفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس کی ناک توڑ دی، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمروؓ نے کہا کہ ہم نے (جان و مال کے تحفظ کا) ان کے ساتھ عہد کیا ہے۔ (تم نے ایسا کیوں کیا؟) عرفہ نے کہا کہ اللہ کی پناہ! کیا ہم نے ان لوگوں کو اس بات کی امان دی ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کی شان میں گستاخیاں کرتے پھریں؟ ہم نے تو ان کے ساتھ یہ معاہدہ کیا ہے کہ ہم ان کے اور ان کے عبادت خانوں کے درمیان حائل نہ ہوں گے، وہ اپنے عبادت خانوں کے اندر جو چاہیں کریں گے، اور یہ کہ ہم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالیں گے اور یہ کہ اگر کوئی دشمن ان کو گزند پہنچانے کا ارادہ کرے گا تو ہم ان کے ساتھ لڑیں گے۔ اور یہ کہ ہم ان کے اور ان کے احکام کے مابین رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ الا یہ کہ وہ ہمارے احکام پر راضی ہو جائیں، پس ہم ان کے درمیان اللہ کے حکم اور اس کے رسولؐ کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں گے اور اگر انہوں نے ہم سے کچھ چھپایا تو ہم اس میں ان کے درپے نہ ہونگے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ تم نے سچ کہا۔[3]

---

[1] [سنن البیہقی: ۹/۲۰۱] [2] [سنن البیہقی: ۹/۲۰۰] [3] ایضاً

اہل ذمہ کی شرائط

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جس شہر کو مسلمانوں نے آباد کیا ہو اس شہر میں کوئی معبد اور گرجا تعمیر نہ کیا جائے گا۔ اور نہ ہی اس میں ناقوس بجایا جائے گا اور نہ ہی اس میں خنزیر کا گوشت فروخت کیا جائے گا اور جس شہر کو عجمیوں نے آباد کیا ہو تو عرب پر لازم ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ طے شدہ عہد کو پورا کریں اور ان کو ایسے کام کی تکلیف نہ دیں جس کام کی ان میں طاقت نہ ہو۔

اہل شام کے ساتھ صلح کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صلح نامہ

عبدالرحمٰن بن غنم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اہل شام کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا تو میں نے آپ کے لئے یہ معاہدہ صلح تحریر کیا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ اللہ کے بندے عمر امیر المومنین (رضی اللہ عنہ) کے لئے فلاں فلاں شہر کے نصاریٰ کی طرف سے تحریری معاہدہ ہے کہ جب آپ لوگ ہمارے پاس آئے تو ہم نے آپ سے اپنی جانوں، اپنی اولاد اپنے اموال اور اپنی ملت والوں کے لئے امان طلب کی اور ہم نے اپنی جانوں کے تحفظ کے لئے یہ معاہدہ کیا ہے کہ ہم اپنے شہر اور اس کے گرد و نواح میں کوئی نیا معبد، گرجا گھر یا راہب کے لئے نیا عبادت خانہ نہیں بنائیں گے اور جو ان میں سے خراب و خستہ ہو گیا ہے اس کی تعمیر نو نہیں کریں گے اور مسلمانوں کی حدود میں ان میں سے کوئی چیز بھی آباد نہیں کریں گے اور یہ کہ ہم کسی مسلمان کو دن رات کسی وقت بھی اپنے عبادت خانوں میں آنے سے نہیں روکیں گے۔ اور ان عبادت خانوں کے دروازے مسافروں اور راہ گیروں کے لئے کشادہ نہیں کریں گے اور یہ کہ ہم آنے والے مسلمانوں کی تین دن مہمان نوازی کریں گے اور ان کو کھانا کھلائیں گے۔ اور یہ کہ ہم اپنے گرجا گھروں اور اپنے مکانات میں کسی جاسوس کو امان نہیں دیں گے اور مسلمانوں سے کینہ نہیں رکھیں گے اور اپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم نہیں دیں گے اور یہ کہ ہم شرک کا اظہار نہیں کرینگے اور شرک کی طرف کسی کو دعوت نہیں دیں گے اور اپنے کسی رشتہ دار کو اسلام قبول کرنے سے منع نہیں کریں گے اگر وہ مسلمان ہونے کا خواہش مند ہو۔ اور یہ کہ ہم مسلمانوں کی توقیر کریں گے اگر مسلمان آکر بیٹھنا چاہیں تو ہم ان کے لئے اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہونگے اور یہ کہ ہم مسلمانوں کے لباس، ٹوپی، عمامہ اور جوتے پہننے اور مانگ نکالنے میں ان کے ساتھ مشابہت اختیار نہیں کریں گے اور ان کی زبان نہیں بولیں گے اور ان جیسی کنیت نہیں رکھیں گے، زین پر سوار نہیں ہونگے، تلواریں نہیں لٹکائیں گے اور

کوئی اسلحہ وہتھیار نہیں رکھیں گے، نہ اپنے ساتھ اٹھائیں گے۔ اور اپنی انگوٹھیوں پر عربی زبان کندہ نہیں کرائیں گے۔ اور شراب نہیں بیچیں گے۔ اور یہ کہ ہم اپنے سروں کے اگلے حصے کے بال کاٹیں گے اور یہ کہ ہم ہر جگہ اپنے لباس کے پابند ہوں گے اور یہ کہ ہم اپنی کمر پر زنار باندھ کر رکھیں گے اور یہ کہ ہم اپنی صلیبیں اور کتابیں مسلمانوں کے راستے میں اور بازاروں میں ظاہر نہیں کریں گے۔ اور یہ کہ ہم اپنے گرجا گھروں پر صلیب کا نشان ظاہر نہیں کریں گے اور یہ کہ ہم مسلمانوں کی موجودگی میں اپنے گرجا گھروں میں ناقوس نہیں بجائیں گے اور یہ کہ ہم اپنے تہوار منانے کے لئے باہر نہیں نکلیں گے اور یہ کہ ہم اپنے مردوں پر آوازیں بلند نہیں کریں گے اور مسلمانوں کے کسی بھی راستے میں ان کے ساتھ آگ کو ظاہر نہیں کریں گے اور ہم اپنے مردوں کو مسلمانوں کے قریب نہیں دفنائیں گے اور جو غلام مسلمانوں کے حصے میں آچکا ہو اس کو نہیں پکڑیں گے۔ اور یہ کہ ہم مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے اور ان کے گھروں میں نہیں جھانکیں گے۔ راوی (عبدالرحمن بن غنم رضی اللہ عنہ کہتے) ہیں کہ جب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس یہ صلح نامہ لے کر حاضر ہوا تو انہوں نے اس میں یہ اضافہ فرمایا: اور یہ کہ ہم کسی مسلمان کو نہیں ماریں گے ہم اس معاہدہ کی جان اور اہل ملت کے تحفظ کی شرط پر پابندی کریں گے اور ہم مسلمانوں کی دی گئی امان کو قبول کرتے ہیں، پس اگر ہم نے اپنے معاہدے کی کسی بھی بات کی خلاف ورزی کی تو ہم خود اپنے ذمہ دار ہوں گے اور ہمارے لئے کوئی ذمہ (امان وعہد) نہیں ہوگا اور پھر تمہارے لئے وہ سب کچھ حلال ہوگا جو معاندین اور مخالفین کے لئے ہوتا ہے۔"[1]

اہل ذمہ کے لئے وصیتیں

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "تم عنقریب ایک ملک کو فتح کرو گے جس ملک میں قیراط کا ذکر ہوگا، پس تم اس ملک کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، کیونکہ وہ امان اور رحم کے اہل ہیں۔"[2] حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک وصیت میں فرمایا: "میں تمہیں اللہ کے لئے دیئے ہوئے عہد وامان کی پاسداری کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ وہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیا ہوا امان اور تمہارے اہل وعیال کا رزق ہے۔"[3] نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اہل ذمہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے، ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدے کو پورا کرے

---

[1] [سنن البیہقی: ۲۰۲/۹] [2] [صحیح مسلم: ۱۹۷۰/۴] [3] [صحیح البخاری: ۳۱۶۲]

اوران کی خاطر قتال کرے اور یہ کہ طاقت سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالے۔''[1]

اہل ذمہ کی خوشیوں میں شرکت کی ممانعت

عطاء بن دینار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عجمیوں کی زبان نہ سیکھو اور تہوار کے دن مشرکین کے عبادت خانوں میں نہ جاؤ، کیونکہ ان پر خدا کی ناراضگی کا نزول ہوتا ہے۔''[2]

حضرت سلمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''خدا کے دشمنوں سے ان کی عید کے دن اجتناب کرو۔''[3]

عبداللہ بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''جو شخص عجمیوں کے شہر تعمیر کرے اور ان کے فیروز اور مرجان (عید اور تہوار کے ایام) میں ان سے میل جول کرے اور ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرے یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مرجائے تو وہ بھی ایسا ہی ہے، قیامت کے دن ان کے ساتھ ہی اس کا حشر ہوگا''[4]۔ البتہ جو شخص ان (ذمی کفار) میں قیام پذیر ہو مگر ان سے محبت نہ کرتا ہو بلکہ انہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہو اور انہیں تادم حیات جہالت کے اندھیرے سے نکالتا رہا ہو وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ جو شخص ان سے محبت و دوستی رکھتا ہو اور ان کے طریقہ کو اختیار کرتا ہو وہ شخص یقیناً قابل مذمت ہے۔

بنو تغلب کے نصاریٰ

بنو تغلب کے نصاریٰ سے، مسلمانوں سے لی جانے والی زکوٰۃ سے دگنا مال وصول کیا جائے گا۔ کیونکہ ان لوگوں نے اس امر پر مصالحت کی تھی کہ وہ مسلمانوں سے لی جانے والی تمام چیزوں سے دگنا ادا کریں گے۔ بنو تغلب نصاریٰ میں ایک قوم ہے جو بلادِ روم کے قریب آباد تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر جزیہ عائد کرنا چاہا تو انہوں نے جزیہ دینے سے انکار کیا اور کہا کہ اگر آپ ہم پر جزیہ لگائیں گے تو ہم آپ کے رومی دشمنوں سے جاملیں گے، اور اگر آپ ہم سے اتنا لیں گے جتنا کہ مسلمان دیتے ہیں بلکہ اس کا دگنا لیں گے تو آپ ایسا کرلیں (ہم تیار ہیں)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو سب نے اسی پر اتفاق کیا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ حقیقت میں جزیہ ہے تم اس کا جو بھی نام رکھو اور جو کچھ ان کے مردوں سے لیا جائے گا وہی ان کی عورتوں اور موالی سے بھی لیا جائے گا۔

---

[1] [صحیح البخاری: ۳۱۶۲] [2] [سنن البیہقی: ۲۳۴/۹] [3] ایضا [4] ایضا

جزیہ اور خراج کے مصارف

جزیہ اور خراج اور بنو تغلب سے جو مال حاصل ہوگا، اسی طرح اہل حرب جو کچھ امام المسلمین کو دیں گے اور ایسی زمینیں جن کے مالکان کو وہاں سے نکال دیا گیا ہو ان (زمینوں) کی پیداوار، یہ سب کچھ مجاہدین کی تنخواہوں اور ان کی اولاد اور پلوں کی تعمیر، قاضیوں، مدرسین، علماء، مفتیان کرام اور دیگر ملازمین کے عطیات میں بقدر کفایت صرف کیا جائے گا۔

پلوں کی تعمیر، مدارس اور شفاخانے وغیرہ تو مصالح عامہ ہیں۔ اور رہے ان کے روزینے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو تعلیم دیتے ہیں، لہٰذا ان کی کفایت کرنا واجب ہوگا۔ اور مجاہدین کو اس لئے دیں گے کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کی نصرت و مدد کے لئے لڑتے ہیں کہ دین کا بول بالا ہو، لہٰذا امام وقت اور دیگر مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی اور ان کی اولاد کی کفایت کا سامان کریں اور قاضی اور دیگر لوگ (علماء، مدرسین اور مفتیان وغیرہ) اس لئے حق دار ہونگے کہ انہوں نے مسلمانوں کے مصالح (مفادات) کے لئے خود کو وقف کر رکھا ہے لہٰذا مسلمانوں کے مصالح و مفادات کی بقاء و قیام کیلئے ان لوگوں کی بھی کفایت لازمی ہوگی۔

اگر خرچ میں کمی ہو جائے تو مسلمانوں کے سربراہ پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں میں مالدار لوگوں پر اتنا مال مقرر کر دے جس سے دوسروں کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔

عشری اور خراجی زمین کی تحقیق

عرب کی ساری زمین عشری ہے اور وہ سرزمینِ عرب طولاً عُذَیب (کوفہ کے ایک گاؤں) سے یمن میں مہرہ کے پتھر تک ہے اور عرضاً ملک شام کی حد تک ہے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عرب کی زمین عذیب سے مکہ، اور عدن اور یمن میں مہرہ کے پتھر کی انتہاء سے حدود شام تک ہے۔

سعید بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''جزیرۂ عرب'' وادی سے انتہائے یمن اور عراق کی حدود سے بحر عرب تک ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہل نجران کو (جزیرۂ عرب سے) نکال دیا تھا لیکن تیماء سے نہیں نکالا تھا کیونکہ وہ (تیماء) بلادِ عرب میں شامل نہیں ہے، اور وادی میں جو یہود موجود تھے ان کو وادی سے بھی نہیں نکالا گیا کیونکہ وادی کو سرزمین عرب میں سے خیال نہیں کیا جاتا تھا۔[1]

لیکن آج کے دور میں وہ تمام اراضی جس کے مسلمان مالک ہیں وہ مسلمانوں کی ملک

---

[1] [سنن ابی داوٗد: ۱۶۶/۳]

ہے، اگر زراعت کی وجہ سے اس (اراضی) سے پیداوار حاصل ہوتی ہو تو اس کی زکوٰۃ نکالی جائے گی اور اس میں احکام زراعت جاری ہونگے اور اگر وہ (اراضی) ایسی نہ ہو یعنی اس سے پیداوار حاصل نہ ہوتی ہو اور اس کا کوئی مالک نہ ہو تو وہ اسلامی حکومت کی زیر ملکیت ہوگی اور اس میں احیاء و اموات کے احکام جاری ہونگے۔ علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''مختصر'' میں لکھا ہے کہ ''امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جزیرہ عرب سے مراد حجاز، یمن، یمامہ اور وہ علاقے ہیں جہاں تک فارس وروم کی سلطنت نہیں پہنچی یعنی مشرق سے حدود ایران تک۔''

ابن حبیب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جزیرہ عرب طول میں انتہائے عدن اور اس کے آس پاس کی سرزمین یمن سے عراق کی آبادیوں تک اور عرض میں جدہ اور اس کے آس پاس کے ساحل سمندر سے اطراف شام تک اور مغرب میں مصر تک ہے۔ یہ ساری حد بندی صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والے زمانے کے اعتبار سے ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری گفتگو جو فرمائی وہ یہ تھی کہ ''اللہ کی یہود و نصاریٰ پر مار پڑے جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، عرب کی زمین میں دو دین ہرگز موجود نہ رہیں۔''

ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جزیرہ العرب میں دو دین جمع نہیں ہونگے۔'' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تفتیش کروائی یہاں تک کہ ان کو اس بات کا یقین اور اطمینان ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہونگے'' پس آپ نے خیبر کے یہودیوں کو نکال دیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نجران اور فدک کے یہودیوں کو نکالا۔ خیبر کے یہودی اس طرح نکلے کہ ان کو کھجوریں نہیں ملیں اور نہ ہی زمین میں سے کچھ حصہ حاصل ہوا'' البتہ فدک کے یہودیوں کے لئے نصف پھل اور نصف زمین تھی، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے نصف پھل اور نصف زمین پر مصالحت کی تھی، پس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے نصف پھل اور نصف زمین کو قائم رکھا، اس کی قیمت سونے، چاندی، اونٹ، پالان اور رسیوں سے لگا کر ان کو دے دی اور پھر وہاں سے نکال دیا۔[1]

عرب کی زمین عشری ہے اور ہر ایسی زمین جس کے باشندے اسلام قبول کرلیں یا جو زمین قہر و غلبہ حاصل کر کے فتح ہوئی ہو اور مجاہدین میں بطور غنیمت تقسیم کر دی گئی ہو تو وہ سب عشری زمین ہوگی یعنی عرب کی سرزمین کے ماسوائے۔

---

[1] [الموطا: ۲/۲۰۰۴]

اور ہر ایسی زمین جو قہر وغلبہ حاصل کر کے مسلمانوں نے فتح کی ہو اور اس کے باشندوں کو اس کی ملکیت پر برقرار رکھا گیا ہو تو وہ خراجی زمین ہوگی۔ اور یہ اس صورت میں ہے کہ جب نہر کا پانی اس تک پہنچتا ہو اور ہر ایسی زمین جس تک نہروں کا پانی نہ پہنچتا ہو بلکہ وہ زمین چشموں سے سینچی جاتی ہے ہو تو وہ عشری ہوگی، جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جس اراضی کو نہروں اور بارش کے پانی سے سینچا جاتا ہو اس میں عشر ہے[1]'' چشمے کا پانی بھی فی المعنی بارش کے پانی کے حکم میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ''

[الزمر: ۲۱]

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا اور پھر اسے زمین پر چشموں کی صورت میں چلایا۔''

خراج کی اقسام

خراج کی دو قسمیں ہیں (۱) خراج مقاسمہ (۲) خراج مقاطعہ یا خراج وظیفہ۔ خراج مقاسمہ کا تعلق عشر کی طرح پیداوار سے ہے کہ حاکم مفتوحہ شہر کے باشندوں کی اراضی پر پیداوار کا نصف یا ثلث یا ربع مقرر کر دے، نصف سے زیادہ مقرر نہیں کرے گا۔ کیونکہ تقدیر شرعی نصف پیداوار پر وارد ہوئی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''نبی کریم ﷺ نے یہود کو خیبر کی زمین دی کہ وہ اس میں کام کریں اور کاشتکاری کریں اور جو اس سے پیداوار حاصل ہوگی اس کا نصف ان کے لئے ہوگا۔''[1] اس کا حکم عشر کے حکم کی طرح ہے کہ خراج مقاسمہ اور عشر دونوں کا تعلق پیداوار سے ہے۔ یہاں تک کہ اگر زین کو بے کار چھوڑ دیا اس میں زراعت نہیں کی حالانکہ زراعت کر سکتا تھا تو اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔ جس طرح عشر کی صورت میں واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح خراج مقاسمہ میں بھی واجب نہیں ہوگا۔

دوسری قسم خراج مقاطعہ یا خراج وظیفہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی جو مقدار مقرر فرمادی ہے اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ یعنی ہر جریب جس کو پانی پہنچتا ہو، اس پر ایک صاع ایک درہم ہے۔ جریب، ساٹھ ذراع طویل اور ساٹھ ذراع عریض زمین کو کہتے ہیں اور یہ ذراع، عمومی ذراع سے ایک قبضہ (ہاتھ کی چار انگلیوں کے برابر پیمائش جو انگلیوں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر حاصل ہو)

---

[1] [صحیح البخاری: ۸۷۴]

زائد ہوتا ہے۔ عمومی زراع ابہام (انگوٹھا) کو چھوڑ کر چھ قبضات کے برابر ہوتا ہے۔ پس وہ ذراع سات قبضات (قبضہ کی جمع) کے برابر ہوگا۔

اور صاع اور درہم تقریباً تین ہزار انیس (۳۰۱۹) گرام کے برابر ہوتا ہے، اور ایک قبضہ دس سینٹی میٹر کے مساوی ہوتا ہے، اس حساب سے ذراع جریب ستر (۷۰) سینٹی میٹر ہوگا جو ذراع عمومی سے تقریباً دس سینٹی میٹر زائد ہوتا ہے۔ اور جریب کا ضلع بیالیس (۴۲) میٹر ہوگا، پس ایک جریب کی پیمائش ایک ہزار سات سو چونسٹھ (۱۷۶۴) مربع میٹر ہوگی۔

گندم اور جو کاشت کے گئے ہوں اس کا خراج تین ہزار انیس (۳۰۱۹) گرام ہوگا اور جریب رطبہ پر پانچ درہم ہوں گے۔ ایک درہم دو گرام اور دس میں سے نو اجزاء کے وزن کے برابر ہوتا ہے، یعنی پانچ درہم کی قیمت چودہ گرام اور نصف گرام چاندی ہوگی اور جریب کرم جو متصل ہو اور جریب خرما (کھجور) جو متصل ہو اس پر دس درہم ہیں، یعنی ایک سو پینتالیس (۱۴۵) گرام چاندی کی قیمت کے برابر مقرر ہوگا۔

خراج کی یہ مقدار حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح عراق کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے مقرر کیا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو بھیجا، یہاں تک کہ انہوں (عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ) نے سواد عراق کی پیمائش کی اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو مشرف مقرر کیا۔ پیمائش کے بعد ملک عراق کی قابل کاشت زمین کا رقبہ تین کروڑ بیس لاکھ سے تین کروڑ ساٹھ لاکھ تک قرار پایا۔ سواد عراق کے علاقے پر خراج مقرر کرتے وقت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی کوئی اعتراض یا تعرض، اختلاف یا انکار نہیں کیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انکار نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ سوادِ عراق پر خراج مقرر کرنے کے حوالے سے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو نہ صرف صحیح قرار دیا بلکہ ہمیشہ کے لئے تقررِ خراج کے عمل پر ''اجماع'' کر کے امت مسلمہ کو دلیل قطعی کی راہ دکھا دی۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ''کتاب الخراج'' میں فرماتے ہیں کہ مجھے مدینہ کے بہت سے علماء نے یہ بات بیان فرمائی کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے عراق کا لشکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احکام کی تدوین و ترتیب کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کا ارادہ فرمایا۔ اس سے پہلے آپ رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے لوگوں میں مساوات کیا کرتے تھے، جب عراق فتح ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ

نے تفصیل اور ترجیح کے لئے لوگوں سے مشاورت فرمائی اور اس رائے کو پسند کیا، کچھ لوگوں نے اسی امر کا آپ رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس اراضی کی تقسیم کے سلسلے میں ان سے مشاورت فرمائی جو اراضی اللہ تعالیٰ نے بطور مال غنیمت مسلمانوں کو عطا فرمائیں یعنی عراق اور شام کی اراضی کے متعلق آپ رضی اللہ عنہ نے ان کی رائے لی، کچھ لوگوں نے اس راضی کے متعلق اختلاف کیا اور یہ چاہا کہ ان کے حقوق اور مفتوحہ علاقے ان میں تقسیم کئے جائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں نے (غانمین میں اس کو) تقسیم کر دیا تو بعد میں آنے والے مسلمانوں کا کیا ہوگا؟ وہ دیکھیں گے کہ وہ زمین اور اس کے مویشی تو تقسیم ہو چکے ہیں اور وہ آباؤ واجداد سے بطور وراثت ان کو مل گئی ہیں، یہ کوئی اچھی رائے نہیں ہے! عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ پھر کیا رائے ہے؟ زمین اور مویشی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بطور مال غنیمت کے دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم صحیح کہتے ہو لیکن میری یہ رائے نہیں ہے، خدا جانتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو میرے بعد کوئی بڑا شہر پھر فتح نہ ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ یہ بات مسلمانوں کے لئے بار کا باعث ہو جائے۔ اگر عراق اور شام کی زمینیں اپنے مویشیوں سمیت تقسیم ہو گئیں تو بتاؤ پھر سرحدوں کی نگرانی کیسے ہوگی؟ اور شام وعراق اور دوسری جگہوں کی نسل واولاد اور بیوگان کے لئے کیا ہوگا؟ لوگ کہنے لگے کہ کیا آپ ایسے مال کو جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری تلواروں کے ذریعے بطورِ غنیمت عطا کیا ہے ان لوگوں کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں جو اس قتال و جہاد میں نہ موجود تھے اور نہ ہی شریک تھے۔ اور ان لوگوں کے بیٹوں اور پوتوں کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ اس موقع پر موجود نہیں تھے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف یہی کہتے جاتے تھے کہ ہاں یہ بھی ایک رائے ہے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ مشورہ لے لیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرینِ اولین سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے اختلاف کیا، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ لوگوں کے حقوق ان میں تقسیم کر دیئے جائیں، جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی رائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق تھی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار کے دس سربرآوردہ لوگ بلا بھیجے جن میں سے پانچ قبیلہ اوس کے تھے اور پانچ خزرج کے تھے۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے حمد وثناء بیان کرنے کے بعد فرمایا: میں نے آپ سب کو اس لئے زحمت دی کہ آپ بھی اس امانت میں شریک ہوں جس امانت کے امور کا مجھے ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں اور تم آج حق کے ماننے والے ہو۔ کچھ لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور کچھ لوگوں نے میری موافقت کی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کی پیروی کرو۔ تمہارے پاس اللہ کی کتاب

موجود ہے جو حق بات کو بیان کرنے والی ہے، خدا گواہ ہے کہ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور میرا مقصد اس سے حق ہی کا حصول ہے۔ سب کہنے لگے اے امیر المؤمنین! آپ فرمائیں، ہم ضرور سنیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ نے ان لوگوں کی بات کو سن لیا ہے جن کا خیال یہ ہے کہ میں ان کے حقوق پامال کر رہا ہوں، میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی پر کوئی ظلم کروں، اگر (بالفرض) میں نے ان پر کوئی ظلم کیا ہو، اور ان کے حق دار ہوتے ہوئے کسی غیر مستحق کو حقدار بنایا ہو تو یہ میری بدنصیبی ہوگی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی زمین کے بعد اب کوئی چیز باقی نہیں رہی جو قابل فتح ہو، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی ارضی اور مال و مویشی بطور غنیمت کے عطا فرمائے ہیں۔ پس میں نے حاصل شدہ مال غنیمت ان ہی لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اس میں سے خمس نکال لیا ہے اور اسے اپنے مصرف میں لگا دیا ہے، میری رائے یہ ہے کہ ان زمینوں کو مویشیوں سمیت وقف کر دوں اور ان کا (کفار پر) پر خراج لگا دوں اور ان کی گردنوں پر جزیہ رہے جسے وہ ادا کرتے رہیں، پس یہ غازیانِ اسلام، ان کی اولاد اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لئے غنیمت کے طور پر باقی رہے۔ آخر ان سرحدات کی حفاظت کے لئے بھی لوگ درکار ہیں جو وہاں ہر وقت موجود رہیں اور شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے بڑے شہروں کی دیکھ بھال کرنے اور بسنے کے لئے بھی لشکر اسلام کی ضرورت ہے جو ہر وقت وہاں پر موجود ہوں اور ان کو تنخواہیں بھی دینا ہونگی! اگر زمین اور مویشی تقسیم ہو گئے تو ان لوگوں کو کہاں سے دیں گے؟ سب نے کہا کہ آپ کی رائے واقعی ٹھیک ہے۔ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ اگر یہ سرحدیں اور بڑے بڑے شہر لوگوں سے بھرے ہوئے نہ ہوں گے اور قوت و طاقت کا سامان آپ کو فراہم نہ کیا جائے گا تو کفار اپنے شہروں کی طرف لوٹ آئیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب یہ بات میرے لئے واضح ہو چکی ہے کون شخص ایسا ہے جو زیرک اور عقلمند ہو اور زمین کی صحیح صحیح پیمائش کر سکے؟ سب کا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ پر اتفاق رائے ہوا کہ آپ ان کو بھیج دیں، یہ بڑے تجربہ کار، عقلمند اور ماہر ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جلدی سے ان کو سواد عراق کی پیمائش کی ذمہ داری سونپ دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت نے ایک سال قبل سواد کوفہ کا محصول (لگان) دس کروڑ درہم تک پہنچ گیا تھا اور اس زمانے میں ایک درہم کا وزن ایک مثقال کے برابر تھا، اس اعتبار سے سواد کوفہ کا کل محصول ۴ لاکھ ۲۰ ہزار کلوگرام چاندی کے برابر ہوتا ہے۔

ایک زمین میں عشر اور خراج کو جمع نہیں کیا جائے گا اور اسی طرح پیداوار کے تکرار سے خراج مکرر نہیں ہوگا البتہ عشر مکرر ہوگا، اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خراج کو مکرر لاگو نہیں کیا تھا۔ نیز زمین کے لئے خراج اجرت کی طرح ہے، لہٰذا جب ایک بار اس کو ادا کر دے تو اسے اختیار ہے

کہ جتنا چاہے نفع اٹھائے اور جتنی بار چاہے زراعت کرے۔ لیکن عشر کا معنی یہ ہے کہ پیداوار کا عشر (دسواں حصہ) وصول کیا جائے گا اور یہ اسی صورت میں متحقق ہوگا جب ہر پیداوار میں اس کا وجوب پایا جائے۔

اگر ایک زمین خراج سے دگنی یا اس سے زیادہ پیدوار دے تو اس سے سارا خراج لیا جائیگا اور اگر خراج کے بقدر نکالے تو اس کا نصف لیا جائے گا، تا کہ کسی جانب ظلم نہ ہو۔ اگر مالک نے زمین کو بے کار چھوڑے رکھا تو اس کے ذمہ اس کا خراج ہوگا، کیونکہ وہ زمین قوت زراعت رکھتی ہے اور مالک نے اسے (زمین کو) خود ہی ضائع کر دیا ہے، البتہ خراج مقاسمہ کی صورت میں اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔ (جیسے گزر چکا۔)

اگر مسلمان نے کسی ذمی سے خراجی زمین خریدی یا وہ ذمی مسلمان ہو گیا تو اس سے بدستور خراج لیا جائے گا، کیونکہ یہ زمین کا وظیفہ (مقرر مقدار) ہے پس ملکیت کی تبدیلی سے حکم تبدیل نہ ہوگا۔ جو شخص زراعت ارض اور خراج ادا کرنے سے عاجز ہو اس کی زمین کو اجرت پر دیا جائیگا اور اس اجرت سے خراج حاصل کیا جائے گا، اگر اس زمین کو اجرت پر کوئی حاصل نہ کرتا ہو تو امام اس زمین کو بیچ کر خراج لیگا اور باقی مال اس کو واپس دے دے گا اور یہ بالا جماع ہے کیونکہ مفاد عامہ کی خاطر ضرر خاص لازم آتا ہے جو کہ جائز ہے۔

اگر مملکتِ اسلامیہ کا سربراہ کسی آدمی کا عشر یا خراج چھوڑنا چاہے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خراج میں تو ایسا کرنا جائز ہے لیکن عشر میں جائز نہیں ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں میں جائز نہیں ہے، کیونکہ عشر اور خراج دونوں مسلمانوں کا مال فی ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ خراج میں امام کو حق حاصل ہے لہٰذا اگر خراج نہ لے تو درست ہے اور وہ اس کی طرف سے صلہ (سلوک) ہے۔ جب کہ عشر خالص فقراء کا حق ہے، لہٰذا اس کا نہ لینا جائز نہیں۔ (اور اسی پر فتویٰ ہے)

مرتدین کے احکام

جب کوئی مسلمان اسلام سے پھر جائے (العیاذ باللہ) تو اس پر اسلام پیش کیا جائے گا، چنانچہ اگر اسے (مرتد کو) کوئی شبہ پیدا ہو گیا ہو تو وہ حل کر دیا جائے اور بر بناء قول مشائخ اسلام پیش کرنا واجب نہیں ہے، کیونکہ اس کو اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے اور کافر کو جب ایک بار اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو تو دوبارہ اسلام کی دعوت دینا واجب نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے (مرتد کو) بطریق اولیٰ

واجب نہیں ہوگی بلکہ مستحب ہوگی۔اس لئے کہ اس کے ارتداد کی بظاہر وجہ کوئی شک وشبہ ہوسکتی ہے یا ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ظلم وستم کا شکار ہوا ہو، لہٰذا اگر وہ مہلت مانگے تو تین دن مہلت دی جائیگی۔ بصورت دیگر اسے فی الفور قتل کر دیا جائے گا۔ مرتد کے قتل کے واجب ہونے کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

"قُلْ لِلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْيُسْلِمُوْنَ" [الفتح:١٦]

"آپ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے کہہ دیجئے کہ عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں (سے لڑنے) کی طرف بلائے جاؤ گے جو سخت لڑنے والے ہونگے کہ یا تو ان سے لڑتے رہو یا وہ مطیع (اسلام) ہو جائیں۔"

مفسرین کی ایک جماعت اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس آیت میں "مرتد لوگ" ہی مراد ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ بدل دينه فاقتلوه"[1] "یعنی جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو" نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کسی مرد مسلم کا خون حلال نہیں جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں، مگر تین امور میں سے کسی ایک کے پائے جانے پر اس کا خون حلال ہوگا، ایک یہ وہ شادی شدہ زانی ہو، دوسرا جان کے بدلے جان کا قتل اور تیسرا وہ شخص جو اپنا دین ترک کر دے اور جماعت سے علیحدہ ہو جائے۔"[2]

اگر کسی شخص نے مرتد کو اسلام پیش کرنے سے پہلے قتل کر دیا تو (قصاص یا دیت میں سے) اس پر کچھ نہ ہوگا، کیونکہ کفر کی وجہ سے قتل کا مستحق ہے۔لہٰذا اس (قاتل) پر تاوان نہیں ہوگا، لیکن ایسا کرنا اس کے لئے مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے مسنون کام کا ترک کرنا لازم آتا ہے اور دوسرا یہ کہ ایسا کرنا حاکم وقت کے سامنے جرأت کرنا ہے۔لہٰذا یہ مکروہ تحریمی ہوگا۔

محمد بن عبداللہ بن عبدالقاری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کی جانب سے ایک شخص حاضر ہوا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ ہم نے اسے نزدیک کر کے اس کی گردن اڑا دی، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے اسے تین دن قید کیوں نہیں کیا؟ ہر روز اسے ایک روٹی کھلاتے اور اسے توبہ کرنے کو کہتے، ہوسکتا تھا کہ وہ توبہ کر لیتا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع کر لیتا، پھر کہنے لگے کہ اے اللہ! میں نہ (وہاں پر) موجود تھا اور نہ ہی میں نے اس کا حکم دیا تھا اور

---

[1] [صحیح البخاری:٦١١] [2] [صحیح مسلم:١٣٠٢/٣]

جب مجھے یہ خبر پہنچی تو میں نے رضامندی کا اظہار بھی نہیں کیا۔"[1]

مرتد کی توبہ کی کیفیت (طریقہ) یہ ہے کہ وہ اسلام کے علاوہ دیگر تمام ادیان سے بیزاری کا اعلان کرے اور اگر جس دین کی طرف منتقل ہوا اس سے بیزاری ظاہر کرے تو کافی ہے اور توحید ورسالت کی گواہی دے۔

اگر دوبارہ مرتد ہو جائے تو اس کا یہی حکم ہے، بلکہ ہمیشہ یہی حکم ہوگا، کیونکہ ہم ظاہر حال پر حکم لگائیں گے، جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ اس نے دل سے کلمہ پڑھا ہے یا نہیں"[2] آنحضرت ﷺ منافقوں کے ظاہری اسلام لانے کو بھی قبول فرما لیتے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی توبہ جب پہلی بار اظہار اسلام کے ساتھ قبول کی گئی تو یہ امر بعد میں بھی موجود ہے اس لئے بعد میں بھی قبول کی جائیگی۔

مرتد ہونے کے باعث مرتد کی ملکیت اپنے اموال سے زائل ہو جاتی ہے۔ مگر یہ کہ امید اور توقع ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی طرف لوٹ آئے کیونکہ اسے اسلام کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ پس اس مرتد کے معاملے میں توقف کیا جائے گا، اگر وہ مسلمان ہو گیا تو یہ (ارتداد) زوال ملکیت کے حق میں کالعدم ہوگا اور یہ حکم ایسا ہوگا گویا کہ وہ (مرتد) برابر مسلمان رہا اور زوال ملکیت کا سبب (ارتداد) نہیں ہوا۔ اگر مرتد اپنے ارتداد پر مرگیا تو اس کا کفر برقرار رہے گا، پس زوال ملکیت کا سبب اپنا عمل کرے گا اور اس مرتد کی ملکیت زائل ہو جائے گی۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد کا موقف یہ ہے کہ ارتداد زوال ملکیت کا حکم وقوع موت یا قتل یا دارالحرب بھاگ جانے کی صورت میں لاگو کیا جائے گا، کیونکہ وہ (مرتد) مکلّف ومحتاج ہے۔ چنانچہ قتل ہونے تک اس (مرتد) کی ملکیت اس شخص کی طرح باقی رہتی ہے جس کے خلاف رجم (سنگسار) یا قصاص کا حکم لگایا گیا ہو۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صاحبین کا قول مرجوح اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول راجح ہے۔

مرتد کے تصرفات

مرتد کے تصرفات کی چار اقسام ہیں:

(۱) تصرفاتِ نافذہ: ایسے تصرفات جو ائمہ فقہاء کے نزدیک بالاتفاق نافذ ہوتے ہیں۔ جیسے طلاق دینا، ہبہ قبول کرنا، اپنی لونڈی کو ام ولد بنانا، شفعہ کرنا۔

[1] [صحیح مسلم: ۹۶/۱] [2] [الموطا: ۱۱۷/۲]

(۲) **تصرفاتِ باطلہ**: ایسے تصرفات جن کا نفاذ بالاتفاق باطل ہے، جیسے نکاح وذبیحہ اور وارث ہونا۔

(۳) **تصرفاتِ موقوفہ متفقہ**: ایسے تصرفات جو بالاتفاق موقوف ہوتے ہیں جیسے شرکتِ مفاوضہ، کیونکہ اس امر (شرکتِ مفاوضہ) میں مسلمان اور مرتد کے درمیان مساوات (برابری) ضروری ہے، غلام اور آزاد، نابالغ لڑکا اور بالغ مرد، مسلمان اور کافر کے مابین مساوات صحیح نہیں ہے، پس اگر مرتد مسلمان نہیں ہوا تو مساوات کا تحقق نہ ہوگا، اور اگر مسلمان ہوگیا تو مساوات حاصل ہوگئی، پس اس کو موقوف رکھا جائے گا۔

(۴) **تصرفاتِ موقوفہ مختلفہ**: ایسے تصرفات جن کے موقوف ہونے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبینؒ کے مابین اختلاف ہے۔ مثلاً خرید وفروخت کرنا، غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا، کوئی چیز بطور رہن رکھنا، مکاتب بنا، کوئی شے بطور ہبہ دینا یا قبول کرنا، اجارہ (کرایہ داری) پر مبنی معاملہ کرنا، وصیت کرنا وغیرہ۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسے تصرفات موقوف رہیں گے، اگر مسلمان ہوگیا تو نافذ العمل ہونگے اور اگر مر گیا یا قتل ہوگیا تو باطل ہوں گے اور صاحبینؒ کے نزدیک جائز ہیں، ان ائمہ فقہاء کے اختلاف کی بنیاد اس کی (مرتد کی) ملکیت کے زوال اور عدم زوال پر ہے، جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بیان کیا ہے۔ (لہٰذا امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول راجح ہے۔)

دارالاسلام سے بھاگ جانے کی صورت میں مرتد کا حکم

اگر مرتد مر گیا یا قتل ہوگیا یا دارالحرب چلا گیا، تو وہ اہل حرب میں سے ہو جائے گا اور اسلامی احکام کے حق میں وہ لوگ (اہل حرب) مردہ ہیں۔ البتہ قاضی کے حکم کے بغیر دارالحرب میں اس کا الحاق (ملنا یا چلا جانا) برقرار نہ رکھا جائیگا کیونکہ مسلمانوں کی طرف اس کے لوٹ آنے کا احتمال ہے پس قاضی کا حکم ضروری ہوا۔ اور جب مرتد کی موت کا تقرر ہوگیا تو اس کے مرنے پر جو احکام متعلق تھے وہ ثابت ہو گئے، جیسے حقیقی موت میں ہوتا ہے اور با جماع صحابہ رضی اللہ عنہم صرف مسلمان ورثاء اس کے وارث قرار پائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستورد العجلی کے مال میں اسی طرح فیصلہ کیا تھا، جب اسے مرتد ہونے کے باعث قتل کر دیا گیا تھا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔

عبدالملک بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ''میں حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے پاس موجود

تھا کہ بنو عجل کا ایک آدمی مستورد بن قبیصہ، جو اسلام لانے کے بعد نصرانی ہوگیا تھا، لایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا: مجھے تیرے بارے میں کیا بتایا گیا ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بارے میں کیا بتایا گیا ہے، آپ بتائیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ میں بھی مسیح علیہ السلام کے دین پر ہوں، تم بتاؤ کہ تم حضرت مسیحؑ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ اس آدمی نے پست آواز میں کچھ کہا، (اس پر) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس شخص کو روند ڈالو، چنانچہ اسے روند ڈالا گیا، یہاں تک کہ وہ مر گیا، (راوی کہتے ہیں کہ) میں نے اپنے پاس والے سے پوچھا کہ اس آدمی نے (پست آواز میں) کیا بات کہی تھی؟ اس نے کہا کہ اس نے کہا تھا کہ حضرت مسیحؑ اس کے رب ہیں۔''[1]

اس مرتد کے جو قرضے حالت اسلام میں لازم ہوئے تھے وہ واجب الاداء ہوگئے اور وہ اس مرتد کی حالت اسلام کی کمائی سے ادا کئے جائیں گے اور جو قرضے حالت ارتداد میں واجب ہوئے تھے وہ (قرضے) حالت ارتداد کی کمائی سے ادا کئے جائیں گے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس مرتد کی وصیتیں باطل ہونگی کیونکہ اس کا ارتداد ان وصیتوں سے رجوع کرنے کی طرح ہے اور صاحبینؒ کہتے ہیں کہ قربات (نیک کاموں) میں اس کی وصیتیں باطل ہونگی، دوسرے امور میں باطل نہیں ہونگی۔

اگر مرتد مسلمان ہو کر واپس آجائے تو اپنے وارث کے قبضہ میں جو مال پائے گا اس سے لے لے گا۔ کیونکہ جب وہ مسلمان ہو کر واپس آیا تو گویا اس کی حیات واپس آگئی، پس حاجت بھی لوٹ آئے گی اور وارث کے لئے قائم مقام ہونے کا ثبوت اس (مرتد) کے استغناء کی بناء پر تھا لیکن جب اس کی حاجت واپس لوٹ آئی تو اسے وارث پر مقدم رکھا جائے گا۔ (یعنی مرتد کا وارث اس لئے اس کا قائم مقام ہوا ہے کہ مرتد اس مال سے مستغنی ہوگیا لیکن جب وہ مسلمان ہو کر واپس آگیا تو اس مال کا حاجت مند ہوا، لہٰذا وہی مقدم ہوگا)۔ اور اگر وارث نے اس مال کو اپنی ملکیت سے زائل کر دیا تو وہ ضامن نہ ہوگا۔

اگر مرتد قبل از حکم قاضی مسلمان ہو کر آگیا تو وہ گویا مسلمان ہی رہا، یعنی اس صورت میں اس کی سابقہ ملکیت ایسے بحال ہو جائے گی جیسا کہ حالت اسلام میں موجود تھی۔ کیونکہ حکمی طور پر ارتداد پر مبنی معنوی موت کا ثبوت دفع ہو جائیگا۔ کیونکہ جب تک اس کے الحاق پر حکمِ قاضی لاگو نہ ہو اس کی موت کا (معنوی) حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

---

[1] [سنن الدارقطنی: ۱۱۲/۳]

عقلمند نابالغ بچے کے اسلام اور ارتداد کا مسئلہ

اگر کوئی سمجھدار مگر نابالغ بچہ اسلام لائے یا مرتد ہو جائے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا اسلام اور ارتداد صحیح متصور ہوگا اور مرتد بچے کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائیگا اور اسے قتل نہ کیا جائے گا، اور اگر مرتد بچے کے والدین کافر ہیں تو اسلام لانے کی صورت میں اپنے والدین کی وراثت حاصل کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مرتد ہونا ارتداد نہیں ہے اور اس کا مسلمان ہونا اسلام ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بچپن میں دس سال کی عمر میں اسلام لائے[1] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کا اسلام لانا صحیح قرار دیا اور وہ اس پر نازاں ہوئے جیسا کہ مشہور ہے، کیونکہ اسلام لانا کمال عقل کی دلیل ہے نہ کہ بلوغ کی۔ بایں وجہ کہ جو بالغ ہو لیکن عاقل نہ ہو اس کا اسلام صحیح متصور نہیں ہوتا اور عقل جس طرح بڑے میں پائی جاتی ہے چھوٹے میں بھی پائی جاتی ہے۔ نیز اس لئے کہ عقلمند بچہ اسلام کی حقیقت پر آیا ہے اور وہ تصدیق قلبی اور اقرار لسانی ہے۔ اس لئے کہ دل سے اقرار کرنا اعتقاد کی دلیل ہے اور حقائق قابل رد نہیں ہوتے۔ پس وہ مرتد ہو جائے تو اس کا ارتداد بالغ کی طرح صحیح متصور ہوگا۔ نیز اس لئے کہ اسلام عقد (معاملہ) کرنے کا نام ہے اور ارتداد اس کا عقد ختم کرتا ہے اور جو عقد کرنے کا اختیار رکھتا ہو وہ اس عقد کو ختم کرنے کا بھی مجاز ہوگا۔ لہٰذا جب عقلمند بچے کا ارتداد صحیح ہوگا تو اس پر ارتداد کے احکام مرتب ہوں گے کہ اگر مرتد ہو کر مر گیا تو وارث ہوگا نہ مورث، نہ اس کا جنازہ پڑھا جائے گا، اور اسے اسلام لانے پر مجبور کیا جائیگا۔ اسے بالغ کی طرح کفر پر رہنے نہیں دیا جائیگا۔ کیونکہ جبر کرنے سے اس کی وراثت سے محرومی کا نقصان اس سے دفع ہوگا۔ اسے البتہ قتل نہ کیا جائیگا، کیونکہ قتل کرنا ایک سزا ہے اور وہ اس کا اہل نہیں ہے، کیونکہ بچے کے فعل پر قتل کا حکم لاگو نہیں ہوتا، جیسے قصاص کا حکم لاگو نہیں ہوتا۔

دیوانے اور نشئی کا مرتد ہونا

اگر بچہ ناسمجھ ہو تو اس کا نہ اسلام صحیح متصور ہوگا اور نہ ہی ارتداد۔ اسی طرح دیوانے یا مست آدمی کا بھی اسلام اور ارتداد معتبر نہیں ہے۔ جو شخص کبھی دیوانہ ہو جاتا ہو اور کبھی ہوش میں آ جاتا ہو تو اس پر حالت دیوانگی میں دیوانوں والے احکام اور حالت افاقہ میں عاقلوں والے احکام لاگو ہوں گے۔

---

[1] [المستدرک: ۳/۱۱۱]

نشئی کا ارتداد استحساناً غیر معتبر ہے اور اس کا اسلام صحیح متصور ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اعتقاد سے ایسا کرے اور اسلام کے اثبات کا اور کفر کی نفی کا حیلہ (تدبیر) کیا جاتا ہے۔ پس اسلام اور کفر میں فرق واضح ہوگیا۔ جب کہ قیاس اس بات کا متقاضی ہے کہ نشئی کی بیوی ارتداد کے باعث بائنہ ہو جائے، کیونکہ کفر طلاق کی طرح جدائی کا سبب ہے، لیکن ہم اس (نشئی) کے ارتداد کا اعتبار نہیں کریں گے اور کہیں گے کہ اس کا ارتداد صحیح متصور نہیں ہوگا اور جدائی اختلاف دین کے سبب واقع ہوتی ہے، جبکہ یہاں پر دین مختلف نہیں ہوا، کیونکہ اس کا ارتداد درست نہیں ہے۔

مرتدہ عورت کا حکم

مرتدہ عورت کو بھی قتل نہ کیا جائے بلکہ قید رکھا جائے۔ اور روزانہ مارا جائے گا حتیٰ کہ وہ اسلام لے آئے۔ چنانچہ اس پر اسلام پیش کیا جائے گا اگر وہ انکار کرے تو اسے مارا جائے گا، پھر اس پر اسلام پیش کیا جائیگا اگر پھر انکار کرے تو قید میں رکھا جائیگا۔ اس (مرتد عورت) کو قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو قتل کرنے سے مطلقاً منع کیا ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عورتیں جب اسلام سے پھر جائیں تو انہیں قتل نہیں کیا جائیگا، البتہ ان کو قید میں رکھا جائیگا اور اسلام کی دعوت دی جائے گی اور اس پر ان کو مجبور کیا جائیگا۔"[1]

اگر مرتدہ عورت کو کوئی شخص قتل کردے تو اس پر (قصاص یا دیت میں سے) کچھ لازم نہ ہوگا۔ البتہ اس شخص کے ساتھ تادیبی کارروائی کی جائیگی اور تعزیر لگائی جائے گی کہ اس نے حاکم وقت کے سامنے جرأت کا اظہار کیا، کیونکہ حدود قائم کرنا مسلمان حاکم کا کام ہے، رعایا کا کام نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک اندھا آدمی تھا، جس کی ام ولد تھی، وہ شان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گستاخی کرتی تھی، وہ اسے ڈانٹتا مگر وہ باز نہیں آتی تھی، ایک رات جو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کرنا شروع کی تو اس (اندھے آدمی) نے اسے قتل کردیا۔ جب صبح ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو وہ اندھا آدمی کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اس کا مالک ہوں، وہ آپ کی شان میں گستاخی کیا کرتی تھی اور اہانت کا ارتکاب کرتی تھی، میں اس کو منع کرتا تھا مگر وہ باز نہیں آتی تھی، میں اسے ڈانٹتا تھا مگر وہ پھر بھی منع نہیں ہوتی تھی اور میرے اس کے بطن سے موتیوں جیسے دو بیٹے بھی ہیں اور وہ میری رفیقہ تھی، گزشتہ رات جب اس نے دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا شروع کردی تو میں نے اسے قتل کر

[1] [نصب الرایۃ: ۳/۴۵۷]

دیا، (اس پر) حضور ﷺ نے فرمایا: "اشھدوا أن دمھا ھدر"[1] "یعنی گواہ ہو جاؤ کہ اس مقتولہ کا خون رائیگاں ہے۔"

مرتدہ عورت کے تصرفات دارالاسلام میں جائز قرار دیئے جائیں گے۔ کیونکہ اس نے خالص اپنے حق میں تصرف کیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عصمتِ مال، عصمتِ نفس کے تابع ہوتی ہے اور اس مرتدہ عورت کی عصمت نفس دارالحرب میں الحاق نہ ہونے تک برابر قائم رہتی ہے، اگر وہ (مرتدہ عورت) دارالحرب میں چلی جائے پھر گرفتار ہو تو اسے غلام بنالیا جائے گا اور اسے اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا، قتل نہ کیا جائیگا اور اس کی وہ کمائی جو دارالحرب میں اس نے حاصل کی ہو اس کے ورثاء کو منتقل کی جائیگی اور اس کے شوہر کو میراث نہیں ملے گی۔ اس کے خاوند کے لئے جائز ہے کہ الحاق کے بعد اس کی بہن سے شادی کرلے۔ اگر وہ (مرتدہ عورت) مسلمان ہو کر واپس آ گئی تو بہن سے اس کا نکاح نہیں ٹوٹے گا۔ کیونکہ اس مرتدہ کا نکاح ساقط ہونے کے بعد عود نہیں کرے گا اور اس (مرتدہ عورت سابق) کے لئے جائز ہے کہ اسی وقت بغیر عدت کے کسی کے ساتھ شادی کرلے۔

اگر اس نے دارالحرب میں چھ ماہ سے کم عرصے میں بچہ جنا تو اس کا نسب اس کے خاوند سے ثابت ہوگا اور بچہ باپ کے تابع ہو کر مسلمان شمار ہوگا۔ اور اگر اس نے الحاق کے وقت سے چھ ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ میں بچہ جنا، پھر دونوں ایک ساتھ گرفتار ہو گئے تو دونوں (ماں اور بچہ) مال فئی متصور ہوں گے، کیونکہ اس صورت میں بچے کا نسب عدت نہ ہونے کی وجہ سے زوج اول سے ثابت نہیں ہوگا، پس بچہ ماں کے تابع ہو کر کافر (کا بچہ) شمار ہوگا۔

کافر، مسلمان کیسے ہوگا؟

کافر جب سابقہ اعتقاد کے خلاف اپنی زبان سے اسلام کا اقرار کرے تو اس کے مسلمان ہونے کا حکم لگائیں گے۔ پس جو لوگ خدا کی وحدانیت کے منکر ہوں، جیسے مشرکین اور بت پرست لوگ، یا اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر ہوں، جب یہ کہیں "لا الہ الا اللّٰہ" یا کہیں: اشھدان محمد رسول اللّٰہ یا کہیں: اسلمت (میں اسلام لایا) یا آمنت باللّٰہ (میں اللہ پر ایمان لایا) یا انا علی دین الاسلام (میں دین اسلام پر ہوں) یا کہیں انا علی دین الحنفیۃ (میں دین حنیف پر ہوں) تو ان تمام الفاظ سے وہ مسلمان متصور ہوں گے۔ جو لوگ، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو

---

[1] [سنن الدار قطنی: ۳:۱۱۲]

تسلیم کرتے ہوں لیکن محمد ﷺ کی رسالت کے منکر ہوں جیسے یہود ونصاریٰ تو وہ صرف توحید کی گواہی دینے سے مسلمان نہیں ہوں گے جب تک کہ یہ گواہی نہ دیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جس کا یہ اعتقاد ہو کہ محمد ﷺ صرف عرب کی طرف رسول بنا کر مبعوث ہوئے ہیں تمام لوگوں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے تو وہ صرف شہادتِ توحید اور شہادتِ رسالت سے مسلمان نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اس دین سے بیزاری کا اعلان نہ کرے جسے وہ اختیار کئے ہوئے ہے، اگر ایسا شخص یوں کہے کہ میں اسلام میں داخل ہوا تو اس کے مسلمان ہونے کا حکم لگائیں گے۔

کافر اگر جماعت کے ساتھ نماز پڑھے یا مسجد میں اذان دے یا کہے کہ میں باجماعت نماز کی حقیقت تسلیم کرتا ہوں اور اس کا اعتقاد رکھتا ہوں تو وہ مسلمان ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اکیلا نماز ادا کرے اور مسلمانوں کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے تو وہ مسلمان ہے، اور اگر کسی نے تلبیہ پڑھا اور احرام باندھ کر مسلمانوں کے ساتھ مناسک حج میں شریک ہوا تو مسلمان ہے۔ اگر کسی ذمی کافر کو اسلام لانے پر مجبور کیا گیا، پھر وہ اسلام لے آیا تو اس کا اسلام صحیح ہوگا اور اگر اسلام سے رجوع کرلے تو اسے قتل نہ کیا جائیگا بلکہ قید میں رکھا جائیگا تاوقتیکہ وہ اسلام کی طرف واپس آجائے۔

باغیوں کے احکام

اصطلاح شریعت میں ''بغاوت'' کا لفظ ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو لوگ امامِ برحق کی اطاعت سے ناحق خود کو خارج کردیں اور امرحق پر خروج کریں۔

باغی لوگ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ''

[الحجرات:۹]

''اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کردو پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرلے۔''

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جنھوں نے ان پر خروج کیا تھا، ''اخواننا بغوا علینا'' کے الفاظ سے ذکر کیا یعنی ''یہ ہمارے وہ بھائی ہیں جنھوں نے ہم پر خروج کیا ہے۔''

ہر ایسی بدعت (نو ایجاد چیز) جو دلیل قطعی ہو وہ کفر ہے۔ جو دلیل قطعی طور پر علم وعمل کو واجب کرتی ہے اس سے مراد وہ دلیل ہے جو قطعی الثبوت بھی ہو اور قطعی الدلالت بھی ہو۔ پس جو شخص ضروریات دین میں سے کسی امر معلوم کا انکار کرے وہ کافر ہے اور ہر ایسی بدعت (نو ایجاد امر) جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت دلیل کے خلاف نہ ہو بلکہ صرف ایسی دلیل کے مخالف ہو جو دلیل ظاہری طور پر عمل کو واجب کرتی ہو وہ بدعت وضلالت ہے، کفر نہیں ہے۔ امت کا اہل بدعت کے گمراہ ہونے اور غلط ہونے پر اجماع اور اتفاق ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو سب وشتم کرنا موجب کفر نہیں ہے۔'' بلکہ موجب ضلالت وگمراہی ہے، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شاتم صحابی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار نہیں دیا اور اسے قتل نہیں کیا۔

باغی وہ گروہ کہلائے گا جن کے پاس قوت موجود ہو اور وہ غالب اور قابض ہونا چاہتا ہو اور اہل حق کے ساتھ کسی تاویل کی بناء پر لڑتا ہو اور کہتا ہو کہ امر حق ہمارے پاس ہے اور وہ ولایت وحکومت کا دعویدار ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر چوروں کا گروہ کسی شہر پر غلبہ پا کر قابض ہو جائے اور لوگوں کو قتل کر دے اور ان کے اموال چھین لے۔ وہ گروہ کوئی تاویل کرنے والا نہ ہو تو ان سب کو گرفتار کیا جائے گا لیکن وہ ''باغی'' (شرعاً) نہیں کہلائے گا کیونکہ اگر قوت ودفاع کی شرط موجود ہے تو تاویل کی شرط مفقود ہے۔

اگر مسلمانوں میں کوئی قوم غلبہ پا کر کسی شہر یا ملک پر قابض ہو گئی اور مسلمان حاکم کی اطاعت سے خارج ہو گئی تو وہ مسلمان حاکم انہیں جماعت کی طرف لوٹنے کی دعوت دے اور ان باغیوں کا شبہ دور کرے اور ان سے خروج کے اسباب ومحرکات دریافت کرے۔ اگر کسی ظلم کی وجہ سے انہوں نے خروج کیا ہو تو ظلم کا ازالہ کرے اور اگر ظلم کی وجہ سے انہوں نے خروج نہ کیا ہو بلکہ وہ کہتا ہو کہ امر حق ہمارے پاس ہے اور حکومت کا دعویٰ کرے تو وہ لوگ ''باغی'' ہوں گے۔ مسلمانوں کے حاکم کے لئے جائز ہے کہ ان کے ساتھ لڑائی کرے جبکہ وہ قوت وشوکت رکھتے ہوں اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے حاکم کی اعانت کریں اور ان کے ساتھ مل کر باغیوں سے قتال کریں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

''فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْءَ اِلٰی اَمْرِ اللّٰهِ'' [الحجرات:۹] ''باغی گروہ سے لڑو حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔''

یعنی ان باغیوں سے اس وقت تک لڑو جب تک کہ وہ لوگ کتاب اللہ اور صلح کی طرف نہ لوٹ آئیں جس صلح کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے (قبل از قتال) اہل حروراء سے یہی معاملہ کیا تھا۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''سنن الکبریٰ'' میں خصائص علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ جب اہل حروراء نے خروج کیا اور ایک جگہ میں جمع ہو گئے۔ اور ان کی تعداد چھ ہزار تھی تو میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اے امیر المؤمنین! نماز میں کچھ تاخیر فرمائیں، شاید میں ان لوگوں (باغیوں) سے بات کروں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے تیرے بارے میں ان کا خوف ہے کہ وہ کہیں تجھے نقصان نہ پہنچائیں۔ میں نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنے کپڑے پہنے اور ان کی طرف چل دیا، جب میں ان کے ہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ لوگ وہاں جمع ہیں، (مجھے دیکھ کر) انہوں نے کہا: خوش آمدید! اے ابن عباس! کیسے آئے ہو؟ میں نے کہا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم مہاجرین وانصار کے پاس سے آیا ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے آیا ہوں، ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے قرآن کا نزول ہوا، وہ تم سے زیادہ قرآن کی تفسیر ومراد کو جاننے والے ہیں اور تم میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو ان کی باتیں تم کو اور تمہاری باتیں ان تک پہنچا سکے۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ بتاؤ، تم اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا اعتراض کرتے ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابن عم اور داماد اور مومنِ اول (حضرت علی رضی اللہ عنہ) پر کیا الزام تراشی اور اعتراض کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے تین شبہات ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہیں؟ خوارج نے کہا کہ ایک شبہ تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دین الٰہی میں لوگوں کو حکم (فیصل) ٹھہرایا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا اللّٰہِ'' میں نے کہا کہ ٹھیک ہے یہ ایک شبہ ہوا۔ انہوں نے کہا کہ دوسرا شبہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا لیکن ان (مقابل گروہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کے بچے اور عورتیں قید نہیں کیں اور ان کو مال غنیمت نہیں بنایا، اگر وہ لوگ (مدمقابل) کافر ہیں تو ان کی عورتیں اور اموال ہمارے لئے حلال ہیں اور اگر مسلمان ہیں تو ان کی خون ریزی ہمارے لئے حرام ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی اور شبہ؟ وہ کہنے لگے کہ ہمارا تیسرا شبہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم نامے میں اپنے نام سے ''امیر المومنین'' کا لفظ مٹا دیا، پس اگر وہ امیر المؤمنین نہیں ہیں تو پھر امیر الکافرین (العیاذ باللہ) ہوئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بس یہی تمہارے شبہادت ہیں یا ان کے علاوہ بھی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، بس یہی شبہات ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر میں تمہارے سامنے اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی آیات پڑھوں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت بیان کروں تو کیا تم اپنی بات سے رجوع کرلو گے؟ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم؟ ہاں (ہم رجوع کرلیں گے!) چنانچہ

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ تمہارا یہ شبہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دین الٰہی میں لوگوں کو کیوں حکم (فیصل) ٹھہرایا؟ تو میں تمہارے سامنے آیت پڑھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے خود چار درہم کے خرگوش کے شکار کرنے پر لوگوں کو حکم (فیصل) بنایا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ''حالت احرام میں شکار کو نہ مارو'' اس کے بعد فرمایا ''يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ''[1] ''جو تجویز کریں دو آدمی معتبر تم میں سے'' یعنی اس شکار کی قیمت کے بارے میں تم میں سے دو عادل آدمی فیصلہ کریں۔ اسی طرح زوجین کے بارے میں فرمایا: ''وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا'' [النساء:۳۵] ''اور اگر تمہیں ان دونوں (میاں بیوی) میں کشاکشی کا اندیشہ ہو تو تم ایک حکم (فیصل) مرد کے خاندان سے اور ایک حکم (فیصل) عورت کے خاندان سے بھیجو'' میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، یہ بتاؤ کہ خون اور جانیں بچانے اور ان کے مابین اصلاح کرنے کے لئے لوگوں کو حکم (ثالث) بنانا زیادہ ضروری ہے یا چار درہم کے خرگوش کے حرم میں مارنے پر حکم (ثالث) بنانا زیادہ ضروری ہے؟ انہوں نے کہا کہ خدا جانتا ہے کہ لوگوں کے خون اور ان کی جانوں کی حفاظت کرنا زیادہ اہم ہے۔ میں نے پوچھا کیا تمہارا شبہ رفع ہو گیا؟ انہوں نے کہا کہ خدا گواہ ہے کہ ہمارا شبہ دور ہو گیا۔ میں نے کہا کہ رہا تمہارا یہ شبہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا لیکن مد مقابل کے بچوں اور عورتوں کو قید نہیں کیا اور ان کو مال غنیمت نہیں بنایا؟ مجھے بتاؤ کہ کیا تم اپنی ماں سیدہ عائشہ رضی اللہ عالی عنہا کو قید کرو گے اور ان کے ساتھ وہ امور حلال سمجھو گے جو دوسری لونڈیوں کے ساتھ حلال سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ تمہاری ماں ہے؟ اگر تم لوگ ایسا سمجھتے ہو تو تم کافر ہو، اور اگر تم کہو کہ وہ ہماری ماں نہیں ہے تو تب بھی تم کافر ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهٗ أُمَّهٰتُهُمْ'' [الاحزاب:۶] ''نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔'' پس تم دو گمراہیوں کے درمیان ہو، ان سے نکلنے کی کوئی راہ بتاؤ؟ کیا تمہارا یہ شبہ بھی دور ہو گیا؟ خوارج نے کہا کہ ہاں! خدا گواہ ہے کہ ہمارا شبہ بھی دور ہو گیا۔ پھر میں نے کہا کہ رہا تمہارا یہ شبہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم نامے میں اپنے نام سے ''امیر المومنین'' کا لفظ کیوں مٹا دیا؟ کیا تمہیں یاد ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار قریش کو صلح کے معاہدے کیطرف دعوت دی تھی اور فرمایا تھا کہ یہ لکھو کہ یہ وہ معاہدہ جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کیا ہے تو انہوں نے اعتراض کیا کہ خدا کی قسم! اگر ہم آپ کو اللہ کا

---

[1] [المائدہ:۹۵]

رسول مانتے ہوتے تو آپ کو بیت اللہ سے کیوں روکتے! اور آپ کے ساتھ قتل وقتال کیوں کرتے! آپ صرف محمد بن عبداللہ لکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم! میں اللہ کا رسولؐ ہوں، خواہ یہ لوگ (کفار قریش) میری تکذیب کریں، اے علی! لکھو محمد بن عبداللہ، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے نام سے ''محمد رسول اللہ'' مٹا دیا حالاں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حضرت علی رضی اللہ عنہٗ سے افضل و برتر ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے مٹا دیا تو کیا اعتراض ہے، حالانکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا لفظ مٹانے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نبوت سے باہر نہیں ہوگئے تھے اب بتاؤ، تمہارا یہ شبہ بھی رفع ہوگیا؟ انہوں نے کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ ہاں! دور ہوگیا۔ خوارج چھ ہزار تھے، جن میں سے دو ہزار خارجیوں نے اطاعتِ امیر (حضرت علی رضی اللہ عنہٗ) کی طرف رجوع کرلیا جبکہ بقیہ چار ہزار خوارج اپنی گمراہی کے باعث مقتول ہوئے''۔[1]

حاکم وقت قتال شروع نہ کرے یہاں تک کہ وہ باغی گروہ خود ابتداء کریں۔ اگر وہ لوگ (باغی گروہ) قتال کی ابتداء کریں تو ان باغیوں سے متفرق ہونے تک قتال کرے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں باغیوں کے ساتھ قتال کیا تھا دوسری وجہ یہ ہے کہ ان باغیوں نے جماعت کی مخالفت کر کے نافرمانی کا ارتکاب کیا ہے لہٰذا ان کو اس مخالفت سے باز کرنا واجب ہوگا اور قتال کے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے ان کے ساتھ قتال کیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہٗ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے بارے میں جو منقول ہے کہ وہ فتنہ وفساد کے موقع پر کنارہ کش رہے تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اس سے عاجز ہوں اور جو شخص قدرت و طاقت نہ رکھتا ہو اس پر قتال لازم نہیں ہوتا اور جب کسی موقع پر امام وقت موجود نہ ہو جو اسے قتال کی طرف دعوت دے تو ایسے موقع پر فتنہ سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہی مناسب ہوتا ہے اور اپنے گھر میں ہی رہے۔ البتہ جب امام اسے دعوت قتال دے اور وہ قتال کی قدرت اور قوت رکھتا ہو تو ایسی صورت میں قتال سے پس وپیش کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اگر وہ باغی گروہ اپنا لشکر جمع کر چکے ہوں تو ان کے ساتھ قتال شروع کرنا جائزہ ہے تاکہ ان کے شر کا دفعیہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں ان کے ساتھ قتال نہ کرنا ان کو قوت فراہم کرنے کا سبب ہوگا اور ان میں مسلمانوں کو اذیت پہنچانے کی طاقت پیدا ہوگی اور تعداد کے اعتبار سے بھی غالب ہوں گے۔

---

[1] [المستدرک: ۲: ۱۵۰]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حاکم وقت کو خبر پہنچی کہ وہ لوگ (باغی گروہ) اسلحہ خرید رہے ہیں اور قتال کے لئے مستعد ہورہے ہیں تو انہیں گرفتار کر کے قید کرنا چاہئے، یہاں تک کہ وہ لوگ (باغی) اس فتنہ پروری سے باز آجائیں اور توبہ کریں۔ کیونکہ خروج کا عزم کرنا بھی معصیت ہے، پس وہ اس معصیت سے ان کو روکے گا اور ان کو قید کر کے ہی اس شر وفساد سے دفعیہ ممکن ہے اور مسلمان ان کی مشقت سے بھی محفوظ رہیں گے۔ اگر ان باغیوں کا مددگار کوئی دوسرا گروہ ہے تو جو لوگ زخمی ہیں انہیں قتل کیا جائے گا اور بھاگنے والوں کا تعاقب کیا جائے گا، تاکہ ان باغیوں کا شر مدفوع ہو۔ کیونکہ ان کے ساتھ حق کی طرف واپس آنے تک قتال کرنا واجب ہے اور اگر ان باغیوں کا کوئی مددگار گروہ نہ ہو تو زخمیوں کو قتل نہ کیا جائے گا اور نہ بھاگنے والوں کا تعاقب کیا جائے گا۔ کیونکہ ان مجروح کے قتل، اور مفرور کے تعاقب کے بغیر ہی شر مدفوع ہوگیا ہے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ''الطبقات'' میں محمد بن الحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے دن شکست خوردہ افراد کے ہتھیار اور گھوڑے اپنے لشکر میں تقسیم کردیئے اور فرمایا کہ جو زخمی ہو اس کو قتل نہ کیا جائے اور بھاگنے والوں کا پیچھا نہ کیا جائے اور اسلحہ وغیرہ کی یہ تقسیم بوجہ ضرورت کے تھی، ملکیت کی بناء پر نہ تھی [1]۔ (نیز دیکھئے، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ)۔ اس سے معلوم ہوا ان باغیوں کی اولاد کو قیدی نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی ان کا مال مالِ غنیمت بنایا جائے گا، کیونکہ وہ مسلمان ہیں اور اسلام جان و مال کی حفاظت کرتا ہے، البتہ ان کے اموال کو روک رکھا جائے گا کہ اس میں مسلمانوں کی مصلحت و بہتری ہے۔ جب وہ توبہ کرلیں تو ان کے اموال ان کو واپس دے دیے جائیں گے۔ کیونکہ ان کو قید کرنے کا سبب زائل ہو چکا ہے۔ اگر ان باغیوں کا اسلحہ و ہتھیار ہو تو اہل عدل کے درمیان اسے تقسیم کیا جائے گا تاکہ وہ باغیوں کے قتال میں اس کے ذریعے مدد حاصل کریں، جیسا کہ بصرہ کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل سے ثابت ہے۔ اگر اہل عدل کو اس کی ضرورت نہ ہو تو ان کے لئے اس اسلحہ وغیرہ کو روک لیا جائے گا۔ ان کے حوالہ نہیں کیا جائے گا تاکہ وہ باغی گروہ مسلمانوں کے خلاف اس کو استعمال نہ کرسکیں اور ان کے اموال کو روک لیا جائیگا۔ البتہ چوپاؤں کے لئے خرچ چھوڑا جائے گا، چوپاؤں کو بیچ کر اس کی رقم رکھ لی جائیگی اس لئے کہ یہ زیادہ فائدہ مند اور آسان ہے۔ جب ان کی سرکشی ختم ہوجائے تو حاکم ان کے اموال ان کے حوالے کردے گا۔

لڑائی کے دوران اگر فریقین میں سے کسی فریق کا مالی نقصان ہوا ہو یا کوئی مارا گیا ہو یا

---

[1] [نصب الرایۃ: ۳/۴۶۳]

زخمی ہو گیا ہو تو وہ رائیگاں ہے اس میں کوئی دیت یا قصاص یا تاوان واجب نہیں ہوگا۔ اگر کسی عادل مسلمان نے باغی کو قتل کر دیا اور قاتل اس کا وارث ہو تو اس کا وارث ہوگا، کیونکہ یہ حق کے طور پر قتل ہے جو مانعِ ارث نہیں ہے۔ اگر کسی باغی آدمی نے عادل مسلمان کو قتل کر دیا ہو اور وہ کہتا ہو کہ میں اس وقت بھی حق پر تھا اور اب بھی حق پر ہوں تو اس کا وارث ہوگا اور کہتا ہو کہ میں نے اس کو قتل کیا اور میں جانتا ہوں کہ میں امرِ باطل پر ہوں تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس صورت میں وارث نہ ہوگا، کیونکہ اس نے ناحق اور بلا تاویل اس کو قتل کیا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ باغی دونوں صورتوں میں وارث نہ ہوگا۔

باغیوں کی عورتوں اور بچوں کا حکم

باغیوں کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں، اندھوں اور اپاہج لوگوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ لوگ قتال کے اہل نہیں ہیں اور جب کفار کے ساتھ جنگ کی صورت میں انہیں قتل نہیں کیا جاتا تو یہاں پر بطریق اولیٰ قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر ایک عورت مردوں کے ساتھ مل کر قتال کرے تو حالت قتال میں اس کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جب گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دی جائے تو اس کی آزادی کے پیش نظر اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

حظر واباحت کے مسائل

حظر کا لغوی معنی روکنا ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں حظر اس کام کو کہتے ہیں جن کا کرنا شرعاً ممنوع ہو اور اباحت کا لفظ حظر کے مقابل استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مباح وہ کام ہے جس کے کرنے اور نہ کرنے کی مکلّف کو اجازت ہو اور وہ اس پر نہ ثواب کا مستحق ہو اور نہ عذاب کا سزاوار ہو۔

بعض علماء حظر واباحت کو استحسان سے نام زد کرتے ہیں، کیونکہ اس میں ان امور کو بیان کیا جاتا ہے جنہیں شریعت نے اچھا قرار دیا یا برا گردانا ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ حظر واباحت کے اکثر مسائل استحسان پر مبنی ہیں، قیاس کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

صاحب ''الاختیار'' نے حظر اور اباحت کا ذکر الکراہیۃ کے نام کے ساتھ کیا ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مکروہ فعل حرام ہے۔ پس جس صورت میں نص موجود نہ ہو اس پر حرمت کا اطلاق بھی نہیں ہوگا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مکروہ (مطلق) حرام کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ حلت اور حرمت کی دلیلیں متعارض ہیں۔

اجنبی عورت کو دیکھنا

مرد کے لئے جائز نہیں کہ وہ اجنبی عورت کو بلا ضرورت دیکھے۔ اگر مردوں کے ساتھ لین دین کے وقت ضرورت کی بناء پر اس کا ہاتھ یا چہرہ نظر آجائے اور خواہش نفسانی نہ ہو تو وہ مستثنیٰ ہے۔

اس مسئلہ میں اصل یہ آیت کریمہ ہے:

''قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ'' [النور:۳۰]

''مسلمان مردوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں''

نیز فرمایا:

''وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ [النور:۳۱]

''اور آپ مسلمان عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ (بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں'

اگر مرد کو اپنے آپ پر امن نہ ہو تو بلا حاجت ضروریہ اس کا چہرہ دیکھنا اس کے لئے جائز

نہیں ہے۔ کیونکہ ''الضرورات تبیح المحظورات'' یعنی ضرورتیں، ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔ جس طرح حالت اضطرار میں شراب کا پینا، مردار کا کھانا، خنزیر کا گوشت کھانا اور غیر کا مال لینا مباح ہو جاتا ہے اسی طرح ضرورت کی صورت میں اجنبی عورت کا چہرہ دیکھنا مباح ہوگا۔ کیونکہ ضرورت کی صورتیں مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ'' [الحج:۷۸]

''اور اللہ تعالیٰ نے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

نیز فرمایا:

''لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا'' [البقرہ:۲۸۶]

''اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے۔''

ضرورت کے موقع پر منع کرنا تنگی اور تکلیف مالا یطاق ہے۔

چنانچہ طبیب عورت کے مرض کی جگہ دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ عورت کا علاج اس کے بغیر ممکن نہیں، خواہ خواہش نفس کیساتھ ہو۔ مرض کی جگہ کے ماسوائے حصے کو ڈھانپ کر پھر دیکھے اور حتیٰ الامکان نظریں نیچی رکھے، کیونکہ قاعدہ ہے کہ '' الضرورة تتقدر بقدر الضرورة'' یعنی ضرورت بھی بقدر ضرورت جائز ہوتی ہے۔

دایہ کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ بچے کی ولادت کے وقت اور عورت کی بکارت معلوم کرنے کے وقت عورت کی شرمگاہ کو بقدر ضرورت دیکھے۔

بہتر ہے کہ عورتوں کو فن طب (ڈاکٹری) سکھا لیا جائے، کیونکہ ایک جنس کا اپنی جنس کی طرف دیکھنا زیادہ آسان اور اخف ہوتا ہے بہ نسبت مرد کے دیکھنے کے بلکہ فتنے سے دوری کا بھی ذریعہ ہے۔

قاضی جب کسی عورت کے متعلق فیصلہ کرنا چاہے یا گواہ گواہی دینا چاہے تو ان کے لئے اس عورت کا چہرہ دیکھنا جائز ہے، اگرچہ انہیں اشتہاء نفس کا اندیشہ ہو۔ کیونکہ بواسطہ قضاء اور اداءِ شہادت کے طریقے سے لوگوں کے حقوق کا احیاء ضروری ہے۔ اور قاضی اور گواہ محض قضاء اور شہادت کی نیت کریں، صرف خواہش نفس کے ساتھ اس کو دیکھنے کا ارادہ نہ کریں۔ جب ایک مرد سے شہادت طلب کی جائے تو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ اشتہاء نفس کی صورت میں تحمل شہادت کے لئے اس عورت کو دیکھے! تو اصح یہ ہے کہ اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ بخلاف حالت اداءِ کے کہ اداء شہادت کے وقت دیکھنا جائز ہے۔

مرد اپنی محرم عورتوں کو دیکھ سکتا ہے۔ خواہ وہ عورتیں نسب کے اعتبار سے اس پر حرام ہوں یا رضاعت کے اعتبار سے حرام ہوں یا مصاہرت (دامادی رشتہ داری) کی بناء پر حرام ہوں۔ کیونکہ ان عورتوں کی حرمت ابدی ہے۔ لہٰذا اشتہاء سے امن کی صورت میں محرم عورتیں دیکھنے اور ہاتھ لگانے (کے جواز) میں برابر ہونگی۔ پس وہ (مرد) ان کا چہرہ، سر، سینہ، دونوں پنڈلیوں، دونوں بازوں اور بالوں کو دیکھ سکتا ہے۔ لیکن ان کا پیٹ اور پشت نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورت (بیوی) کو ماں کی پشت کے ساتھ تشبیہ دینے کی صورت میں حرام قرام دیا ہے۔ پس اگر اس حصے کی طرف دیکھنا حرام نہ ہوتو اس کے ساتھ تشبیہ دینے کی صورت میں عورت کو حرام قرار نہ دیا جاتا، اور جب پشت کی طرف دیکھنا حرام ہوا تو پیٹ بطریق اولیٰ حرام ہوگا، اس لئے کہ پیٹ اشتہاء نفس پر زیادہ ابھارتا ہے۔

محرم عورتوں کا چہرہ، سر، سینہ، پنڈلیاں، بازو اور بال دیکھنے کے جواز پر یہ آیت مبارکہ اصل اور بنیاد ہے۔ "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْ لَتِهِنَّ......" [النور:۳۱] اس آیت میں "زینت" سے مراد مواقع زینت ہیں، اس لئے کہ صرف کپڑوں کو یا زیورات اور زینت کے دیگر انواع کو دیکھنا تو اجانب اور اقارب دونوں کے لئے جائز ہے، لہٰذا "زینت" سے مراد زینت کی جگہیں ہونگی، جیسے سر، جو تاج رکھنے کی جگہ ہے، بال اور کان، بالیاں وغیرہ لگانے کی جگہ ہے، گردن ہار ڈالنے کی جگہ ہے، سینہ لاکٹ وغیرہ پہننے کی جگہ ہے، اور بازو کنگن پہننے کی جگہ ہے، پنڈلیاں پازیب وغیرہ پہننے کی جگہ ہے۔

میاں اپنی بیوی کا سارا بدن دیکھ سکتا ہے اور اس کے لئے اپنی بیوی کے بدن کا چھونا اور اس کی شرمگاہ اور دوسرے حصوں سے نفع اٹھانا جائز ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ"[1]

"اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے، پس اس میں ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔"

خاوند کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی کی دبر سے استمتاع کرے" (صحبت کرے) اور نہ ہی حالت حیض میں اس کی شرمگاہ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور وہ حمید الاعرج رحمۃ اللہ علیہ سے اور وہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ

---

[1] [المعارج:۲۹،۳۰]

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں سے دبر میں صحبت کرنا حرام ہے۔''[1] نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کی طرف نہیں دیکھتے جو اپنی بیوی سے اس کی دبر میں صحبت کرتا ہو''[2] نکاح کا پیام دینے والا اپنی مخطوبہ (جسے نکاح کا پیام دیا گیا ہو) کے چہرے اور ہاتھ کو دیکھ سکتا ہے، خواہ اسے اشتہاء کا خوف ہو۔ کیونکہ جب حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ جاؤ اور اس کو دیکھ لو، کیونکہ یہ چیز تم دونوں میں محبت پیدا ہونے کے زیادہ لائق ہے۔''[3] چنانچہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ گئے اور انہوں نے ایسا ہی کیا، جب شادی ہوئی تو انہوں نے بیوی سے موافقت کا ذکر بھی کیا۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو پیغام نکاح دے تو اگر ہو سکے تو اس چیز (چہرہ) کو دیکھ لے جو چیز اس کے نکاح کا سبب بنی ہے'' (راوی کہتے ہیں کہ) پس میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح دیا، میں اس سے نکاح کی رغبت رکھتا تھا، تو میں نے اس کے چہرے کو دیکھا، پھر اس سے شادی کی۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ ''معالم السنن'' میں لکھتے ہیں کہ اس شخص (نکاح کے پیام بر) کے لئے عورت کا صرف چہرہ دیکھنا جائز ہے، عورت کی پردے کی چیز نہ دیکھے، خواہ عورت اس کو اجازت دے یا نہ دے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے۔ لہٰذا خاطب (نکاح کا پیغام دینے والا) مخطوبہ کا صرف چہرہ اور اس کی ہتھیلیاں دیکھنے کا مجاز ہے۔[4]

ایک عورت دوسری عورت کا سارا بدن ماسوائے اعضائے مستورِ عورت (قابل ستر اعضاء) کے دیکھ سکتی ہے۔ یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ دیکھنا تو ممنوع ہے اس کے ماسوا کا جائز ہے کیونکہ عورت کے لئے دوسری عورت کے صرف اعضائے ستر کا دیکھنا بالاجماع ممنوع ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں پر شہوت بھی معدوم ہے۔ اگر عورت کو شہوت کا اندیشہ ہو یا اس کا گمان غالب ہو تو فتنہ سے بچنے کے لئے احتیاطاً نہ دیکھے اور جس کو دیکھنا جائز ہو اس کو چھونا بھی جائز ہے، کیونکہ حکم میں دونوں برابر ہیں، الا یہ کہ اسے (عورت کو) شہوت کا خوف ہو تو چھونا جائز نہیں ہے۔

مرد کو دیکھنا

ایک مرد، دوسرے مرد کا سارا بدن دیکھ سکتا ہے، صرف ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ستر میں

---

1. [الآثار:۱۳۵] 2. [ابن ماجہ:۶۱۹/۱]
3. [سنن ابن ماجہ:۵۹۹/۱] 4. [معالم السنن:۱۹۶/۳]

داخل ہے۔ اس کا دیکھنا جائز نہیں ہے، خوبرو بے ریش لڑکے کا بھی یہی حکم ہے جبکہ شہوت سے امن ہو۔ ناف، ستر میں داخل نہیں ہے۔ البتہ گھٹنا ستر میں شامل ہے کیونکہ مرد حالت احرام میں بغیر نکیر (ممانعت) کے ایک ہی تہبند میں راستوں میں چلتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جسم کو دیکھنا جائز ہے عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ مرد کا اتنا حصہ دیکھ سکتی ہے جو دوسرا مرد دیکھ سکتا ہے۔ جبکہ اسے شہوت سے امن ہو، اس لئے کہ جو حصہ ستر میں داخل نہیں ہے اس کے دیکھنے کے جواز میں مرد اور عورت برابر ہیں۔

مرد کے منہ کو بوسہ دینا اور معانقہ کرنا

ایک مرد کا دوسرے مرد کے منہ کو بوسہ دینا یا اس کے کسی حصے کو چومنا یا معانقہ کرنا، وجود شہوت کی صورت میں مکروہ ہے۔ جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے دریافت کیا، یارسول اللہ! کیا ایک آدمی ملاقات کے وقت اپنے دوست کے سامنے جھک سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''نہیں'' اس نے پوچھا کہ کیا اس سے چمٹ کر بوسہ دے سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''نہیں'' اس نے پوچھا کہ کیا اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کر سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہاں''[1] لیکن اگر شہوت کا خطرہ نہ ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جعفر بن ابی طالب کی حبشہ سے واپسی پر ان سے معانقہ کیا اور ان کی دو آنکھوں کے درمیان (پیشانی) کو بوسہ دیا اور وہ فتح خیبر کا موقع تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں نہیں جانتا کہ مجھے ان دو باتوں میں سے کس بات سے زیادہ خوشی ہو رہی ہے، فتح خیبر سے یا جعفر رضی اللہ عنہ کی آمد سے۔''

البتہ مصافحہ کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں مصافحہ کا رواج تھا؟ انہوں نے کہا کہ ہاں۔''[2] عالم دین اور عادل حکمران کے ہاتھ چومنا جائز ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پاؤں چومتے تھے۔ چنانچہ حدیث وفد عبدالقیس میں ہے کہ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے سفر کے کپڑوں میں آئے اور جلدی سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا۔[3]

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عالم دین اور عادل حکمران کا ہاتھ چومنا سنت ہے

---

[1] [سنن الترمذی: ۱۷۲۴/۳/۴] [2] [صحیح البخاری: ۸/۲۲۸۷] [3] [مسند احمد بشرح البناء: ۳۵۰/۱۷]

(یہ کہہ کر) اٹھے اور عبداللہ بن المبارک کے سر پر بوسہ دیا۔

اجنبی عورتوں کو دیکھنے، ان کو چھونے اور ان کے پاس آنے میں اور ان کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے میں مطلقاً ممانعت ہے خواہ وہ آدمی تندرست ہو یا مخنث ہو یا خصی ہو، کیونکہ آیت سب کو شامل اور حاوی ہے۔ البتہ چھوٹا بچہ نص کی بناء پر مستثنیٰ ہے۔

عورتوں سے مصافحہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں سے مصافحہ نہیں فرماتے تھے۔ حضرت امیمہ بنت رقیقہ کہتی ہیں کہ ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے مصافحہ کیوں نہیں کرتے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، میرا ایک عورت سے بات کرنا سو عورتوں سے بات کرنے کے برابر ہے"[1]

ریشم کا لباس پہننا

ریشم سے مراد خالص ریشم ہے یعنی وہ کپڑا جسے ریشم کے کیڑے نے بنایا ہو۔ ریشم کا لباس عورتوں کے لئے حلال ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ریشم کا جوڑا ہدیہ کے طور پر پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ جوڑا میری طرف بھیج دیا، میں نے اسے پہن لیا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر ناراضگی کے آثار دیکھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں نے یہ جوڑا تمہاری طرف اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تم اسے پہن لو، بلکہ اس لئے بھیجا کہ تم اس کے ٹکڑے کر کے اس کی چادریں بنا کر عورتوں میں تقسیم کردو۔"[2] نیز حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (گھر سے) باہر آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ریشم کا کپڑا اور سونا تھا، پھر فرمایا: "یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام اور عورتوں کے لئے حلال ہیں۔"[3]

مردوں کے لئے ریشم کا پہننا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "دنیا میں ریشم وہ پہنتے ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔"[4] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ "ریشم اور دیباج نہ پہنو"[5]

---

۱ [مسند احمد بشرح البناء: ۳۵۰/۱۷] ۲ [صحیح مسلم: ۴۹/۴] ۳ [الشعب: ۱۳۳/۵]
۴ [فتح الباری: ۲۴۴/۱] ۵ [صحیح مسلم: ۱۳۷/۶]

مردوں کے لئے ایسا کپڑا پہننا جائز ہے جس کپڑے کے حاشیے (کنارے) پر دو انگل کے برابر ریشم استعمال کی گئی ہو نے جیسا کہ ابوعثمان النھدی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہماری طرف یہ حکمنامہ آیا، اس وقت ہم آذربیجان میں تھے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریشم سے منع فرمایا ہے، مگر اس قدر اجازت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو انگلیوں (شہادت والی اور درمیان والی انگلی) کے برابر مقدار کا ذکر کیا۔[1] کیونکہ اس میں ریشم کپڑے کے تابع ہے، لہٰذا ممانعت کا حکم نہیں ہوگا۔ مردوں کے لئے کسی عذر کی بناء پر بھی ریشم کا پہننا جائز ہے جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو سفر میں ریشم کا لباس پہننے کی اجازت دی کیونکہ ان دونوں کو خارش تھی یا کوئی اور تکلیف تھی۔''[2]

اس حدیث میں ''سفر'' کی قید احترازی نہیں ہے بلکہ اتفاقی ہے۔ یعنی ضرورت کی بناء پر ریشم پہننا جائز ہے۔ خواہ حالت سفر ہو یا حالت حضر۔

ریشم کا تکیہ یا بستر بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ راشد مولیٰ بنی تمیم روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مجلس میں ریشم کا تکیہ یا گدا دیکھا ہے۔ اور یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ریشم کی ممانعت کا تعلق لباس سے ہے اور یہ لباس نہیں ہے، لہٰذا اس کو لباس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائیگا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ تھوڑی مقدار میں اس کا پہننا حلال ہے یعنی ریشم کی دھاریاں ہوتو حلال ہے اسی طرح تھوڑا سا استعمال بھی حلال ہے۔ حتیٰ کہ ریشم کا دثار (اوپر اوڑھا جانے والا کپڑا) بنانا بالاجماع جائز ہوگا۔ اور رہا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے اور ریشم ودیباج کا لباس پہننے اور ریشم پر بیٹھنے سے منع فرمایا''[3] تو اس میں احتمال ہے کہ ممانعت کا تعلق اکیلے بیٹھنے سے نہ ہو بلکہ پہننے اور بیٹھنے دونوں کے مجموعہ سے ہو، اور صرف اس روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ''اس پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا'' ورنہ اکثر روایات میں یہ اضافہ نہیں ہے۔ نیز بیٹھنے کو پہننے سے تعبیر نہیں کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ ''پس میں اپنی ایک چٹائی کی طرف اٹھا جو تادیر استعمال کی وجہ سے سیاہ ہوگئی تھی'' اس روایت میں بھی ''من طول مالبس'' کے الفاظ ہیں جس کا معنی ہے کہ زیادہ استعمال کی بناء پر سیاہ ہو چکی تھی۔ اب اس میں جلوس کی بجائے لبس کا لفظ استعمال ہوا ہے، معلوم ہوا کہ ہر چیز کے پہننے کا مفہوم اس کے مطابق ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف

[1] [عمدة القاری:۱۱/۲۲] [2] [صحیح مسلم:۱۴۳/۵] [3] [فتح الباری:۲۴۶/۱۰]

اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مکروہ، حرام کے معنی میں ہے، کیونکہ نہی میں عموم ہے۔

عورتوں کیلئے سونا چاندی کے زیورات پہننا جائز ہے، جیسا کہ سابقہ دلیل سے معلوم ہوا۔

مردوں کے لئے سونے کا زیور پہننا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو اسے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا کہ کیا تم آگ کا انگارا لے کر اسے اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہو۔''[1]

مردوں کے لئے چاندی کا زیور استعمال کرنا (پہننا) بھی جائز نہیں ہے، البتہ ایک مثقال یا اس سے کم مقدار میں جائز ہے، بعض کے نزدیک اتنی چاندی جو ایک مثقال وزن کو نہ پہنچتی ہو وہ جائز ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو امام نسائی وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، اس نے لوہے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (دیکھ کر) فرمایا کہ ''کیا بات ہے کہ میں جہنمیوں کا زیور تجھے پہنے ہوئے دیکھتا ہوں؟'' اس آدمی نے فوراً اس کو اتار دیا، پھر (دوسرے موقع پر) آیا اور اس نے پیتل کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (دیکھ کر) فرمایا کہ ''کیا بات ہے کہ مجھے بتوں کی بدبو تجھ سے آ رہی ہے؟ اس آدمی نے اس کو بھی اتار دیا۔ پھر اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! پھر میں کس دھات کی انگوٹھی بناؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''چاندی کی اور ایک مثقال پورا نہ ہو''[2]

اسی حدیث کے پیش نظر لوہے اور پیتل کی انگوٹھی پہننا مرد اور عورت دونوں کے لئے مکروہ ہے، کیونکہ یہ اہل جہنم کا زیور ہے۔ سونے اور چاندی کے دانت بنوانا جائز ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چاندی کی ناک بنانے کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے سونے کا بنانا بھی جائز ہوگا۔ اور یہ حالت اضطرار میں بوقت ضرورت جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت عرفجہ بن اسعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''زمانہ جاہلیت میں جنگ کلاب میں ان کی ناک ضائع ہوگئی تھی، انہوں نے چاندی کی ناک بنوائی تو اس سے بدبو آنے لگی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو سونے کی ناک بنانے کی اجازت دی''[3]

سرپرست کے لئے مکروہ ہے کہ وہ بچے کو سونا، چاندی یا ریشم پہنائے، کیونکہ جب ان چیزوں کی حرمت مردوں کے لئے ثابت ہے تو ان چیزوں کا پہننا بھی حرام ہوگا اور پہنانا بھی حرام ہوگا۔ اور سرپرست پر واجب ہے کہ بچے کو دین کے احکام پر چلنے کا عادی بنائے تا کہ اس سے الفت

---

[1] [صحیح مسلم: ۲۵۱:۴] [2] [سنن النسائی: ۱۸۲/۸] [3] [سنن النسائی: ۱۶۳/۸]

ومحبت پیدا ہو، جیسے نماز روزہ وغیرہ۔ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا، پینا، تیل لگانا اور خوشبو لگانا مردوں اور عورتوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ اسی طرح استعمال کی تمام انواع ممنوع ہیں جیسے سونے یا چاندی کے چمچے سے کھانا یا سونے یا چاندی کے گلاس میں پینا یا سونے چاندی کی قلم دوات، یہ سب ناجائز ہیں۔ لیکن اگر سونے کے برتن سے کھانا نکال کر دوسرے برتن میں ڈال کر کھایا جائے تو اس میں کوئی کراہت نہیں ہوگی۔ پس اگر عطر کی شیشی سونے کی ہو، اور اسے کسی دوسری شیشی میں ڈال کر استعمال کیا جائے تو اس خوشبو کو دوسری شیشی سے استعمال کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ جن برتنوں پر سونے چاندی کا پانی چڑھایا گیا ہو، یا گھڑیوں پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہو تو اگر سونا اور چاندی خالص نہ ہو تو وہ نہ ہونے کی طرح ہے اور اس کا استعمال بالاتفاق جائز ہے۔

ذخیرہ اندوزی کا حکم

انسانوں اور جانوروں کی خوراک کا ایک جگہ میں سٹور کر لینا کہ اس سے لوگوں کو نقصان پہنچے حرام ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے:

''وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ'' [الحج:۲۵]

''اور جو اس میں الحاد کا ظلم کے ساتھ ارادہ کرتا ہو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

نیز حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو شخص چالیس روز تک غلہ ذخیرہ کرے تو وہ اللہ سے بری ہے اور اللہ اس سے بری ہے۔'' نیز ذخیرہ اندوزی سے لوگوں پر تنگی ہوتی ہے، اس لئے جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر ایک بڑا شہر ہو اور کوئی شخص ذخیرہ اندوزی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا، کیونکہ شہر والوں کو کوئی ضرر نہیں ہوگا اور اس شخص نے اپنی ہی مملوکہ چیز کو جمع کیا ہے۔

اگر قاضی کے سامنے ذخیرہ اندوز شخص کا معاملہ پیش ہو تو قاضی اسے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خوراک سے جو زائد ہو اس کے بیچنے کا حکم دے گا اگر وہ انکار کرے تو اس کو بیچ دے گا۔ حاکم کے لئے جائز نہیں کہ وہ اشیاء کے نرخ مقرر کرے، ہاں البتہ اگر ارباب طعام (غلے کے مالکان) قیمت کے معاملے میں بے انتہاء زیادتی کریں تو تجربہ کار لوگوں کے مشورے سے نرخ مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ ایسا کرنے میں مسلمانوں کے حقوق کو ضیاع سے بچانا ہے۔

مختلف مسائل

فاسق کا قول معاملات میں مقبول ہوگا، کیونکہ لوگوں میں ایسے لوگ کثرت سے موجود ہیں۔ اگر معاملات میں عدالت (عادل ہونا) کی شرط لگا دی جائے تو لوگ تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے، حالانکہ دین میں تنگی نہیں ہے۔ لہٰذا دفع حرج کے لئے ایک آدمی کا قول معتبر ہوگا خواہ وہ فاسق ہو یا عادل ہو، مذکر ہو یا مؤنث، مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

لیکن دیانات میں عادل کا قول ہی معتبر ہوگا خواہ مرد ہو یا عورت، کیونکہ اس میں صدق اور سچائی اس کے دین وعقل کے اعتبار سے اکثر موجود ہوتی ہے۔ بناء بریں اخبارِ نبویہ ﷺ کیلئے ایک عادل آدمی کی روایت مقبول ہوگی۔ اس میں ہم نے عدالت کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ عدالت کا وقوع کثیر نہیں ہے۔ جیسے معاملات کا وقوع کثیر ہے۔ اور دیانات کی مثال جیسے جہت قبلہ، پانی کی طہارت، رمضان میں افطار صوم کا جواز اور ضرر کے ڈر سے پانی کے ہوتے ہوئے بھی تیمّم کرنا وغیرہ۔ کیونکہ دیانات میں فاسق بظاہر جھوٹ کہے گا تاکہ دینی عداوت کی بناء پر وہ مسلمان کو ضرر پہنچائے۔ لیکن اگر غالب گمان فاسق کے سچے ہونے کا ہو تو پھر اس کا قول مسموع ہوگا۔

سلام کرنے کا حکم

جو شخص سلام کو سنے اس پر سلام کا جواب دینا فرض ہے۔ اگر کچھ لوگ سلام کا جواب دیدیں تو دوسروں سے اس کا وجوب ساقط ہو جائیگا۔ سلام کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا ایک فریضہ ہے۔ کیونکہ سلام کا جواب نہ دینا ایک مسلمان کی اہانت ہے اور استخفاف ہے، اور اہانتِ مسلم حرام ہے۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ کرام نے مسلمانوں کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ سلام کی ابتداء کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا فرض ہے۔

سلام کرنے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق رکھے کہ دونوں ایک دوسرے سے ملیں تو ایک دوسرے سے پہلوتہی کریں ان دونوں میں اچھا وہ ہے جو سلام میں پہل کرے''[1]

ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دو آدمی جب ایک دوسرے سے ملاقات کریں تو ان میں سلام پہلے کون کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''ان میں جو اللہ تعالیٰ کا زیادہ قرب رکھتا ہو''[2] سلام کا جواب دینا اس وقت درست شمار ہوگا جب دوسرا اسلام کی آواز کو سنے

---

[1] [صحیح البخاری: ۶۵/۸] [2] [سنن الترمذی: ۱۵۹/۴]

گا، کیونکہ سلام کا جواب اس وقت بنے گا جب مخاطب اس کے سلام (کے جواب) کو سنے گا، لیکن اگر مخاطب بہرہ ہو تو پھر بہتر ہے کہ ہونٹوں کو ہلا کر اس کے سلام کا جواب دے۔ ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنا اور زبان سے الفاظ ادا نہ ہو تو یہ مکروہ ہے۔ یہ تحیہ (سلام) نہیں ہے۔ اور یہ طریقہ یہود و نصاریٰ کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے غیر کے ساتھ مشابہت اختیار کرتا ہو۔ یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو، کیونکہ یہود انگلیوں کے اشارے سے سلام کرتے ہیں اور نصاریٰ ہتھیلی کے اشارے سے سلام کرتے ہیں۔''[1]

بچے کو سلام کرنا

بچے پر شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے سلام کیا جائے۔ نیز تعلیم و تادیب بھی یہ ہے کہ اسے سلام کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں بچہ تھا اور بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف آپہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سلام کیا، پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک پیغام دے کر کہیں بھیجا اور خود ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے یا فرمایا کہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، یہاں تک کہ میں واپس آگیا''[2]

اور بچے کو سلام کرنا اس صورت میں ہے جب وہ سلام کا مفہوم سمجھتا ہو، اگر وہ سلام اور اس کا جواب نہ سمجھتا ہو تو اس کو سلام نہ کیا جائے۔

عورتوں کو سلام کرنا

اجنبی جوان عورتوں کو سلام کرنا مکروہ ہے اور جوان عورت کے لئے اجنبی آدمی کے سلام کا جواب بلند آواز سے دینا بھی مکروہ ہے تاکہ فتنے سے حفاظت رہے۔ اگر فتنے کا اندیشہ نہ ہو جیسے وہ عورت بوڑھی ہو تو پھر اسے سلام کرنا مکروہ نہیں ہوگا۔ اور اس بوڑھی عورت کے لئے بھی سلام کا جواب بلند آواز میں دینا مکروہ نہیں ہوگا۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جمعہ کے دن خوش ہوتے تھے۔ (راوی کہتے ہیں) میں نے پوچھا کہ کیوں؟ انہوں نے فرمایا کہ ہماری ایک بوڑھی عورت تھی جو (مدینہ کے کھجور کے درخت) بضاعہ کی طرف کسی کو بھیجتی تھی اور چقندر کی جڑیں ہنڈیا میں ڈال دیتی تھی۔ اور جو کے دانے پیس لیتی تھیں۔ جمعہ کی نماز پڑھ کر ہم لوگ اس کے پاس جاتے اور اسے سلام کرتے، پھر وہ بوڑھی عورت وہ کھانا ہمیں پیش کرتی جس کی وجہ سے ہم بہت خوش

[1] [سنن الترمذی: ۱۵۹/۴] [2] [سنن ابی داؤد: ۳۵۲/۴]

ہوتے تھے اور ہم لوگ جمعہ کے بعد وہی کھانا کھاتے تھے اور قیلولہ کرتے تھے۔"[1]

چند فطری امور

ناخن تراشنا، بغلوں کے بال، زیرِ ناف بال اور مونچھیں مونڈنا حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی سنت ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سنت پر عمل بھی کیا ہے اور امت کو اس کا حکم بھی دیا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ "شرح الآثار" میں فرماتے ہیں کہ "مونچھوں کے بال کم کرنا (کاٹنا) بہتر ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ مونچھیں اتنی تراشی جائیں کہ اوپر والے ہونٹ سے متصل بالوں کا حصہ کم ہو جائے (صاف نظر آئے)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مونڈنا سنت ہے اور وہ تراشنے سے بہتر ہے اور یہی احناف کا قول ہے اس لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "احفوا الشارب واعفوا اللحیۃ' احفاء کا معنی ہوتا ہے استیصال (جڑ سے صاف کرنا)۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہوگا کہ مونچھوں کو خوب صاف کرو اور داڑھی کو بڑھاؤ۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے "اعفاء لحیہ" کا مطلب یہ نقل کیا ہے کہ "داڑھی کو چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ وہ بڑھ جائے اور گھنی ہو جائے اور داڑھی میں تقصیر سنت ہے۔ تقصیر لحیہ یہ ہے کہ آدمی اپنی داڑھی کو ہاتھ سے پکڑے تو جو حصہ قبضہ سے زائد ہو اس کو کاٹ دے، کیونکہ لحیہ (داڑھی) ایک زینت ہے اور اس کی کثرت کمالِ زینت ہے جبکہ اس کی بے جا طوالت خلاف سنت ہے۔

ناخنوں کو تراشنے اور بالوں کو مونڈنے کے بعد ان کو کسی جگہ دفنا دینا بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتاً ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتاً"[2]

""کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا"

اگر کہیں ڈال دے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے، البتہ بیت الخلاء اور غسل خانے میں ڈالنا مکروہ ہے، کیونکہ وہ قابل احترام اجزا (حصہ بدن) ہیں۔

ختنہ کرانا مردوں کے لئے سنت ہے اور فطرت دین میں سے ہے۔ بچیوں کے کان چھیدنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ زینت کے حصول کے لئے تکلیف دینا ہے۔

آپریشن کا حکم

انسان کو اس کی مصلحت بہتری کی خاطر تکلیف دینا جائز ہے۔ جیسے آپریشن کے کام۔

---

[1] [صحیح البخاری: ۶۸/۸]　[2] [المرسلات: ۲۵، ۲۶]

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایسے کام کیے گئے ہیں اور آپ ﷺ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔

حاملہ عورت جب عسر ولادت سے دوچار ہو اور اس کے پیٹ سے بچے کا نکالنا سوائے اس کے ممکن نہ ہو کہ اس پیٹ کو کاٹا جائے اور ماں کی جان جانے کا خطرہ ہو تو اس کے آپریشن کی اجازت ہے۔

جب تک بچے کی خلقت (تخلیق) شروع نہ ہو تو اسقاط حمل کی صورت میں وہ عورت گنہگار نہ ہوگی۔ اور یہ چالیس دن کی مدت ہے اس سے پہلے پہلے اسقاط کروانے میں گنہگار نہ ہوگی۔ چالیس دن کے بعد اسقاط حمل جائز نہیں ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث مروی ہے کہ جب نطفے پر بیالیس راتیں گزر جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں جو اس نطفے کی تخلیق اور اس کی صورت بناتا ہے اور اس کے کان اور آنکھیں بناتا ہے۔"[1]

مرغوں کو آپس میں لڑانا اور شکاری پرندوں، جیسے عقاب، باز وغیرہ کو پرندے پکڑنے اور ان کو مارنے کے لئے سدھانا جائز نہیں ہے، البتہ مذبوح کی تعلیم کے لئے استعمال کرنا جائز ہے۔

ایک آدمی ظالموں اور شریروں کے پاس اس غرض سے جاتا ہے کہ اپنے آپ سے ان کے شر اور ظلم کو دور کرے تو اگر وہ آدمی لوگوں میں مشہور ہو اور ان کا مقتدا ہو تو ایسا کرنا اس کے لئے مکروہ ہوگا۔ کیونکہ لوگ سمجھیں گے کہ وہ بھی اس شر اور ظلم پر راضی اور اس سے مطمئن ہے۔ پس ایسا کرنا اہل حق کے لئے ذلت کا باعث بنے گا اور اگر وہ شخص لوگوں میں معروف ومشہور نہ ہو تو پھر ایسے عمل میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں ہوگا۔

پردے لٹکانے کا حکم

کھڑکیوں کو پردوں سے ڈھانپنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس سے پردہ داری ہوگی اور اس میں فائدہ بھی ہے۔ اور اسے چاہئے کہ اس کی نیت کرے کہ پردہ رہے۔

عیش وعشرت کے لئے حلال کام میں مال خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جب تک اسراف اور تبذیر کی حد تک نہ پہنچے۔ جو شخص بقدر کفایت مال پر قناعت اختیار کرے اور باقی مال کو ایسے کاموں میں صرف کرے جو آخرت میں اس کے لئے مفید ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہیں۔ البتہ جواز کے اعتبار سے اس

---

[1] [صحیح مسلم: ۲۶۴۵]

کے لئے جائز ہے کہ فرائض کے ادا کرنے کے بعد اسے حلال کاموں میں صرف کرے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِىٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ" [الاعراف:۳۲]

"آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے؟"

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ جس طرح اس کی دی ہوئی عزیمت کو بجالایا جائے اسی طرح اس کی دی ہوئی رخصت کو بھی بجالایا جائے۔ حدیث میں ہے کہ "قیامت کے روز انسان کے قدم اپنی جگہ سے اس وقت تک نہیں ہٹیں گے جب تک کہ اس سے چار چیزوں کے متعلق سوال جواب نہ ہو جائے، ایک اس کی عمر کے بارے میں کہ اس کو کن کاموں میں فنا کیا؟ دوسرا جوانی کے بارے میں کہ اسے کہاں ختم کیا؟ اور تیسرا مال کے بارے میں کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور چوتھا یہ کہ اپنے علم پر کیا عمل کیا؟۔"

ایک مسلمان پر کیا واجب ہے

مسلمان پر واجب ہے کہ وہ چند امور کی پابندی کرے۔ (۱) ظاہری اور باطنی بے حیائی کے امور سے اجتناب کرنا۔ (۲) فرائض کی بروقت اور تمام شرائط و آداب کی رعایت رکھتے ہوئے ادائیگی کرنا۔ (۳) حرام کھانے اور ناجائز طریقے سے مال کمانے سے احتراز کرنا۔ (۴) کسی مسلمان پر ظلم و زیادتی یا معاہدے کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ اس کے علاوہ کچھ امور ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں وسعت اور گنجائش بخشی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ان امور میں اپنے اوپر بے جا تنگی نہ کریں۔

حدیث پاک میں ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو وعظ کرتے ہوئے قیامت کا ذکر فرمایا جس کو سن کر لوگوں کے دل پسیج گئے اور وہ رونے لگے، چنانچہ کچھ لوگ حضرت عثمان بن مطعون رضی اللہ عنہ کے گھر میں جمع ہوئے اور اس پر اتفاق کیا کہ وہ دنیا سے تعلق ترک کر دیں گے، اپنے آلہ تناسل کو کاٹ دیں، ٹاٹ پہنیں گے، ہمیشہ کے لئے روزے رکھیں گے، راتوں کو قیام کریں گے، بستر پر نہیں سوئیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے اور عورتوں اور خوشبو کے قریب نہیں

جائیں گے اور زمین کی سیر وسیاحت کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب ان کی یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''کیا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم لوگوں نے ان ان باتوں پر آپس میں اتفاق کرلیا ہے؟'' انہوں نے کہا کہ جی ہاں اور ہمارا ارادہ خیر و بھلائی کا ہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ان باتوں کا حکم نہیں دیا گیا۔'' الحدیث۔

گھوڑ دوڑ وغیرہ میں مقابلہ بازی کا حکم

ایسے کھیل جو انسان کی موت یا ضعف بدن کا سبب نہ ہوں ان میں مسابقہ (مقابلہ بازی) جائز ہے۔ جیسے تیراکی اور دوڑ کا مقابلہ یا سائیکل اور گاڑی کی ریس۔ اس کے جواز پر اصل یہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لاسبق الا فی خف أو نصل أو حافر'' یعنی تین چیزوں میں مسابقت کی شرط لگانا درست ہے ایک اونٹ میں، دوسرا تیروں میں اور تیسرا گھوڑے میں۔''

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین اونٹ، گھوڑے اور پیدل چلنے میں مسابقہ اور مقابلہ بازی ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ ان چیزوں میں مقابلہ بازی جہاد فی سبیل اللہ کی ضروریات میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ'' [الانفال:۶۰]

''اور ان کے لئے جتنی قوت ممکن ہو تیار رکھو اور گھوڑے باندھو۔''

معلوم ہوا کہ جو کام بھی جہاد کے اسباب میں سے ہو اس کا سیکھنا مطلوب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانے میں بھی اونٹوں کی دوڑ کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی ''عضباء'' سے آگے کوئی نہیں نکل سکتا تھا۔ ایک دن ایک دیہاتی آیا وہ اپنی اونٹنی پر سوار تھا، اس نے مقابلہ کیا تو اس کی اونٹنی اس سے آگے نکل گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ بات گراں گزری۔ (اس پر) حضور ﷺ نے فرمایا: ''ما رفع اللہ شیئا الا وضع.'' یعنی اللہ تعالیٰ جس چیز کو بلندی دیتے ہیں اس کو پستی بھی دکھایا کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درمیان دوڑ کا مقابلہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ اس دوڑ میں سب سے آگے نکل گئے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دوسرے نمبر پر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ تیسرے نمبر پر رہے۔

مقابلہ بازی میں ہار جیت کی شرط لگانے کا حکم

اگر مقابلہ بازی میں ایک جانب سے انعام کی شرط رکھی گئی ہو یا کسی تیسرے شخص کی طرف سے انعام کی شرط ہو تو یہ جائز ہے۔ جیسے ایک شخص دوسرے سے کہے اگر تم مجھ پر سبقت لے گئے تو میں تمہیں اتنا انعام دوں گا۔ اور اگر میں تجھ پر سبقت لے گیا تو میں تجھ سے کچھ نہ لوں گا تو یہ صورت جائز ہے۔ یا جیسے ایک امیر شہسواروں کی جماعت سے کہے کہ تم میں سے جو سبقت لے جائیگا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا ورنہ کچھ نہیں ملے گا تو یہ جائز ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس بناء پر جائز ہیں کہ اس میں آلہ حرب و جہاد پر ترغیب وتحریض ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "المؤمنون عند شروطھم." یعنی مسلمانوں کا معاملہ ان کی شرطوں کے مطابق ہوتا ہے۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز نہ ہو، کیونکہ یہ مال کو خطرے کے ساتھ معلق کرنا ہے۔ اگر جانبین سے شرط لگائی گئی ہو تو یہ جوا ہے اور حرام ہے۔

اگر جانبین سے شرط رکھی گئی ہو اور ایک اور شہسوار آکر اپنا گھوڑا بھی ان دونوں کے ساتھ شامل کرلے اور اس کا گھوڑا ان دونوں کے گھوڑوں کے جوڑ کا ہو کہ اس کے بھی آگے نکل جانے کا احتمال ہو اور وہ یہ شرط لگائے کہ اگر وہ دونوں کے گھوڑوں سے آگے نکل گیا تو ان سے وہ لے لیگا۔ اور اگر وہ دونوں اس سے آگے نکل گئے تو وہ اس سے کچھ نہ لیں گے۔ اور ان دونوں میں یہ طے ہو کہ ان میں سے جو آگے نکل گیا وہ دوسرے سے انعام لے گا تو یہ صورت جائز ہے، کیونکہ تیسرا گھوڑا درمیان میں آنے سے یہ معاملہ جوا بازی سے خارج ہو گیا۔ لیکن اگر تیسرا گھوڑا ان دو گھوڑوں کے مثل (برابر) نہ ہو تو یہ معاملہ ناجائز ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کو ان دونوں گھوڑوں میں شامل کرنا بے فائدہ ہے۔ لہٰذا یہ معاملہ قمار بازی سے خارج نہ ہوگا بلکہ قمار بازی میں داخل رہے گا۔

کلام کی اقسام

(۱) جو کلام اجر وثواب کا موجب ہو جیسے تسبیح وتحمید کرنا، قرآن پڑھنا، احادیث نبویہ، علم فقہ وتفسیر وغیرہ کا پڑھنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا" [الاحزاب: ۳۵]

"اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سامان مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔"

کلام کی اس قسم کے بارے میں بہت سی آیات واحادیث وارد ہوئی ہیں۔ کبھی تسبیح کرنے سے انسان گنہگار بھی ہوتا ہے وہ اس وقت ہے جب فسق وفجور کی مجلس میں تسبیح کرے کیونکہ اس صورت میں لوگ اس کے مخالفت کرینگے اور اس کا مذاق اڑائیں گے۔ لیکن اگر اس لئے تسبیح کرے کہ لوگ اپنے فسق وفجور سے باز آئیں اور عبرت حاصل کریں تو بہتر ہے۔ جیسے کوئی شخص بازار میں آواز کے ساتھ اس لئے تسبیح کرے کہ غافل لوگ اللہ تعالیٰ کا ذکر سن کر خواب غفلت سے بیدار ہوں تو یہ بہتر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قبروں کے پاس قرآن پڑھنا مکروہ قرار دیا ہے، کیونکہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول مفتیٰ بہ ہے کیونکہ اس میں مردے کو نفع حاصل ہوتا ہے۔ نیز آیت الکرسی، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفاتحہ اور دیگر سورتوں کا قبروں کے پاس پڑھنا ثابت ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ عباس بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ عباس کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے قبر کے پاس قرآن پڑھنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم سے مبشر بن اسماعیل الحلبی رحمۃ اللہ علیہ نے، ان سے عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلاج نے اور ان سے ان کے والد (علاء بن لجلاج رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ بیان کیا کہ انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا ''جب تم مجھے میری قبر میں ڈال چکو تو مجھے لحد میں رکھتے ہوئے یہ کہنا ''بسم اللہ وعلی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''۔ اور پھر تھوڑی تھوڑی کر کے مٹی ڈالنا اور میرے سر کے پاس سورۃ البقرہ کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھنا۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ اس کو پسند کرتے تھے۔''[1]

نیز امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب تمہاری کوئی فوتگی ہو جائے تو اس کو (میت کو گھر میں) روکے نہ رکھو (بلکہ) اسے قبر کی طرف جلد لے جاؤ اور پر اس کے سرہانے کی جانب سورۃ الفاتحہ اور پائنتی کی جانب سورۃ البقرہ کی آخری آیات پڑھو۔''[2]

اہل السنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ انسان کے لئے جائز ہے کہ اپنے عمل کا ثواب دوسرے کو بخش دے حدیث خثعمیہ (کما فی الحج) اس پر دال ہے۔ نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو سیاہ و سفید رنگ کے مینڈھوں کی قربانی فرمائی، ایک اپنی طرف سے اور ایک اپنی امت کی طرف سے'' یعنی اس کا ثواب امت کو عطا کیا۔ نیز حدیث صدقہ عن المیت بھی اس کی دلیل ہے۔ نیز ایک

---

[1] [شعب الایمان للبیہقی: ۱۶/۷] [2] ایضاً

عورت کا بچے کے حج کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرنا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کو فرمانا کہ ''نعم ولک أجر'' یعنی ہاں! اور اس کے حج کا تجھے ثواب ملے گا۔

بعض حضرات ایصال ثواب کا انکار کرتے ہیں ہوئے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى'' [النجم:۳۹] ''انسان کے لئے نہیں ہے مگر جس کی وہ کوشش کرے'' نیز وہ اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استدلال کرتے ہیں کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، صرف تین چیزیں جاری رہتی ہیں الیٰ آخرہ''[1]۔

آیت کریمہ سے استدلال کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں:

جواب اول: یہ آیت اس سے پہلے والی آیات: ''اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى o وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰى'' [النجم:۳۶، ۳۷] ''کیا اس کو خبر نہیں پہنچی جو ہے ورقوں میں موسیٰ کے اور ابراہیم کے جس نے کہ اپنا قول پورا اتارا'' کے سیاق میں بیان ہوئی ہے، معلوم ہوا کہ اس میں موسیٰ وابراہیم علیہما السلام کی شریعت کا ذکر ہو رہا ہے۔ لہٰذا سابقہ شریعت کا حکم ہمیں لازم نہیں ہوگا۔

جواب ثانی: یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے: ''اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ'' [الطور:۲۱] ''پہنچا دیا ہم نے ان تک ان کی اولاد کو'' یعنی اولاد کو ان کے آباء کے نیک ہونے کی بناء پر جنت میں داخل کیا جائے گا۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

جواب ثالث: ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت ہذا میں ''انسان'' سے مراد یہاں پر کافر ہے۔ کیونکہ مومن کو اپنے عمل کا بھی اجر ملتا ہے اور اس عمل کا بھی اجر ملتا ہے جو کوئی دوسرا اس کے لئے کرے۔

جواب رابع: آیت ہذا میں (لِلْاِنْسَانِ میں) لام، علیٰ کے معنی میں ہے۔ اور یہ ممکن ہے جیسے شاعر کہتا ہے: فخر صريعاً لليدين وللفم. اس میں (لليدين میں) لام، علیٰ کے معنی میں ہے، پس پر ایسا ہو گیا جیسے یوں کہا ہو: وَان ليس على الانسان الاماسعى. ''اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا'' یعنی انسان کو اپنے ہی عمل وسعی کا نفع نقصان اٹھانا ہوگا۔ اس صورت میں آیت اور حدیث میں مطابقت بھی ہو جائے گی اور اس صورت میں معنی بھی بالکل درست ہوتے ہیں، کوئی اختلاف نہیں ہے اور تخصیص کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔

جواب خامس: ایصال ثواب کرنے والے نے اپنے عمل کا ثواب دوسرے کو دینے کی سعی کی

---

[1] [صحیح مسلم:۳/۱۲۵۵]

ہے، پس یہ دوسرے کی سعی ہو جائیگی، آیت پر عمل بھی ہو جائیگا۔ (اور اس کی سعی رائیگاں بھی نہ جائیگی۔)

جواب سادس: سعی کی قسمیں ہیں: ایک سعی وہ ہے جو اپنے قول وفعل کے ساتھ ہو، اور ایک سعی وہ ہے جو قرابت داری کے سبب ہو، اور ایک سعی وہ ہے جو دوستی میں کسی دوست کے لئے ہو، اور ایک سعی وہ ہے جو نیک اعمال کی صورت میں کی جاتی ہے جن اعمال کے سبب لوگ اس سے محبت کرتے ہیں، اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں اپنے عمل کا ثواب اس کو بخشتے ہیں، ان تمام چیزوں کا سبب اس کی سعی ہے۔ اور حدیث سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں صرف یہ ہے کہ میت کے (ذاتی) اعمال موت کی وجہ سے منقطع ہو جاتے ہیں اور اس میں کسی کو کوئی کلام نہیں۔ قابل بحث امر تو یہ ہے کہ دوسرے کے عمل کا ثواب اس کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ حدیث ہذا اس کی نفی نہیں کرتی ہے۔ مزید وضاحت اور تسلی کے لئے امام صاغر جی رحمۃ اللہ علیہ کی ''شعب الایمان'' ج چہارم صفحہ نمبر ۵۵۶ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲): جو کلام نہ اجر وثواب کا موجب ہو اور نہ گناہ کا موجب ہو، جیسے کہنا کہ میں بیٹھا میں کھڑا ہوا، میں نے کھایا پیا وغیرہ۔ کیونکہ یہ الفاظ نہ عبادت ہیں اور نہ معصیت۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ ایسا کلام اعمال نامے میں لکھا جاتا ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایسا کلام نہیں لکھا جاتا، کیونکہ اس پر نہ اجر ہے اور نہ عتاب (سزا)۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے بھی ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''فرشتے اس کلام ہی کو لکھتے ہیں جس میں اجر یا وِزر (گناہ) ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ ایسا کلام لکھا جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: وَنَكْتُبُ مَاقَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ'' [یٰس:۱۲] ''اور ہم ان کے آگے بھیجے ہوئے اعمال اور ان کے آثار (سب کو) لکھتے ہیں۔''

پھر جس میں کوئی جزا نہیں ہوتی اس کو مٹا دیا جاتا ہے اور جزا والے عمل کو باقی رکھا جاتا ہے، اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ قیامت کے روز ایسے کلام کو مٹا دیا جائے گا۔

(۳): جو کلام گناہ کا موجب ہو، جیسے غیبت کرنا، چغلی کھانا، جھوٹ بولنا، گالی گلوچ کرنا۔ کیونکہ ان میں سے ہر چیز معصیت کے زمرے میں آتی ہے اور نقل اور عقل اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتے ہے۔ جیسے جھوٹ بولنا اس حکم ربانی کی وجہ سے ممنوع ہے: ''اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ'' [النحل:۱۰۵] ''جھوٹ کا افتراء وہ لوگ

کرتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔''

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم میں لے جاتی ہے۔'' البتہ جنگ کے دوران، دو آدمیوں میں صلح کروانے کے لئے، میاں بیوی کے درمیان الفت ومحبت پیدا کرنے اور ظالم کے ظلم سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ احادیث نبویہ میں ایسی صورت میں جھوٹ بولنے کا جواز ثابت ہے۔ اور اشارۃً جھوٹ بولنا صرف ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، ورنہ مکروہ ہے۔ جیسے ایک شخص دوسرے سے کہے کہ کھانا کھائیے۔ وہ جواب میں کہے کہ میں کھا چکا ہوں۔ اور مراد یہ ہو کہ کل گزشتہ کھایا تھا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی مراد میں سچا ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ جھوٹ ہی ہے۔ جس ظالم کے قول اور فعل سے لوگوں کو تکلیف اور اذیت پہنچتی ہو اس کی غیبت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبویؐ ہے ''فاسق آدمی کے عیوب ذکر کرو تا کہ لوگ اس سے محتاط رہیں۔'' ایسے ظالم کی حاکم کے ہاں شکایت کرنا گناہ کا موجب نہیں ہے تا کہ وہ حاکم اس کو تنبیہ وتوبیخ کرے۔ کیونکہ یہ بات نہی عن المنکر اور دفع ظلم کے قبیل سے ہے۔

شطرنج اور چوسر وغیرہ کھیلنے کا حکم

(۱) ''کنز العمال'' میں امام ابن حزم حبہ بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں کہ ''ملعون من لعب بالشطرنج و الناظر إليها، كأكل لحم الخنزير'' یعنی وہ شخص ملعون ہے جو شطرنج کھیلے اور اس کو دیکھنے والا ایسا ہے جیسے خنزیر کا گوشت کھانے والے''۔

(۲) نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک قوم کے پاس سے گزر ہوا جو شطرنج کھیل رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ شطرنج کا کھیل کیا ہے؟ کیا میں نے اس سے منع نہیں کیا؟ جو لوگ یہ کھیل کھیلتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہو۔''

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کا ایک قوم کے پاس سے گزر ہوا جو شطرنج کھیل رہی تھی، آپ نے فرمایا کہ یہ کیسی مورتیاں ہیں جن میں تم مشغول ہو؟''[1]

(۴) ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نرد شیر (ایک کھیل) اور شطرنج کھیلنے والوں کو سلام نہ کرو۔''

---

[1] [اخرجہ عبدالرزاق، وعبد بن حمید، وابن أبي الدنیا فی ''ذم الملاھی''، وابن المنذر، وابن ابی حاتم، واحمد فی ''الورع۔'']

(۵) امام احمد (الورع) میں عبید اللہ بن عمر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے شطرنج کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''وہ نرد (کھیل) سے بھی بدتر ہے''

(۶) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ''الموطا'' میں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ''الزہد'' میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''جو نرد کھیلتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے۔''

(۷) امام مسلمؒ، امام ابوداودؒ، امام ابن ماجہؒ اور امام احمدؒ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ''جو شخص نرد شیر کھیلتا ہے تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے خنزیر کے گوشت اور اس کے خون میں اپنے ہاتھ ڈبو دیئے۔''

(۸) امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ''الموطا'' میں حدیث ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ نقل کرنے کے بعد فرمایا: ''نرد، شطرنج اور دوسرے کھیلوں میں کوئی اچھائی نہیں ہے۔'' (مصنف فرماتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ تاش کھیلنا، بلیڈ کھیلنا اور لڈو کھیلنا اسی میں داخل ہے۔

(۹) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چوسر وغیرہ کھیلنے سے بچو کہ یہ عجمیوں کا جوا ہے۔'' یعنی ایسا کھیل حرام ہے۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کھیل کو ناپسند کرتے تھے۔

(۱۰) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان اللّٰہ یکرہ لکم الخمر والمیسر والمزمار والکوبۃ والبربط والفھر.''[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب نوشی اور اس کا استعمال اور قمار بازی کی تمام انواع وصور کو حرام قرار دیا ہے۔ اور بانسری اور باجے کی تمام شکلیں، اور ''کوبہ'' یعنی نرد وشطرنج اور بربط یعنی ستار (آلہ موسیقی) اور ''فہر'' کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ فہر کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنی بیوی یا لونڈی سے اس طرح جماع کرے کہ دوسرے کمرے میں موجود لوگ اس کی آواز و حرکات کو سنتے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمد و علی آلہ و صحبہ وسلم

والحمد للّٰہ رب العالمین

---

[1] [مسند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ: ۳۶۱]